افکارِ عالم

فکر اسلامی کی روشنی میں

علمی، ادبی تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

جلد اول

مولانا نظام الدین اسیر ادروی

شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم دیوبند

افکارِ عالم

فکرِ اسلامی کی روشنی میں

جلد اول

جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اِک چراغ جلا دیا

علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کا مجموعہ

مولانا اسیر ادروی

شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

تفصیلات

زیر سرپرستی

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

زیر انتظام

بدرالدین اجمل علی القاسمی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

سلسلۂ مطبوعات شیخ الہند اکیڈمی (۳۷)

نام کتاب : افکارِ عالم فکر اسلامی کی روشنی میں (جلد اول)

تالیف : مولانا اسیر ادروی

سن اشاعت : شعبان ۱۴۲۹ھ اگست ۲۰۰۸ء

صفحات : ۴۱۶

تعداد اشاعت : بارِ اول، گیارہ سو

کمپیوٹر کتابت : محمد عیاض قاسمی، دیوبند

ہدیہ : /=

ناشر

شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

فون: 01336-222429

حرفِ اول

زیرِ نظر کتاب شیخ الہند اکیڈمی سے طبع ہونے والی سینتیسویں کتاب ہے، جو مولانا اسیر ادروی کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے، مولانا اسیر ادروی دور رَس اور تحقیقی نگاہ رکھتے ہیں، ان کا شمار ملک کے اچھے لکھنے والوں میں ہوتا ہے، موصوف کی خواہش پر اسے کتابی شکل میں اکیڈمی سے طبع کیا گیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فاضل مؤلف نے کافی محنت کی ہے، اور دشمنانِ اسلام کی جانب سے ازراہِ عصبیت قرآنِ کریم اور احادیث رسول پر کئے گئے اعتراضات کے معقول اور بھر پور جوابات دیئے ہیں، اگر ذرا بھی سنجیدگی اور حقیقت پسندی کے نقطہ نگاہ سے کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو صحیح صورتِ حال بھی معلوم ہو جائے گی، اور قاری مطمئن بھی ہو جائے گا۔

اس سے قبل فاضل مؤلف کی کئی کتابیں اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں، جنہیں علمی و دینی حلقوں میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، مولانا اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ بنارس کے ذی وقار اساتذہ میں ہیں، اور اسی علمی ادارے سے شائع ہونے والے ماہِ نامہ ترجمان الاسلام کے ایڈیٹر بھی ہیں، پیش نظر کتاب دراصل انہی ادبی اصلاحی اور تحقیقی مقالوں کا حقیقت افروز مجموعہ ہے جو ترجمان الاسلام اور دوسرے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، اور جنہیں علمی دنیا میں پسند کیا گیا ہے، موصوف کی شخصیت علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے ہندو پاک وغیرہ ممالک کے علمی حلقوں میں متعارف ہے، لوگ ان کی مضامین بڑے شوق سے پڑھتے ہیں، اور داد و تحسین سے نوازتے ہیں، مجھے اکیڈمی سے موصوف کی کتابوں کی اشاعت سے خوشی ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھتے ہوئے مزید علمی و دینی خدمات کا موقع عطا فرمائے۔

(حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن (صاحب)
مہتمم دارالعلوم دیوبند

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ کا صد ہزار بار شکر ہے کہ مجلس شوریٰ کے اربابِ حل وعقد نے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی نگرانی میں شیخ الہند اکیڈمی سے اپنے نیک دل بزرگوں کی خلوص کے ساتھ لکھی ہوئی کتابوں کی طباعت کا جو اہم اور مفید ترین انتظام فرمایا تھا، وہ جاری ہے، اور انشاء اللہ جاری رہے گا، اس سلسلہ میں اب تک اپنے اکابر کی ۳۶ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں، جن سے اہل علم مستفید ہو رہے ہیں، پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک نہایت مفید کڑی ہے، توقع ہے کہ اس کو خواص وعوام میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

یہ کتاب مولانا اسیر ادروی کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا جامع مجموعہ ہے، اس مجموعہ کا ہر مضمون اپنی جگہ بفضلہٖ اہم ہے، جو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور جس میں معاندین اسلام کے اعتراضات کے معقول اور مسکت جوابات دیئے گئے ہیں، کتاب کا ہر مضمون اپنی افادیت کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے، تمام مضامین مدلل اور محقق ہیں، اسلوبِ تحریر اور لب ولہجہ کے حسن نے ان کو اور بھی زیادہ مؤثر بنا دیا ہے، فاضل مؤلف کے قلم اور تحقیقی مزاج سے پڑھے لکھے سبھی لوگ واقف ہیں، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس اکیڈمی سے موصوف کی کئی کتابیں طبع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، جو ہندو پاک اور بنگلہ دیش وغیرہ ممالک میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں، انشاء اللہ اس کتاب کو بھی پسند کیا جائے گا، دعا ہے حق تعالیٰ موصوف کو صحت وعافیت کے ساتھ دیر تک زندہ سلامت رکھے، اور انہیں دینی وعلمی خدمات کا مزید موقع بہم پہنچائے، آمین۔ (ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین باد)

(مولانا) بدرالدین اجمل علی القاسمی
نگراں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

پیش لفظ

مولانا اسیر ادروی اردو حلقہ کا ایک مشہور نام ہے، وہ ڈھائی درجن کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی کتابیں اردو حلقہ کی مقبول ترین کتابیں اور ان کے بار بار ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ جامعہ اسلامیہ بنارس کے معیاری رسالہ ترجمان الاسلام کے مدیر رہے ہیں۔

ان کی تحریر میں دلکشی ہے، جاذبیت ہے۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ایڈیٹر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ان کی ایک کتاب پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''حق تعالیٰ نے موصوف کو گوناگوں خوبیوں اور فضل وکمال سے نوازا ہے، وہ پختہ کار صحافی اور کہنہ مشق ادیب وصاحب قلم ہیں، ان کے اسلوب میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ دلکشی ورعنائی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، اس لئے ان کی تحریریں قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہیں اور بسا اوقات مسحور کر دیتی ہیں''۔

یہی میرے دل کی بھی آواز ہے، کسی موضوع پر ان کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو ان میں کھو جاتا ہوں۔

یہ میری دلی خواہش تھی کہ مولانا موصوف کے کچھ مقالات کو کتابی شکل میں شائع کر کے زندہ وجاوید بنا دیا جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ ترجمان الاسلام کے بعض اہم علمی وتحقیقی اور ادبی شہ پارے اس مجموعے میں پیش کئے جارہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ مولانا موصوف کا قلم تادیر رواں دواں رہے اور اس کی افادیت کا دائرہ بڑھتا رہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔

(مولانا) ابوالقاسم نعمانی (جامعہ اسلامیہ بنارس)

ترتیب

حرفِ چند

اسلام اور اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے والے یورپ کے دانشگاہوں کے یورپین دانشور بھی رہے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نام نہاد مسلمان بھی، یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اور آج بھی ہو رہا ہے۔ یہ اسلام کے ایک زندہ مذہب ہونے کی علامت ہے۔ اہل اسلام ان اعتراضات سے کبھی پریشان خاطر نہیں ہوئے، کیونکہ اسلام ایک خالص علمی اور عملی مذہب ہے۔ اسلام کے پاس علوم کا خزانہ ہے۔ اور پوری سچائی سے اور پورے اخلاص سے ہر دریدہ دہن کا منہ بند کر دیا۔

ایسے کچھ ناخوشگوار واقعات بیسویں صدی میں بھی پیش آئے، ان کے مختصر اور تفصیلی جوابات دئے گئے۔ زیر نظر مقالات کے مجموعہ میں بھی کچھ اہم ترین اعتراضات کے جوابات علم و تحقیق کی روشنی میں دئے گئے ہیں۔

صحافتی زندگی میں شعر و ادب کے موضوع پر اکثر گفتگو آئی، اس مجموعہ میں بھی کئی مضامین خالص ادب سے متعلق ہیں اور دلچسپ ہیں۔ بعض اہم شخصیتیں جو علمی اور مذہبی دنیا میں نام آور ہیں ان شخصیتوں کا بھی تفصیلی تعارف کرایا گیا۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اسیر ادروی
یکم جنوری ۲۰۰۷ء

ایک علمی دستاویز

تاریخ تدوین حدیث اور مستشرقین

آج زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، اور پوری دنیا سمٹ کر ایک شہر کی طرح ہوگئی ہے، دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی انقلاب آتا ہے، کہیں اقتدار کا کوئی فلک بوس محل گرتا ہے تو اس کی دھمک پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے، کسی خطۂ ارضی میں اقتصادی، معاشی، سماجی، نظریاتی بے چینیاں کروٹیں لیتی ہیں، آگ اور بارود کے دھویں میں نئے مستقبل کے سورج کی کرنیں نمودار ہوتی ہیں تو اس کی جھلک یا اس کا پرتو ہر چہار جانب نظر آنے لگتا ہے، اسی طرح فکری ونظری انقلاب بھی جب کہیں رونما ہوتا ہے اور تحقیق وتنقید کے نام پر ماضی کے مسلمہ نظریہ یا افکار پر جمود انکار کی ضرب پڑتی ہے تو پوری دنیا میں اس کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور دل ودماغ پر اس کے مثبت ومنفی اثرات ہر جگہ مرتب ہوتے ہیں، نقطۂ نگاہ، زاویۂ فکر اور نظریاتی طور پر ذہن وفکر کی دنیا میں دو طبقے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایک جدید انقلاب کی حمایت یا نظری وفکری نتائج کی تائید کرتا ہے، اور دوسرا شدت سے اس کی مخالفت کرتا ہے، یہ شب وروز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جس طرح ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں نشر کرنے والے کی آواز ہوا کی لہروں پر دوڑتی ہے اور ہزاروں میل دور تک چند لمحوں میں پہنچ جاتی ہے اور ہر شخص اس سے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ کچھ متاثر ہوتا ہے، بالکل یہی حال علمی دنیا میں جدید تحقیقات واکتشافات کی برقی رَو کا بھی ہوتا ہے، وہ بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ پوری علمی دنیا میں پہنچ جاتی ہے اور ہر ذہن کو متاثر کرتی ہے اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے بہت بڑا اور اہم ذہنی وفکری انقلاب پیدا ہوجاتا ہے، اس کی ایک بہت واضح مثال مصر وشام اور ہندوستان وپاکستان میں فتنۂ انکارِ حدیث ہے جو یورپ کی یونیورسٹیوں کی صدائے بازگشت ہے۔

یورپ اور مشرقی علوم وفنون

یورپ کی ہر بڑی یورنیورسٹی میں مشرقی علوم وفنون بالخصوص اسلامیات کا ایک شعبہ رہتا ہے۔ اس شعبہ میں وہی لوگ رکھے جاتے ہیں جو مشرقی علوم وفنون پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے یا اسلامیات کی کسی شاخ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علمی دنیا میں اپنی علمی حیثیت تسلیم کرا چکے ہیں۔ مشرقی علوم وفنون کے یہی ماہرین علمی دنیا میں مستشرقین کے نام سے مشہور ومعروف ہیں، یہی اہلِ علم یورپ کی یونیورسیٹیوں میں طلبہ کی تحقیق اور ریسرچ کے موضوع منتخب کرتے ہیں اور ان کے مقالے کا ابتدائی خاکہ مرتب کرتے ہیں۔

چوں کہ انھوں نے اسلامیات کے موضوع کو اپنے قومی، نسلی اور مذہبی تعصّبات اور اپنے ذہنی تحفظات کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے ان کے ذہن وفکر کی چابک دستیوں نے بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں تراش رکھی ہیں، اس لئے وہ مشرقی علوم وفنون بالخصوص اسلامیات کے اصول وضوابط ان کے بنیادی مآخذ اور کتابوں سے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہیں اس لئے اپنی نگرانی میں جن طلبہ کی وہ علمی رہنمائی کرتے ہیں ان کو اپنے ذہن وفکر کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کو حقیقت اور واقعیت کی شکل دیدینے پر مجبور کرتے ہیں اور جب تک زیر تربیت مقالہ میں ان کی حسب منشاء کام نہیں ہوتا اس وقت تک وہ طالب علم کو سند دینے سے کتراتے ہیں اس لئے مجبور ہو کر ان کو اپنے مقالے میں ترمیم اور حذف واضافہ سے کام لینا پڑتا ہے اور علمی دیانت کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

اسلامیات پر ضرب کاری

اس صورت حال سے مشرقی علوم وفنون میں سب سے زیادہ واسطہ اسلامیات کو پڑتا ہے۔ آج سے پوری ایک صدی قبل مستشرقین نے اسلامیات کو نشانہ بنا کر تنقید

وتشکیک کے کئی زہریلے تیر چلائے اور انہوں نے اپنی دانست میں اسلام کو کاری ضرب لگائی ہے کیوں کہ انہوں نے دیکھ لیا کہ عالم اسلام کی مذہبی و دینی فضا میں تموّج پیدا ہوا، جس طرح تالاب کی ساکن سطح پر کوئی پتھر پھینک کر پیدا ہونے والی لہروں کا تماشہ دیکھتا ہے، مستشرقین بھی اسلامی دنیا میں اس تموج کا تماشہ دیکھنے میں مصروف رہے۔ انہوں نے تمام ذخیرۂ حدیث کو ناقابل اعتماد ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کر کے ملّت اسلامیہ پر بزعم خویش کاری ضرب لگائی ہے۔

فتنہ انکار حدیث مستشرقین ہی کی علمی تحقیق کا لبادہ اوڑھ کر وجود میں آیا ہے اور مسلم ملکوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام کا دستور صرف قرآن ہے، احادیث کے نام سے جو انبار جمع کر دیا گیا ہے اس نے اسلام کی صحیح شکل وصورت کو بگاڑ دیا ہے، احادیث کا پورا ذخیر نعوذ باللہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں، اس سارے ذخیرے کو دریا بُرد کر دینا چاہیے، بعض بعض ملکوں میں کچھ مدعیان علم اس شیطانی جال میں پھنس گئے اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ ساری حدیثیں ناقابل اعتبار ہیں اور انہوں نے اپنی لچھے دار تحریروں کے ذریعہ اپنے اس خیال کو عوام میں پھیلانا شروع کیا اور بہت سی کتابیں اس سے متعلق لکھیں اور شائع کیں۔

مصر کے منکرین حدیث

انکار حدیث کا یہ فتنہ سب سے پہلے مصر میں پہونچا اور ڈاکٹر ''توفیق صدقی'' نے رشید رضا مصری کے رسالہ ''المنار'' میں ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا جس میں انہوں نے گولڈ زیہر اور شاخت کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا شکار ہو کر لکھا کہ اسلام صرف قرآن ہے، احادیث کی ہم کو قطعاً ضرورت نہیں۔

رسالہ کے مدیر، رشید رضا نے ''توفیق صدقی'' کے مقالہ پر جو ادارتی نوٹ لکھا اس میں انہوں نے توفیق صدقی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی تائید میں لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کتابت حدیث سے منع کیا تھا اس لئے صحابہ کرام نے حدیثوں

کو قلم بند نہیں کیا، اور نہ اکابر صحابہ کرام نے اس دور میں حدیثوں کو جمع کرنے کی طرف کوئی توجہ کی، خلفائے راشدین نے بھی اپنے دور خلافت میں اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ لکھنے والوں اور بیان کرنے والوں کو سرزنش کرتے رہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی موجودگی میں احادیث کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بعد مصر کے ترقی پسند مصنف احمد امین کا سورج علمی اُفق پر طلوع ہوتا ہے۔ انہوں نے احادیث کے نا قابل اعتماد ہونے کا اپنی کتابوں میں کئی جگہ اظہار کیا ہے، ان کی کتابوں میں ''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' مشہور ہیں۔ اس کے بعد اسمٰعیل ادہم کا نام آتا ہے جس نے ''تاریخ سنت'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں اس نے غیر مبہم لفظوں میں دعویٰ کیا ہے کہ بخاری و مسلم میں جتنی حدیثیں ہیں ان میں سے ایک بھی ثابت نہیں ہے، سب کی سب مشکوک ہیں بلکہ زیادہ تر موضوع معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اس مورچہ پر ابوریہؔ آیا، اس نے اپنے پیش رؤوں توفیق صدقی اسمٰعیل ادہم ہی کے ترکش سے تیر مستعار لے کر چلائے ہیں اس نے سب سے بڑا حملہ حدیث پر ''اضواء على السنة المحمّدية'' کے ذریعہ کیا، اور ذخیرۂ حدیث کو نا قابل اعتبار ثابت کرنے کے لئے اس نے کتاب میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔

ہندو پاک کے منکرین حدیث

ہندوستان میں جب انگریزوں کا نیّرِ اقبال طلوع ہوا تو انہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم اور دیرپا بنانے کے لئے کئی حربے اختیار کئے۔ انہیں حربوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کیا جائے۔ اس مقصد کو لے کر انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک کئی نمایاں افراد سیاست کے بجائے مذہبی قیادت کے لاؤلشکر کے ساتھ ملت اسلامیہ کے دوست نما دشمن بن کر وجود میں آئے۔ انہوں نے حدیثوں کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ جس حدیث

کو چاہا موضوع کہہ دیا، جس حدیث کو چاہا جھوٹی کہہ دیا، ان کی تلواروں کے وار سے نہ بخاری بچے نہ امام مسلم، ...... بلکہ محدثین کی پوری جماعت کو عملاً جسد ملّت میں ناسور ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، سر سید احمد خان ان کے ساتھی مولوی چراغ علی اور غلام احمد قادیانی انگریزی حکومت ہی کے ساختہ پرداختہ تھے، اس کے بعد احمد الدین امرتسری پھر عبداللہ چکڑالوی میدان میں آئے اور پورا ایک فرقہ ہی اہلِ قرآن کے نام سے بناڈالا اور اس خود ساختہ شریعت کا سب سے بلند بانگ پیغمبر غلام احمد پرویز بن کر آیا۔ اور پھر حدیث کے خلاف ایک مستقل محاذ جنگ کھول دیا گیا۔ اُردو میں بہت سی کتابیں اور رسالے اس مقصد سے شائع کرتے رہے اور ہر امکانی جدوجہد صرف کردی کہ حدیثوں کو خزف ریزوں کا انبار ثابت کردیں۔

آج سے نصف صدی بیشتر یہ فتنہ شباب پر تھا اور تقسیم ہند سے پہلے تک کہیں نہ کہیں اس فتنہ کو ہوا دینے والے افراد موجود تھے لیکن جس طرح برسات گزر جانے کے بعد لاکھوں کروڑوں کیڑے مکوڑے جو روشنیوں پر جمگھٹ لگا کر اس کو مدہم کردینا چاہتے ہیں موسم گذرتے ہی اپنی موت آپ مرجاتے ہیں، اسی طرح یہ فتنہ بھی اپنی موت آپ مرگیا۔ لیکن اس فتنہ نے حدیثوں کی طرف سے ذہن وفکر میں تشکیک کا زہر بھر دیا تھا اس کا اثر آج بھی محسوس کیا جارہا ہے اور کئی ایک مدعیانِ علم جو اپنے کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا پیمبر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو مسحور کر رکھا ہے انہوں نے بخاری و مسلم کی صحیح ترین حدیثوں کے انکار میں جس جرأت وجسارت اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ نتیجہ ہے اسی فتنۂ انکار حدیث کا جس کو دفن ہوئے مدت ہوئی، جسے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے ۱۸۹۰ء میں یورپ کی یونیورسیٹیوں کے کیمپس سے اٹھایا گیا تھا۔

سیلاب کا سرچشمہ

حدیثوں کو خزف ریزوں کا انبار کہنے کی جرأت کرنے والوں نے یہ جرأت

وجسارت کہاں سے حاصل کی؟ کیا خود ان کے مطالعہ نے ان کو یہ راہ دکھائی؟ کیا ان کے دل ودماغ کی پرواز وہاں تک از خود ہوگئی؟ کہ اس بلندی پر جاکر یہ دیکھ لیا کہ احادیث کا سارا ذخیرہ ناقابلِ اعتبار ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہے، نہ انھوں نے اپنے دماغ سے سوچا ہے اور نہ ان کے طائرِ فکر کی پرواز وہاں تک تھی، یہ تو کٹھ پتلی تھے جس کا ناچ ان ملکوں میں ہو رہا تھا اس کا تار کسی دوسرے ہاتھ میں تھا۔ ان کی حیثیت اس جھاگ کی تھی جسے سیلاب کا تیز رَو پانی خس وخاشاک کی تمام آلائشوں کے ساتھ ساحل پر لگا دیتا ہے، اس سیلاب کا سرچشمہ مصر اور ہندو پاک میں نہیں یورپ کی یونیورسیٹیوں کا کیمپس تھا۔ آپ جب اس فتنہ کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت از خود آشکارا ہو جائے گی۔

مشہور مستشرق گولڈ زیہر کا کارنامہ

آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے ۱۸۹۰ء میں اگناس گولڈ زیہر (۱) نے اپنا تحقیقی

---

(۱) ''گولڈ زیہر، جرمنی زبان میں اس کا پورا نام اگناس گولڈ زیہر ہے، یہ مشہور یہودی مستشرق ہے، ۱۸۵۰ء میں ہنگری میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم کا زیادہ زمانہ بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی اور برلن میں گذرا، ۱۸۷۳ء میں وہ شام چلا گیا اور دمشق کی مشہور علمی شخصیت اور مخطوطات کے ماہر شیخ طاہر جزائری کی خدمت میں رہ کر مطالعہ میں مصروف رہا، اور ان سے علمی استفادہ کیا، کچھ زمانہ اس نے فلسطین کی علمی مجلسوں میں گذرا پھر وہاں سے مصر چلا گیا اور علماء ازہر سے عملی استفادہ کیا۔ اپنی تعلیم مکمل کر کے جب وطن ہنگری واپس ہوا تو ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا، جہاں وہ کسی زمانہ میں تعلیم حاصل کر چکا تھا، یونیورسٹی میں استاذ ہونے کے بعد اس نے پوری زندگی بوڈاپسٹ ہی میں گذار دی اور وہیں ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔ گولڈ زیہر بہت سی کتابوں کا مصنف نے ہے، اس کی تصنیفات جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ہیں، اس کا موضوع اسلامیات میں اسلامی فقہ اور عربی ادب ہے اس کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے، پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ نے فرانسیسی زبان میں اس کی زندگی اور اس کے کارناموں پر ایک کتاب شائع کی ہے اس کی اہم ترین کتاب جو عربی میں منتقل کی گئی ہے ''العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام'' کے نام سے ہے اس کتاب میں اس نے احادیث کو ناقابل اعتماد ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مستشرقین میں سب سے پہلا شخص یہی ہے جس نے احادیث کو علماءِ اسلام کا کارنامہ بتایا ہے اور کہا ہے کہ رسول کی ذات سے اس کو کوئی نسبت نہیں ہے، بعد کے مستشرقین سب کے سب اسی کے دسترخوان کے ریزہ چین ہیں۔

(الاعلام، خیر الدین زرکلی، جلد اول، ص۸۴، ناشر دار العلوم بیروت، طبع پنجم)

مقالہ جرمن زبان میں (MUHAMMAD ANISCHE STUDIEN) کے عنوان سے لکھا اور شائع کیا اور پھر انگریزی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر کے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

اس مقالہ میں اس نے اپنے وسیع مطالعہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے پاس جتنا ذخیرۂ حدیث ہے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کلام رسول ہیں یا رسول کی زندگی کے سچّے اور صحیح حالات و واقعات ہیں، کیوں کہ اس زمانے میں لکھنے کا رواج زیادہ نہیں تھا اور بہت ہی کم لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے، پھر مسلمانوں کے پیغمبر نے خود بھی اپنے ساتھیوں کو حدیثوں کے لکھنے سے منع کیا تھا، یہی وجہ ہے کو رسول کی وفات کے بعد ایک صدی سے زائد مدت گذر گئی اور حدیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں ہوا اور جو بات سو سال تک قید تحریر میں نہ لائی جائے اس میں ہر طرح کا تغیر و تبدل ہوسکتا ہے، ایسی صورت حال میں یہ کیسے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سو سال کے بعد رسول کی جو بات نقل کی جارہی ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اسلام کی تاریخ ہمارے سامنے کوئی ایسا مجموعۂ حدیث پیش نہیں کرتی ہے جو رسول کے زمانہ میں مرتب کیا گیا ہو۔ رسول کے بعد صحابہ کے دور میں بھی کسی صحابی نے اپنے رسول کی احادیث کا کوئی مجموعہ نہیں لکھا جو براہ راست رسول کو دیکھنے والے اور ان کی باتوں کو اپنے کانوں سے سننے والے تھے، انھوں نے جب رسول کے اقوال و افعال کو قلم بند نہیں کیا تو جب صفحۂ ارض سے ایک ایک صحابی اٹھ گیا اور روئے زمین پر اپنے رسول کو دیکھنے والا اور ان کی باتوں کو سننے والا کوئی نہیں رہ گیا تو تیسری اور چوتھی نسل کس طرح اقوال اور افعال رسول کو پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ قلم بند کرسکتی ہے اور پھر اس پر یہ دعویٰ کہ اس کا حرف؟ حرف صحیح ہے، عقل میں آنے والی بات نہیں، اس لئے کہ یہ کہنے کی قطعاً گنجائش ہے کہ حدیثیں بعد میں لکھی گئیں اور جو بات اتنے طویل عرصے تک قلم بند نہ کی جائے اس کی صحت کا قطعیت کے ساتھ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے پورا ذخیرۂ حدیث جو

مسلمانوں کے پاس ہے نا قابل اعتماد ہے اور ہر حدیث میں یہ احتمال موجود ہے کہ معلوم نہیں کہ یہ کلامِ رسول ہے یا نہیں؟ ان حالات میں ایک مشکوک اور مشتبہ چیز کو دلیل اور حجت بنانا بالکل غیر منطقی بات ہے، عقل کسی طرح احادیث کے موجود ذخیرے کو کلامِ رسول قطعیت کے ساتھ ماننے کے لئے تیار نہیں، یہی وہ خیالات ہیں جن کو گولڈز یہر نے اپنی کتاب میں پورے زورِ قلم کے ساتھ لکھا ہے۔

ایک نئی آسمانی کتاب

گولڈز یہر کی اس کتاب کی اشاعت سے اسلام دشمن طبقہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے حلقوں میں اس کو مقبولیت حاصل ہوگئی کہ بعد کے دور کے سارے مستشرقین کے نزدیک اس کی یہ کتاب ''انجیل مقدس'' کی حیثیت اختیار کرگئی، اور اس کو اسلام مخالف طاقتوں نے آسمانی کتاب کا درجہ دیدیا اور اس پر اس یقین واعتماد کے ساتھ ایمان لائے کہ اس میں کسی غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں، اور اس کے دلائل نا قابل شکست ہیں اور پوری اسلامی دنیا اس کی تردید سے قاصر رہ جائے گی۔

بعد کے تمام مستشرقین کا یہ کتاب ماخذ بن گئی۔ بلا استثناء ہر ایک نے احادیث کے خلاف بکتے ہوئے اسی کتاب سے استفادہ کیا ہے بلکہ گولڈز یہر کی تائید میں صرف مزید دلائل فراہم کرنا ان کا کام رہ گیا ہے۔

پروفیسر کا کارنامہ

گولڈز یہر کی کتاب کے شائع ہونے کے تقریباً ۶۰ سال بعد مشہور اور متشدد یہودی مستشرق پروفیسر شاخت کی علمی سرگرمیاں شروع ہوئیں، اس نے بھی اپنے پیش رو گولڈز یہر کی طرح اسلامیات کی ایک شاخ ''احادیث فقہیہ'' کو اپنا موضوع سخن بنایا، اور پورے دس سال اس نے اس موضوع پر مطالعہ کرنے میں صرف کئے اور دس سال کی شبانہ روز محنت کا حاصل اس نے۔ THE BRIGINS, OF-

-MOHAMMADAN JURISPRUDENCE- کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔اس کتاب میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں بالخصوص فقہیات کی جتنی روایتیں اور حدیثیں ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء جھوٹی اور بعد کے علماء کی مخترعات ہیں، یعنی گولڈزیہر نے احادیث کی صحت میں شک وشبہ کا اظہار کیا تھا، شاخت نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا کہ پورے یقین واعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں ایک بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔

گولڈزیہر اور پروفیسر شاخت کی یہی دونوں کتابیں مستشرقین کے لئے وحی آسمانی بن گئی ہیں اور آنکھ بند کر کے ان کے مندرجات پر اعتماد کر کے اسلامیات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے، جیسا کہ ماضی قریب کے کئی مشہور مستشرقین کے یہاں اس کا کُھلا اعتراف پایا جاتا ہے۔ دونوں کتابوں میں فرق صرف یہ ہے کہ گولڈزیہر نے ذہن وفکر میں شک وشبہ کا کانٹا بویا ہے اور حدیث پر یقین واعتماد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے مقابلہ میں شاخت سختی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ساری حدیثیں دوسری صدی اور تیسری صدی کے علماء کے اقوال ہیں اور غلط طور پر ان کو اپنے رسول کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

مستشرقین کے دعویٰ کا تجزیہ

چوں کہ یہی دونوں مستشرقین بعد کے دور میں پیدا ہونے والے مستشرقین کے باوا آدم بنے ہوئے ہیں۔انھیں کی کتابیں حدیث کے موضوع پر گفتگو کرنے میں بنیادی ماخذ اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔اور تمام معترفین پروفیسر گب[1]،

[1] گب کا پورا نام سر ہملٹن اے۔آر گب ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں پروفیسر تھے۔کچھ دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں بھی اسی شعبہ سے وابستہ رہے ان کی کتاب ''محمڈن ازم'' کے نام سے شائع ہوئی جو اس وقت میرے سامنے ہے، یہ ناول سائز کے ۱۵۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے نیو امریکن لائبریری نے شائع کیا ہے۔(ٹائٹل پیج محمڈن ازم)

الفریڈم گیوم[1] مار گولیتھ[2]، سب اسی خرمن کے خوشہ چین ہیں، اس لئے اگر ان کے دعویٰ کا تجزیہ کر کے اس کے ہر جزء کو ناقابل تردید دلائل سے غلط ثابت کر دیا جائے کہ ان کے اعتراضات کا محل جھوٹ، اور فریب، مغالطہ اور علمی بددیانتیوں کی خام اینٹوں سے تیار کیا گیا ہے اور صداقت و دیانت کے سارے تقاضوں کو بیدردی کے ساتھ پامال کیا گیا ہے اور تاریخی شواہد کی روشنی میں تحقیق و تفتیش کے آہنی ہاتھوں سے اس کے بنیادی پتھروں کو اپنی جگہ سے کھینچ لیا جائے تو اعتراضات کے یہ فلک بوس محل آنِ واحد میں زمین بوس ہو جائیں گے۔

جب ہم ان کے دعووں کا تجزیہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کا سب سے اہم اور بنیادی اعتراض صرف یہ ہے کہ قرن اول میں حدیث بالکل نہیں لکھی گئی، کسی نے ایک حرف بھی نہیں لکھا صرف حافظہ پر اعتماد کیا گیا اور ساری حدیثیں رسول کے دوسو سال بعد لکھی گئیں۔ اسی لئے حدیثیں ناقابل اعتبار ہیں کیوں کہ اتنے طویل عرصے تک کوئی حافظہ اتنے بڑے ذخیرۂ حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے یہ تجزیہ اور مشاہدہ کے

۱۔ الفریڈ گیوم۔ یہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور مشرقی و افریقی مطالعہ اسکول کے صدر تھے، پرنسٹن کی یونیورسٹی نیو جرسی میں شعبۂ عربی کے نگراں پروفیسر بھی رہے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں دینیات اور مشرقی زبانوں کے مطالعہ کے بعد انہوں نے خصوصیت کے ساتھ عربی کا مطالعہ کیا، پھر علمی زندگی سے ان کو نکال کر پادری بنا دیا گیا، ان کی مشہور کتاب اسلامیات کے سلسلہ میں ''اسلامی قانونِ وراثت'' ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران انھیں بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں نگراں پروفیسر کا عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور انھوں نے قبول کر لیا اور ایک عرصہ تک وہ بیروت یونیورسٹی سے متعلق رہے، یہاں ان کے حلقہ احباب میں مسلمان بھی شامل تھے، دمشق کی عرب اکاڈمی اور بغداد کی شاہی اکاڈمی نے ان کو اپنا ممبر منتخب کیا اور استنبول کی یونیورسٹی نے عیسائیت اور اسلامی دینیات کے موضوع پر اپنے یہاں انھیں غیر ملکی لکچرر منتخب کیا، ان کی ایک کتاب ''اسلام'' میرے سامنے ہے جو ناول سائز کے ۱۹۸ صفحات پر مشتمل ہے جسے پنگوئن بکس ادارہ نے شائع کیا ہے۔ یہ حالات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔

۲۔ مار گیولیتھ۔ کا پورا نام وافید سموئیل مار گیولیتھ ہے۔ یہ عیسائیوں کے پروٹسٹنٹ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا شمار ملک کے بڑے مستشرقین میں ہوتا ہے۔ دمشق کی ''المجمع العلمی العربی'' اور برطانیہ کی ''المجمع القولی'' اور برلن کے مستشرقین کی تنظیم کے رکن ہیں ان کی ولادت ووفات دونوں لندن میں ہوئی، آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۹ء میں اسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، عربی شاعری پر ایک تصنیف کے علاوہ کئی عربی کتابوں کی تحقیق و تعلیق کی ہے (الاعلام زرکلی، ج ۲، ص ۳۲۶، ۳۳۰۔

قطعاً خلاف ہے۔

دعوے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو اصل دعویٰ تو نہیں لیکن اس کو مستحکم کرنے اور سطحی ذہن و فکر والوں کی عقلوں کو اپیل کرنے کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس جو احادیث رسول ہیں ان کی تعداد سات لاکھ ہے اس تعداد کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ سالہ دور نبوت میں ان کے رسول کے پاس سوائے بولنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا اور وہ شب و روز صرف حدیثیں ہی بیان کرتے تھے تبھی تو اتنی بڑی تعداد میں حدیثیں جمع ہو گئیں، عقل انسانی اس کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کرتی ہے۔ اپنے دعویٰ پر ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دوسری اور تیسری صدی میں حدیث کے نام پر بے انتہاء جھوٹی باتوں کو بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ حدیث ہے، یہ کلامِ رسول ہے۔ امام بخاری کے زمانہ میں تو جھوٹی حدیثوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ وہ ڈیڑھ سو حدیثوں کو جمع کرتے تھے تو اُن کو ان میں صرف ایک حدیث صحیح ملتی تھی باقی ساری حدیثیں غلط طور پر رسول کی طرف منسوب کر دی گئی تھیں، اسی لئے امام بخاری اور مسلم کی روایتیں بھی جھوٹی اور موضوع ہونے کا احتمال ہی نہیں رکھتیں بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ دونوں حدیثوں کے مجموعے بھی جھوٹی سچی حدیثوں کے مجموعے ہیں معلوم نہیں ان میں کون حدیث صحیح ہے اور کون جھوٹی؟ صحیح اور موضوع حدیثوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا دشوار ہے، معترضین کے اعتراضات کا خلاصہ یہی ہے۔

تیزاب کی بھری ہوئی بوتل

اب تک میں نے مستشرقین اور دشمنانِ اسلام کی تیز و تند اور تلخ ترین باتوں کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کی ہے جو آپ کے جذبۂ ایمانی کے لئے ناقابل برداشت اذیت رہی ہوگی، گویا یہ تیزاب کی بھری ہوئی بوتل ہے کہ اگر اس کا ایک قطرہ بھی ایمان و یقین کی انتہائی حساس اور نازک جلد پر پڑ جائے تو یقیناً چھالے

پڑ جائیں، مگر اس کو صحیح شکل وصورت میں پیش کرنا ہماری مجبوری تھی۔ اس بحث کو اس کی پوری زہرناکی اور سمّیت کے ساتھ اگر پیش نہ کیا جاتا تو غلط فہمی پیدا کی جاسکتی تھی کہ حریف کی باتوں کو ہلکا کر کے بیان کیا گیا ہے، جو علمی دیانت کے خلاف ہے بس اسی مجبوری کی وجہ سے ہم نے قلم کو ایمان ویقین کے فولادی ہاتھوں میں دے دیا کہ وہ تیزاب کی اس بوتل کو کھول دے اور پوری طرح کھول دے تاکہ اسے گندی نالی میں بہایا جاسکے۔

حدیث کس کو کہتے ہیں؟

بظاہر مستشرقین کا دعویٰ ان لوگوں کے لئے جو براہِ راست علمِ حدیث سے واقف نہیں اور اسلام کو انگریزی کتابوں سے سمجھا ہے اور دین کے اصل ماخذوں تک ان کے طائرِ فکر کی پرواز نہیں، اپیل کرنے والا ہے، لیکن جو لوگ اس سمندر میں اتر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سمندر کی بالائی سطح پر تموّج اور لہروں کا سلسلہ نظر آتا ہے وہ صرف مغالطہ اور فریب کی تیز وتند ہواؤں کے نتیجہ میں ہے اور پورا سمندر اپنی جگہ ساکن ہے، اس تموّج اور عارضی لہروں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔

مستشرقین نے سب سے پہلا دھوکہ حدیث کے مفہوم کو غلط بتا کر دیا ہے جو امتِ مسلمہ کے نزدیک بلا اختلاف تسلیم شدہ مفہوم کے خلاف ہے، ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ سنت یا حدیث ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر پوری مسلم سوسائٹی متفق ہوگئی ہے، پروفیسر شاخت نے صرف اقوالِ رسول کو حدیث کہا ہے، جب کہ دونوں باتیں بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ حدیث یا سنت کی تعریف جو پورے عالم اسلام میں کی جاتی ہے یہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ تعریف اصول حدیث کی تمام کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک حدیث یا سنت ان تمام امور کو کہتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے تعلق رکھتے ہوں چاہے وہ اقوال رسول ہوں یا افعالِ رسول یا ایسے کاموں کا بیان جو رسولؐ کی موجودگی میں صحابۂ کرام نے کیا ہو اور رسول

نے اس کی تائید کی ہو یا کم از کم اس سے منع نہیں کیا، اسی طرح رسولؐ کے اخلاق وشمائل یا خلقی صفات کا بیان رسول کی ذات سے متعلق کوئی بھی بیان جس کا تعلق بعثت سے پہلے زمانہ سے ہو یا بعثت کے بعد کے زمانہ سے۔ ان تمام امور کے بیان کو مسلمانوں میں حدیث کہا جاتا ہے۔

یعنی اسلام میں حدیث اور سنت کا مفہوم اس مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو مستشرقین بیان کرتے ہیں۔ شاخت نے صرف قولِ رسولؐ کو حدیث بتا کر تقریباً ۷۵ فی صد حدیثوں کو خارج کر دیا جب کہ دوسرے مستشرقین نے اس کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیا جو مسلمانوں کے حاشیہ خیال سے بھی باہر ہے۔ علمی دیانت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ حدیث کی وہی تعریف کی جاتی جو اہلِ اسلام کرتے ہیں اور اسی مفہوم کو اپنے دعویٰ کی بنیاد بنانا چاہیے تھا لیکن انھوں نے قصداً صحیح مفہوم سے صرف نظر کر کے اپنے ذہن سے ایک اصطلاح گھڑ لی اور اسی فرضی مفہوم پر اپنے اعتراضات کا شیش محل کھڑا کر دیا۔

حدیثوں کی کثرت باعثِ حیرت نہیں

اب ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ اسلام کے نزدیک حدیث کی جو تعریف بیان کی جاتی ہے اس کی روشنی میں مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیں تا کہ سچائی کھل کر سامنے آجائے۔

سب سے پہلے ہم اس اعتراض کو لیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں سات لاکھ حدیثیں ہیں اور بطور طنز واستہزاء یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رسولؐ کے پاس سوائے بولنے کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ حالاں کہ آپؐ تمام انسانوں کی طرح ضروریاتِ زندگی میں مصروف رہتے تھے، ایسی صورت میں لاکھوں حدیثوں کا انبار جمع نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ غلط طور پر رسول کی طرف اپنی باتوں کو منسوب کر دیا گیا ہو۔

ہم اس وقت سات لاکھ کی تعداد پر کوئی بحث نہیں کرتے کہ یہ تعداد صحیح ہے یا نہیں؟ البتہ اس کی تہہ میں جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کثرتِ حدیث کو دیکھ

کر اس کے جعلی اور مصنوعی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے، ہم سر دست صرف اسی پہلو پر گفتگو کریں گے، اصل بات یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ایک غلط دعویٰ کیا کہ حدیث صرف قول رسول کا نام ہے، حدیث کی یہ تعریف کر کے دانستہ طور پر دنیا کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی کیونکہ حدیث کی وہ یہ تعریف نہیں کرتے تو کثرتِ حدیث پر ان کا اعتراض ہلکا ہوتا ہے، ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں حدیث صرف اقوالِ رسول ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، آپؐ نے ان سے منع نہیں فرمایا، یا آپؐ کی زندگی کے سارے واقعات وحادثات آپؐ کے مصائب، تبلیغی جدوجہد کی ساری کوششوں اور اس سلسلہ میں آپؐ پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر بھی احادیث میں شمار ہوتا ہے، اس کے آگے بڑھ کر آپؐ کی شکل وصورت، خدوخال، اخلاق وعادات ذہن ومزاج اور آپؐ کے جملہ اوصاف کا ذکر بھی حدیث کی تعریف میں آتا ہے۔ صرف قولِ رسولؐ ہی حدیث نہیں، حدیث کا لفظ آج چودہ سو برسوں سے بلا اختلاف اسی معنیٰ میں استعمال ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے حدیثوں کی کثرت پر اظہار حیرت کرنے سے پہلے اس کے دائرے کی وسعت کا اندازہ کر لینا مستشرقین کے لئے ضروری تھا کیوں کہ دیانت داری سے کام لیا جاتا تو ان کا اعتراض بے وزن ہوا جارہا تھا۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جن حدیثوں میں اقوالِ رسول کو بیان کیا گیا ہے ان سے کئی گنا زیادہ ان حدیثوں کی تعداد ہے جن میں اقوالِ رسول کا کوئی ذکر ہی نہیں، بلکہ ان حدیثوں میں صورت واقعہ کا بیان ہے، کسی حادثہ کا ذکر ہے، کسی حالت کسی کیفیت کا بیان ہے، یعنی قولی حدیثوں کے مقابلہ میں غیر قولی حدیثوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، چند مثالوں سے بات واضح ہو جائے گی، آیئے اس نقطۂ نگاہ سے ہم حدیثوں کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

ہم سب سے پہلے شمائل نبوی کی حدیثوں کو لیتے ہیں جو حدیث کی اکثر کتابوں میں بَابُ صِفَةِ النَّبِیِّ ؐ کے عنوان سے ذکر کی جاتی ہیں۔ ان حدیثوں میں رسولُ اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال، روئے مبارک کی آب و تاب، چمک دمک، آپؐ کا رنگ، آپؐ کی آنکھیں، آپؐ کی بینی مبارک، دندان مبارک کا ذکر ہے، آپؐ کے موئے مبارک کہاں تھے، آپؐ کی ہتھیلیاں، قدم مبارک تلوئے، اعضاو جوڑ، سینے پر بالوں کی ایک لمی لیکر، مونڈھے پر مہرِ نبوّت، مہرِ نبوّت کی کیفیت، آپؐ کے تبسّم کا انداز، آپؐ کے بیٹھنے اور چلنے کی کیفیت، آپؐ کے قد و قامت کا بیان ہے، آپؐ کی پنڈلیاں کیسی تھیں، آپؐ کی شرم وحیا کا کیا عالم تھا؟ آپؐ کا کپڑا، آپؐ کے جوتے کیسے تھے، چادر مبارک کیسی تھی، کتنے بال سفید تھے، آپؐ نے کون سا خضاب استعمال فرمایا، بالوں کو آپؐ کس چیز سے دھوتے تھے، آنکھوں میں سُرمہ کس طرح لگاتے تھے، قدرتی طور پر آپؐ کی آنکھیں سُرمگیں تھیں یا نہیں، چلتے ہوئے آپؐ زمین پر قدم کیسے رکھتے تھے، غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیکڑوں اوصاف کا بہت سے صحابہ نے اپنے اپنے ذوق ومزاج اور تأثر کے مطابق بیان کیا ہے، یہ تمام بیانات حدیث کی تعریف میں آتے ہیں، ان میں کہیں کلامِ رسول نہیں آتا ہے[۱]۔

کسی کے اوصاف کوئی شخص بیان کرتا ہے تو ہمیشہ غائبانہ یہ بیان ہوتا ہے صاحبِ اوصاف کی موجودگی میں نہیں، ان روایتوں میں حضورؐ کے اوصاف بیان کئے جارہے ہیں وہ حضورؐ کی عدم موجودگی میں بیان کئے جارہے ہیں، پھر ایسی صورت حال میں صاحبِ اوصاف کے بولنے اور اس کے کلام کا کیا سوال ہے؟ حالاں کہ یہ تمام بیانات حدیث کے ذیل میں آتے ہیں۔ حضور ﷺ کو لاکھوں آدمیوں نے دیکھا، زیارت کی، اسلام قبول کیا، انھوں نے دوسروں سے اپنے اسلام لانے کا اور حضور کے اخلاق اور گفتگو سے متأثر ہونے کا ذکر کیا اس کی تفصیل بتائی، یہ سب باتیں حدیث کہی جاتی ہیں جب کہ ان میں رسول کے قول کا نہ کوئی موقعہ ومحل ہے اور نہ ضرورت۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے شمائل ترمذی، جس میں میرے شمار کے مطابق چار سو سے کچھ کم روایتیں ہیں، ان میں سے پندرہ بیس روایتوں میں حضورؐ کا ایک جملہ یا دو جملے ہیں اور کسی روایت میں قولِ رسول نہیں حالانکہ سب پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بَابُ صِفَةِ النَّبِی کے عنوان سے ایک مستقل باب ہوتا ہے جس میں اسی طرح کی روایتیں آتی ہیں۔

حضورؐ کی زندگی حالات ومصائب کے مختلف نشیب وفراز سے گذری ہے، آپؐ کے خلاف مشرکین کی طرف سے سازشیں ہوتیں۔ نماز میں آپؐ کو ستایا جاتا، سجدہ کی حالت میں آپؐ پر جانوروں کی اُوجھ ڈال دی جاتی[1]۔ گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا جاتا، آپ کے قتل کے لئے خفیہ کمیٹیاں ہوتیں، آپ کے قتل پر انعام کا لالچ دیا جاتا کمزور مسلمانوں کو ستایا جاتا، ان کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا، مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جاتا، شعب ابی طالب میں تین سال تک اذیت ناک زندگی گذارنی پڑتی ہے آپ کے دست مبارک سے سیکڑوں معجزات کا ظہور ہوا ان تمام باتوں کا بیان روایتوں میں آتا ہے، واقعات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے، فرداً فرداً ضعفاء مسلمین کی اذیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے یہ تمام باتیں روایتوں میں مذکور ہیں ان تمام کو علماء اسلام حدیث میں شمار کرتے ہیں جب کہ ان میں سے کچھ ہی روایتیں ایسی ہیں جن میں کلامِ رسول کے دو چار جملے ہیں بقیہ سب بیان واقعہ ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر جو واقعات پیش آئے اس سلسلہ میں مختلف ابواب میں بہت سی روایتیں ہیں، کسی راوی نے عمرہ کے لئے جانے والوں کی تعداد بتائی، کسی نے مقام حدیبیہ میں مشرکین مکہ کی طرف سے روکاوٹ کا ذکر کیا، کسی نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ بھیجنے اور مشرکین مکہ سے گفتگو کے واقعہ کو بیان کیا۔ کسی نے حضرت عثمان غنیؓ کے شہید ہونے کی افواہ کا ذکر کیا اور اس سلسلہ میں بیعت شجرہ کی تفصیل بتائی، کسی نے مشرکین مکہ کے نمائندوں کے آنے کا ذکر کیا ان کے نام بتائے ان کے طرز کلام اور صلحنامہ کی تحریر کے وقت ''رسول اللہ'' کے لفظ پر جرح کا ذکر کیا، حضرت علیؓ کو اس لفظ کے مٹانے کا حکم دیئے جانے اور بعد میں حضور کے خود مٹانے کا ذکر کیا، کسی نے بیعت رضوان کے وقت حضورؐ کا اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیکر ان کی طرف سے بیعت لینے کا ذکر کیا، کسی راوی نے اسی ۸۰ مشرکین کا ذکر کیا جو مسلح ہو کر جبل تنعیم سے خفیہ طور پر آرہے تھے کہ غفلت پا کر اسلامی لشکر پر حملہ کردیں اور بعد میں ان کی گرفتاری اور پھر بلا شرط

[1] مسلم شریف ج ۲، ص ۱۰۸ باب اشتداد عضب اللّٰہ اور بابُ مالقی النبیؐ من اذی المشرکین.

ان کی رہائی کو بیان کیا، کسی راوی نے حدیبیہ میں پانی کی قلّت اور حضورؐ کے تیر دینے اور اسے کنویں میں ڈالنے اور پھر کنویں میں پانی کی کثرت کا ذکر کیا، کسی نے دب کر صلح کیئے جانے پر حضرت عمرؓ کے جوش وجذبہ کا بیان کیا، کسی نے صلح حدیبیہ کی تکمیل کے بعد آپؐ پر اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُّبِيناً کے نازل ہونے کا ذکر کیا، کسی نے صلحنامہ لکھے جانے کے دوران حضرت ابو جندل کا ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے آنے اور حضورؐ کے ان کے واپس کرنے کا تذکرہ کیا۔

عرضیکہ صرف ایک واقعہ سے متعلق بے شمار حدیثیں کتابوں میں ہیں ان میں سوائے چند روایتوں کے کسی میں کلامِ رسول نہیں نہ اس کا موقعہ ہے نہ بیانِ واقعہ میں اُس کی ضرورت۔ لیکن اس سب روایتوں کو ہم اپنی اصطلاح کے مطابق حدیث کہتے ہیں اس سفر میں ایک مہینہ سے زیادہ وقت لگا ہوگا اس مدت میں ہونے والے واقعہ سے متعلق روایتیں ہیں جن میں زیادہ تر وہی روایتیں ہیں جن میں صحابی واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ حضور کا کلام کسی کسی روایت میں ایک دو جملوں میں ہے حالاں کہ یہ سب کی سب حدیثیں کہی جاتی ہیں اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضور ایک مہینہ تک مسلسل بولتے ہی رہے۔ کتنا سفیہانہ یہ خیال ہے؟

ایک بات اور بھی ذہن میں رکھیں کہ چودہ سو صحابہ کرام اپنے وطن سے ایک مہینہ کے کٹھن سفر پر نکلے ہیں، خانہ کعبہ کے طواف کا ارادہ ہی نہیں دل میں اس کی تڑپ اور تمنا رکھتے ہیں اور عین موقعہ پر ان کی امیدوں اور تمناؤں پر پانی پھر جاتا ہے اور طاقت کے ذریعہ روک دیئے جاتے ہیں، بے بسی کے ساتھ ناکامی کا صدمہ لے کر واپس ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ واپسی کے بعد بہت دنوں تک انھوں نے اپنی زندگی کے اس افسوسناک واقعہ کو یاد رکھا ہوگا اور دوسروں سے بیان کیا ہوگا، کیونکہ یہ ایک بالکل فطری تقاضا ہے کہ ایسے اہم واقعہ کا اکثر مواقع پر ذکر آئے۔ اگر بالفرض ان تمام آدمیوں نے اپنی اپنی زبان سے دوسروں کو یہ واقعہ سنایا اور حضورؐ کی باتوں کا ذکر کیا تو یہ سب کی سب حدیث کی تعریف میں آجاتا ہے اور ان میں کہیں رسول کے بولنے اور کلام کرنے کا

کوئی سوال نہیں، ایسی صورت میں حدیثوں کی کثرت پر اظہار حیرت کیوں ہے؟
ایک مثال اور لے لیجئے، فتح مکہ کے سلسلہ میں بہت سی روایتیں ہیں اور واقعہ کے ایک ایک جزئیہ کو بیان کرتی ہیں۔ لیکن ان میں قولی حدیثیں کتنی ہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، کسی راوی نے مکہ پر چڑھائی کے اسباب کو بیان کیا اور مشرکین مکہ کی عہد شکنی کا ذکر کیا اور مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلہ کے ایک آدمی کے قتل میں تعاون دینے کا تذکرہ کیا، کسی نے لشکر اسلام کی تعداد بتائی، کسی نے اسلامی فوج کے جھنڈوں کا ذکر کیا، کسی نے حضورؐ کی اونٹنی اور آپؐ کے ردیف کا نام بتایا، کسی نے مکہ میں داخلہ کا ذکر کیا، کس نے حضور کے اعلان کا ذکر کیا کہ اگر کوئی فلاں فلاں جگہ چلا جائے تو اس کو امان ہے، کسی نے عام مشرکین کی معافی کو بیان کیا، کسی نے ان مشرکین کے نام بتائے جن کو کہیں بھی مل جائیں تو قتل کا حکم دیا گیا تھا، کسی نے حضرت عثمانؓ کا ایک مشرک کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے اس کے لئے سفارش کرنے کا ذکر کیا اور حضور کے چہرہ پھیر لینے اور اس مشرک کو قتل نہ کرنے پر تنبیہ کرنے کو بیان کیا، کسی نے حضرت عکرمہ اور دوسرے بڑے مشرکین مکہ کے بھاگ جانے کا ذکر کیا اور ان کی بیویوں کا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش اور جان بخشی کی درخواست کا ذکر کیا، کسی نے مشرکین کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی بیویوں کو ان کے نکاح میں بلا تجدید نکاح باقی رکھے جانے کا تذکرہ کیا، کسی نے فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کے قیام کی مدت اور مشرکین کے آنے اور اسلام قبول کرنے کو بیان کیا، کسی نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے اسلام لانے کا ذکر کیا، کسی راوی نے اس مشرک کا ذکر کیا جو حضورؐ کے فرمان کے مطابق گردن زدنی تھا اور خانہ کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا تھا، کسی نے اس گفتگو کو بیان کیا جو مشرکین سے ہوئی سوال و جواب کے بعد عام معافی کا اعلان کیا گیا۔

غرضیکہ اس سلسلہ میں مختصر اور طویل بہت سی روایتیں ہیں ہر صحابی نے جو اس موقع پر موجود تھا مستقبل میں موقعہ و محل کے لحاظ سے اس واقعہ کے جس جزئیہ کے بیان کی ضرورت ہوئی اس کو دوسروں سے بیان کیا ہے، ان بیانات سے اسلام کے قوانین

اور اصول وضوابط اور شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں، مسائل کا علم ہوتا ہے اور کسی مسئلہ پر بطور حجت ودلیل ان روایتوں کو پیش کیا جاتا ہے جو کلامِ رسول پر مشتمل نہیں بلکہ افعال رسول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان تمام روایتوں میں نہ حضورؐ کو بولنے کی ضرورت ہے نہ کلام کی مصروفیت، ان تمام روایتوں کی تعداد کو دیکھ کر کوئی احمق ہی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے رسول فتح مکہ کے وقت مسلسل کئی ہفتوں تک بولتے رہے، یہ کیسی نادانی کی باتیں ہیں، یہ کوئی دقیق مسئلہ نہیں کہ اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے، ہر عامی اور ان پڑھ آدمی اس سچائی کو سمجھ سکتا ہے۔ اب آیئے ایک دو مثال احکام کی روایتوں کی بھی دیکھ لی جائیں اس سلسلہ میں دو مختصر مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ابوداؤد صحاح ستہ کی ایک مشہور کتاب ہے، اس میں "باب صفة وضوء النبی" سے لے کر "بابُ توقیت مسح الخفین" تک ایک سرسری جائزہ لیجئے، اس میں ۴۹ حدیثیں آئی ہیں ان میں صرف دو حدیثیں ایسی ہیں جن میں حضور کا ایک یا دو جملے ہیں ساری حدیثوں میں بیان واقعہ ہے، اسی طرح کتاب الصلوٰۃ میں بابُ وَقتِ الصَّلوٰۃِ النّبی سے لے کر بابُ کنس المسجد تک ۵۸ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جن میں بارہ روایتوں میں ایک جملہ یا دو جملے یا اس سے کچھ زائد جملے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے جاتے ہیں باقی روایتوں میں قول رسول نہیں صرف بیان واقعہ ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کے ذخیرہ میں قولی حدیثوں کا تناسب کیا ہے[۱]۔

ان مثالوں سے کیا ثابت ہوتا ہے

اوپر جتنی مثالیں پیش کی گئیں ان سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس طرح کی تمام روایتوں کا شمار مسلمانوں کے نزدیک حدیث ہے تو سات لاکھ تو کیا چودہ لاکھ حدیثیں بھی ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی ضرورت نہیں، اور جو اظہار حیرت کرے تو سمجھ لو کہ یا

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ابوداؤد مطبوعہ رشیدیہ جلد ۱ ص ۱۴ تا ۲۰۔ وابوداؤد ج ۱ ص ۵۸ تا ۶۴

تو دیوانہ ہے، یا قدرت نے اس کی سمجھ بوجھ کو سلب کر لیا ہے۔

ان مثالوں سے دو باتیں مستشرقین کے علیٰ الرغم بہت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں کہ اس طرح کی روایتیں صحابہ کرام اگر زندگی بھر میں کبھی نہ کہتے تو بھی وہ ان کے ذہن سے نہیں نکل سکتی تھیں، کیوں کہ ہر شخص کو اپنا تجربہ اور مشاہدہ تا زندگی یاد رہتا ہے آپ میں کوئی شخص ایسا نہیں کہ اس کو اپنے بچپن کے اہم ترین واقعات یاد نہ ہوں اور ساٹھ ستر سال کی عمر ہونے کے بعد اس کی تفصیلات آپ نہ بیان کر سکیں۔ دوسری یہ حقیقت صاف ہوگئی کہ اس میں حضورؐ کے مسلسل بولنے کا جو طنز کیا جاتا ہے اس کا کوئی موقعہ نہیں، ایک معزز شخصیت کو ہزاروں آدمی دیکھتے ہیں اس کی بات کو سنتے ہیں ہر شخص اپنی اپنی جگہ دوسروں سے اپنے تجربات بیان کر سکتا ہے، ان بیانات کو اس شخصیت کے فضل وکمال کے لئے سند اور دلیل بنایا جا سکتا ہے، حدیثوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

وہ صحابہ کرام جو زندگی کے بیشتر لمحات میں آپؐ کے ساتھ رہے، مدینہ کی زندگی میں ہمہ وقت شرف معیت حاصل تھا، اسفار وغزوات میں فخر ہمرکابی حاصل تھا، رسول کے سارے اقوال وافعال ان کی نگاہوں کے سامنے تھے سارے واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے وجود میں آئے، صحابہ کرام نے آپؐ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ رکوع کیسے کرتے ہیں، قومہ میں کتنی دیر ٹھہرتے ہیں، سجدہ کیسے کرتے ہیں اور کتنی دیر تک کرتے ہیں، آپؐ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا کہ کس ترتیب سے آپؐ وضو کرتے ہیں، ایک عضو کو کتنی بار دھوتے ہیں، آپؐ کو امامت کرتے ہوئے دیکھا، تہجد پڑھتے ہوئے پایا، آپؐ نے لشکر کی کمان فرمائی مشرکین سے صلحنامہ ان لوگوں کے سامنے مرتب ہوا، علاقے انھیں کی موجودگی میں فتح ہوئے۔ مالِ غنیمت ان کی موجودگی میں تقسیم ہوا۔ غرضیکہ سارا کاروبار زندگی رسول کا صحابہ کی آنکھوں میں تھا، حافظہ میں محفوظ تھا، صفحہ دل پر مرتسم تھا اس لئے کہ سارے واقعات چشم دید تھے تو ان کو یاد کرنے اور کتاب کی طرح رٹنے کی ضرورت ہی نہیں تھی صحابہ کرام رسول کی کتاب زندگی کی از

خود مکمل تفسیر بن چکے تھے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اور افعال و اعمال کے نقطۂ نگاہ سے بھی، جو لوگ سفر کرتے ہیں ملکوں میں سیاحت کرتے ہیں۔ برسوں وطن سے دور سفر میں گذارتے ہیں اور سالوں بعد جب اپنے وطن لوٹتے ہیں تو سارے واقعات دوسروں سے مجلسوں میں بیان کرتے ہیں اخبارات ورسائل میں لکھتے ہیں، چونکہ سارے واقعات خود ان پر گزرے ہیں اس لئے پوری تفصیلات کے ساتھ دوسروں کو سنا دیتے ہیں اس میں غلطی کا احتمال نہیں رہتا، صحابہ کرام تو حضور کی محبت میں دیوانے تھے، حضور کی اک اک ادا کی یاد کو اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تصور کرتے تھے وہ بھلا کیسے بھول سکتے تھے ان کو ایک ایک واقعہ کی تفصیل یاد تھی، صفحۂ ذہن پر نقش تھی جب کوئی ان سے حضورؐ کے متعلق کچھ دریافت کرتا تھا تو وہ پورے وثوق کے ساتھ گذشتہ واقعات وحالات کو بیان کر دیتے تھے اس بیان واقعہ میں کہیں کہیں ایک دو جملے حضورؐ کے آجاتے ہیں اس کو وہ لفظ بہ لفظ سنا دیتے ہیں، یہ فطرت انسانی ہے کہ جب کوئی شخص عظیم ترین شخصیت سے ملتا ہے تو اس کی ہر ادا اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور اگر اس کو اس عظیم شخصیت سے شرف ہمکلامی حاصل ہو گیا تو اس کی ہر بات اس کے دل پر نقش کالحجر ہو جاتی ہے، صحابہ کرام کی نگاہوں میں حضور کا مقام ومرتبہ جو تھا اس سے پوری دنیا واقف ہے تاریخ اسلام کا ہر صفحہ یہ داستان مفصل سناتا ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے کئی خاص مواقع پر چند جملے نکلے تو اس کو ان کا ذہن کیسے فراموش کر سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قولی حدیثوں کے مقابلہ میں بیان واقعہ کی روایتیں کئی گناہ زیادہ ہیں اس لئے یہ سوال ہی غلط ہے کہ حدیثوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے محفوظ رہی؟ اس کو خلاف عقل کہنا خود اپنی عقل کا ماتم کرنا ہے۔

بیان واقعہ کی یہ ساری روایتیں مسلمانوں کے یہاں حدیث کہی جاتی ہیں ان سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں اور کسی مسئلہ میں بطور حجت بیان واقعہ کی روایت کو پیش کیا جاتا ہے اور پوری امت کا فیصلہ ہے ''اَلصَّحَابَۃ کلّھُم عُدول'' جب بیان

کرنے والا سچا ہے تو جو کچھ اس نے بیان کیا یقیناً صحیح ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا بھی صحیح اور درست ہے۔

ان چند مثالوں سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ہمارے ذخیرۂ حدیث میں قولی حدیثوں کی تعداد دوسری حدیثوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں اور اقوالِ رسول جن حدیثوں میں آئے ہیں وہ چند جملوں پر بالعموم مشتمل ہیں اس میں استثناء بھی ہے لیکن مستثنیات کی تعداد بہت کم ہے مثلاً حدیثِ شفاعت وغیرہ اس میں واقعہ کا تسلسل اور سوال وجواب کچھ اتنا یکساں ہے کہ ذرا توجہ سے ذہن اس کو محفوظ کر سکتا ہے۔ بعض روایتیں بہت لمبی ہیں لیکن وہ محل حیرت نہیں مثلاً کعب بن مالک کی روایت جو غزوۂ تبوک سے تخلف کے واقعہ کو پیش کرتی ہے وہ ٹائپ میں چھپی ہوئی بخاری کے چار صفحوں سے زائد میں ہے لیکن پوری حدیث میں قول رسول چند جملوں پر مشتمل ہے اور بقیہ پوری حدیث میں بیان واقعہ ہے اور خود صاحب واقعہ بیان کر رہا ہے، اسی طرح واقعہ افک کی روایت بخاری کی طویل ترین روایتوں میں شمار ہوتی ہے، اس میں ایک واقعہ ایک دو موقعوں پر رسول کے چند کلمات ہیں بقیہ بیان واقعہ ہے، اور ہر شخص اپنا تجربہ اور مشاہدہ زندگی بھر یاد رکھتا ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے ان حالات میں یہ کہنا کہ اتنی حدیثوں کو کوئی حافظہ محفوظ نہیں رکھ سکتا، انسانی فطرت سے ناواقفی کی دلیل ہے اور ''پروفیسر شاخت'' کا سات لاکھ حدیثوں کی تعداد بتا کر دعویٰ کرنا کہ مسلمانوں کے رسول سوائے بات کرنے اور بولنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں کرتے تھے، کتنا غلط اور جھوٹا دعویٰ ہے۔

علمی دیانت کے بجائے فریب

میری اس تفصیل سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ''پروفیسر شاخت'' کا ذخیرۂ احادیث پر اظہار حیرت کرنا اور اس کو خلاف عقل ہونے کا دعویٰ کرنا اور مذاق اڑانا مہمل، غلط اور انسانی زندگی کے تجربات ومشاہدات اور حقیقتِ واقعہ کے کتنا خلاف ہے۔

اس نے اپنے دعویٰ کی بنیاد حدیث کے خود ساختہ مفہوم پر رکھی اور حدیث کو قول رسول تک محدود کر دیا جو مسلمانوں کی اصطلاح کے بالکل خلاف ہے، ایک جھوٹ بول کر اور اپنے قاری کو ایک غلط فہمی میں مبتلا کر کے اس نے اعتراضات کا ایک طومار باندھ دیا، اگر اسلام پر اعتراض کرنا ہے تو علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ امّتِ مسلمہ کی مصطلحات کا پہلے غائر مطالعہ کرلیا جائے اس کے بعد اعتراض کی جسارت کرنی چاہئے، یہ تو سراسر علمی بد دیانتی اور تحقیق کے نام پر فریب دہی کا واقعہ ہے، تمام اسلامی دنیا حدیث کی تعریف یہ کرتی ہے:

ما اثر عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قول اوفعل اوتقریر اوصفةٍ خلقیة اوخلقیة اوسیرة سواء کان قبل البعثة ام بعدھا[۱]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول اور آپ کا عمل نقل کیا گیا ہو یا آپ نے لوگوں کے کسی فعل پر اپنی رضا ظاہر کی ہو یا آپ کی خلقی اوصاف یا آپ کے اخلاق وعادات وخصائل یا حالات زندگی چاہے قبل بعثت کے ہوں یا بعثت کے بعد کے۔

اس تعریف سے حدیث کے دائرے کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، قول رسول حدیث کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ شاخت نے اس تعریف سے صرفِ نظر کر کے صرف اقوالِ رسول کو حدیث کہا اور اعتراض کرنا ہوا تو شمار میں ان تمام حدیثوں کو شامل کرلیا جس میں قول رسول کے بجائے بیان واقعہ ہے اور پھر ساری حدیثوں کو قول رسول مان کر ان کی تعداد سات لاکھ بتا کر یہ طنز کیا کہ مسلمانوں کے رسول ۲۳ سال تک مسلسل بولتے ہی رہے ہوں گے، عملی دنیا میں یہ کتنا بڑا فریب اور دھوکا ہے اور بد باطن افراد مستشرقین کی تحقیق پر ایمان لا کر اپنا دین وایمان تباہ کر لیتے ہیں۔

احادیث کی سندیں جعلی ہیں

اب آیئے! دونوں مستشرقین کے اعتراض کے اس پہلو کو لیتے ہیں جو وہ کہتے

---

[۱] توجیھه النظر ص۳، السنة ومکانتھا ص۱۵۱، بحواله دراسات حدیث النبوی.

ہیں کہ حدیث علماء اسلام کی وضع کردہ ہیں، دوسری اور تیسری صدی میں ان کو مرتب کر کے غلط طور پر اس کو رسولؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

حدیث کی کتابوں میں ہر روایت کے شروع میں سند ہوتی ہے، بغیر سند کوئی روایت معتبر نہیں ہوتی ہے حدیث کا جامع کہتا ہے: **حَدَّثَنا فلان عن فلان عن فلان عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم** .... جامعؒ کتاب کہتا ہے کہ مجھ سے میرے شیخ نے بیان کیا کہ انھوں نے فلاں سے سنا ان کے اوپر کے شیخ کہتے ہیں میں نے اپنے شیخ سے سنا وہ شیخ کہتے ہیں کہ میں نے فلاں صحابیؓ سے سنا، صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ............اس کے بعد حضورؐ کی بات صحابیؓ نقل کرتے ہیں اس کو محدثین کی اصطلاح میں سند کہا جاتا ہے۔

''گولڈزیہر'' اور ''پروفیسر شاخت'' دونوں کہتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے کسی نے کسی سے نہیں سنا، سندیں فرضی ہیں اور مصنوعی طور پر ان جملوں کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں جو علماء مابعد کے طبع زاد ہیں، پوری دنیا میں اپنی علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے عالم گیر شہرت رکھنے والے محققین اس طرح کا سفیہانہ اعتراض کرتے ہیں اور ضدی بچوں کی طرح اپنی بچکانہ ضد پر جمے رہتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے، آخر یہ محققین اسی سرزمین پر رہتے ہیں یا کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہیں؟ ان کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے نظام اور قوانین واصول شہادت سے کوئی واقفیت ہے یا نہیں؟ ایک محدث جس کی دیانت داری اور صداقت کی دنیا قسمیں کھاتی ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں محدث نے بیان کیا یہ محدث بھی اپنے زہد وتقویٰ اور دین ودیانت کے لئے مشہور ہے وہ محدث کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں تابعی نے بیان کیا اور دنیا جانتی ہے کہ اس تابعی نے صحابیؓ سے ملاقات کی ہے، پھر تابعی کہتا ہے کہ مجھ سے فلاں صحابی نے بیان کیا اور صحابہ کی صداقت وراست بازی دوست دشمن سب کو تسلیم ہے، وہ صحابیؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ فرماتے تھے کہ یہ محققین کہتے ہیں کہ یہ سب جھوٹے ہیں، کیوں جھوٹ ہے؟ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں، جب کہ دنیا کا سارا

نظام اسی اصول شہادت پر قائم ہے اگر اصولِ شہادت کو تسلیم نہیں کرتے ہو تو تم کو اپنا صحیح النسب ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ایک جج کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، گواہ شہادت دیتے ہیں کہ ہم نے اس کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے، جج ان شہادتوں پر یقین کر لیتا ہے اور وہ ملزم کو پھانسی پر چڑھانے کا فیصلہ سنا دیتا ہے یعنی چند آدمیوں کے بیان پر ایک انسان کو دنیا کی سب سے بڑی سزا دینے میں اس کو ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور اس کو دنیا میں جینے کا جو حق حاصل تھا چھین لیتا ہے۔ جج نے اپنے فیصلہ سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک انسان کی جان گواہ کی صداقت کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی، اس کی جان لی جا سکتی ہے لیکن گواہ کو جھوٹا نہیں کہا جائے گا، اپنے فیصلہ سے گواہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جج نے گواہ کی صداقت کو پرکھنے کے لئے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا ہے؟ بلکہ سچ کہا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ اپنی زندگی میں جھوٹ نہیں بولتا ہے؟ اور کبھی جھوٹ نہیں بولا؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ کے اخلاق اچھے ہیں، سماج میں بدنام آدمی نہیں ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ یہ کاروبار میں بددیانتی، جعل سازی اور فریب دہی نہیں کرتا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ اس نے کبھی کسی کی بہو بیٹی کی عصمت نہیں لوٹی؟ یا زندگی میں کبھی شراب نہیں پی؟ منشیات کا استعمال نہیں کرتا، کبھی کسی عورت کا اس نے اغوا نہیں کیا؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ نے بغیر کسی لالچ کے گواہی دی ہے؟ اور اس کو مدعیان قصاص کی طرف سے گواہی کا معاوضہ نہیں دیا گیا ہے؟ کیا جج کو معلوم ہے کہ گواہ ایماندار، دیانت دار، انصاف پسند، نیک نام اور سچا ہے؟ ظاہر ہے کہ عدالت کے جج کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں اور نہ جج اپنے فیصلے میں اس کی ضرورت سمجھتا ہے، وہ صرف گواہ کے بیان کو دیکھتا ہے اور چند جرحوں کے بعد اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے جب کہ ہر ہر قدم پر یہ احتمال موجود ہے کہ گواہ جھوٹ بول سکتا ہے، کرایہ کا گواہ ہو سکتا ہے، گواہی میں اس کی دلی عداوت کو دخل ہے اور کلی طور پر گواہ قابل اعتماد نہیں ہے اس کے باوجود صرف اس کے بیان پر ایک شخص کی

انتہائی قیمتی جان لے لیتا ہے اور اس سے دنیا میں جینے کا حق لے لیتا ہے۔

اس کے برخلاف ہمارا قانون شہادت یہ ہے کہ اگر گواہ فاسق وفاجر ہے، چھوٹے چھوٹے گناہوں پر اصرار کرتا ہے یا مدعی کا ممنون احسان ہے، بازاروں میں کھاتا پیتا ہے، فاسقوں جیسا لباس پہنتا ہے، داڑھی منڈاتا ہے، شراب پیتا ہے یا کوئی نشہ استعمال کرتا ہے، یا کبھی زنا کا مرتکب ہوا تھا یا کسی پاک دامن عورت پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی ہے ایسے تمام لوگوں کی شہادت مردود مانی جاتی ہے، ایک چاند کی رویت کی معمولی سی شہادت میں بھی مسلمان ان تمام اصول شہادت کی پابندی کرتا ہے، اس طرح کے تمام افراد کی گواہیاں ہمارے قانونِ شہادت میں نا قابل قبول ہیں۔

حدیثوں کی روایت کرنے والے راویوں کے لئے یہ قانونِ شہادت اور بھی سخت ہو جاتا ہے اور تا حد امکان بشری اس کی صداقت و دیانت داری کو پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔ دیانت وصداقت کی پرکھ کے لئے ہمارے یہاں جرح وتعدیل کی اتنی کھری کسوٹی ہے کہ آج تک دنیا میں کسی کی صداقت و دیانت کو پرکھنے کے لئے ایسی کڑی کسوٹی وجود میں نہیں آئی، اگر اس کسوٹی پر کسی ملک، کسی قوم اور کسی مذہب کی تاریخ پرکھی جائے تو اس کی صداقت کو ثابت کرنا دشوار ہو جائے۔

حدیثوں کے بیان میں جتنے راویوں کے نام آتے ہیں ان تمام لوگوں کو اسی کسوٹی پر کسا جاتا ہے اور جب یہ کسوٹی بتاتی ہے کہ یہ کھرا سونا ہے تب اس کی روایت کی قیمت متعین کی جاتی ہے اور اس کی بات کا اعتبار کیا جاتا ہے، ورنہ بڑے سے بڑا محقق ہو یا نامور عالم، مشہور دانش ور ہو یا مقبول ترین عابد وزاہد مانا جاتا ہو، دنیاوی عُہدوں میں سے بڑے سے بڑے عہدے پر فائز ہو، جب حدیث کی سند میں اس کا نام آجائے گا تو تفتیش شروع ہو جائے گی، جرح وتعدیل کی کسوٹی پر اس شخص کی پوری زندگی کو پیش کیا جائے گا، اس کی ظاہری عزت وشہرت اور منصب کی عظمت اس جانچ اور پرکھ پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے، اگر روایت کی صحت کے لئے جتنی شرطیں ہیں اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط کی بھی اس میں کمی ہے تو اس کی روایت اس کے

منہ پر ماردی جائے گی۔

مشہور اخباری راوی مجالد بن سعید ہمدانی کے شہر کوفہ میں مشہور محدث خالد الطحان سفر کرتے ہوئے پہنچے اور اس سے ملاقات کی اور جب وہ اپنے وطن واپس تشریف لائے تو ان کے وطن کے علماء نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کوفہ گئے اور مجالد بن سعید سے کوئی روایت نہیں لی؟ انھوں نے اس کی وجہ صرف یہ بتائی "**لانه كان طويل اللحية**[1]" میں اس کے پاس گیا تھا لیکن اس کی ضرورت سے زیادہ لمبی داڑھی دیکھ کر واپس چلا آیا اور اس سے کوئی روایت نہیں لی، مسلمانوں کے شعار داڑھی کی ایک حد ہے اس سے کہیں زیادہ لمبی داڑھی بدگمانی پیدا کرتی ہے کہ اس نے داڑھی کو سنت سمجھ کر شاید نہیں رکھا ہے، بس اتنی سی خامی کی وجہ سے اس کی روایت کا اس محدث کے نزدیک اعتبار ختم ہو گیا۔ خالد الطحان نے خود کوئی اور دوسری وجہ نہیں بتائی البتہ دوسرے علماء جرح وتعدیل نے اس راوی پر کڑی سے کڑی جرحیں کی ہیں، تفصیل اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(میزان الاعتدال ج ۳، ص ۴۳۱ و تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۱)

آپ جامع صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دوسری صحاح کی کتابیں پڑھتے ہیں تو یقین کیجئے کہ محض اُن کے سلسلۂ سند کو دیکھ کر آنکھ بند کر کے پوری امت نے ان کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ بخاری یا دوسرے ائمہ حدیث اپنی حدیث کی سند میں جتنے نام لیتے ہیں، ہم ہر ایک کو فرداً فرداً جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، راوی کی پیدائش سے لے کر اس کی وفات تک کے حالات کو جان لینے کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ اس راوی کے معاصر علماء اور متدین حضرات اور فن اسماء الرجال کے ائمہ حضرات اس راوی کے بارے میں کیا خیال رکھتے تھے، اس کا سلسلہ نسب کیا ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے، اپنے اوپر کے راوی سے اس کی ملاقات یا سماع حاصل ہے یا نہیں، یہ ناموں میں اُلٹ پھیر تو نہیں کرتا ہے، دیانت داری اور تقویٰ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰، ص ۴۱ میزان الاعتدال ج ۳، ص ۴۳۰

کے لحاظ سے کس درجہ کا ہے، اس کے شیوخ حدیث کون کون ہیں؟ حافظہ کیسا ہے، بڑھاپے میں اس کا حافظہ کمزور تو نہیں ہو گیا تھا؟ اس کے عقائد مسلمانوں کے سواد اعظم کے خلاف تو نہیں ہیں؟ کسی گمراہ فرقہ کا داعی تو نہیں ہے؟ غیر مذہب کے اہل علم کے پاس اس کی نشست و برخاست تو نہیں ہے، عام معاشرتی زندگی میں اس کی صداقت و دیانت پر بھروسہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟ غرضیکہ راوی کے بارے میں وہ تمام حالات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے اس کا سچا اور ثقہ ہونا ثابت ہوتا ہو، سند میں جتنے راویوں کے نام آئے ہیں فرداً فرداً ہر ایک نام کے بارے میں یہی کرید اور تلاش و جستجو اور تجسس کا عمل ہوتا ہے، جب اتنی چھان بین، تفتیش و تحقیق اور کرُید کرلی جاتی ہے اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ثقہ اور قابل اعتماد اور سچا ہے تب اس کی روایت کو قبول کیا جاتا ہے، اگر اسکی زندگی کے کسی پہلو پر دینی نقطۂ نگاہ سے حرف آتا ہے یا اس کی صداقت و دیانت مشتبہ ہے یا دین کے معاملہ میں وہ سچا اور مخلص نہیں ہے تو بلا رُو رعایت اس کو پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا جاتا ہے اور اس کی روایت کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں نہ بادشاہانِ وقت کی پروا کی گئی اور نہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کا رعب داب اور جاہ وجلال ان کی کوتاہیوں کو واشگاف کرنے سے روک سکا، نہ ظاہری زہد و تقویٰ کی شاندار مسندوں پر متمکن افراد کے ظاہری زہد و تقویٰ سے متاثر ہو کر ان کی خامیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال کر ان کی روایتوں کو قبول کر لیا گیا، علم حدیث میں اس کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب اتنی کڑی کسوٹی پر آدمی کھرا سونا ثابت ہو سکا اور وہ کہتا ہے کہ ہم سے فلاں نے بیان کیا تو ہم اس کا اعتبار کیوں نہیں کریں گے اور اس سے اُوپر کا راوی کہتا ہے کہ ہم نے فلاں سے سنا اور وہ بھی اتنا ہی کھرا سونا ہے تو اس پر اعتبار نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ جب کہ تم بدکردار سے بدکردار کی بات کو سچ مان کر عدالت میں گواہی لے کر ایک انسان کی انتہائی قیمتی جان لے سکتے ہو، پھر حدیث کے معاملہ میں تمہارا رویہ اس کے برعکس کیوں ہے؟

احتیاط کا بلند تر معیار

اگر حدیث کے مجموعوں میں کوئی روایت ایسی آتی ہے جس میں روایت کرنے والے کسی بھی راوی کے نام سے اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کے ماہرین واقف نہیں ہیں، اس راوی کے حالات زندگی روشنی میں نہیں ہیں اور اس کی شخصیت کا واضح تعارف نہیں پایا جاتا ہے تو پوری روایت اس راوی کی وجہ سے قابل اعتماد نہیں رہ جاتی اور کسی مسئلہ میں اس روایت کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جاسکتا ایسے راوی کو محدثین کی اصطلاح میں مجہول راوی کہا جاتا ہے اور مجہول راوی کی کوئی روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ احادیث کے پورے ذخیرے میں جتنے راویوں کے نام آئے ہیں ان کی پوری اور مکمل فہرست ان کے حالات زندگی ان کے دین ودیانت وثوق واعتماد، ان کے شیوخ حدیث کا ذکر، ان کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کی رائیں وہ سب مسلمانوں کے پاس محفوظ ہیں، راویوں کے حالات پر مشتمل کتابوں کو فن اسماء الرجال سے تعبیر کیا جاتا ہے، معتمد اور معتبر حدیث کے مجموعوں میں جو مسلمانوں کے نزدیک قابل حجت ہیں ایسی تمام حدیثوں اور روایتوں میں آنے والے سارے ناموں کا ہمیں تفصیلی علم حاصل ہے اور کوئی گمنام راوی مستند احادیث میں دخل ہی نہیں پاسکتا۔

اگر حدیثیں صحیح نہیں تو دنیا کی کوئی تاریخ صحیح نہیں

جب صورت حال یہ ہے تو کتنی دیدہ دلیری اور بے حیائی کی بات ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ حدیثیں دوسری اور تیسری صدی میں لکھی گئیں اور سندوں میں فرضی نام رکھ کر ان کا سلسلہ رسول کی ذات تک پہنچا دیا گیا ہے، اگر اتنے سچے، دیانت دار اور کھرے انسانوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں کرتا تو اس کو پوری دنیا کی تاریخ کی کتابوں کو دریا برد کر دینا چاہیئے کیوں کہ ان کے مرتب کرنے والوں کی دیانت وراستبازی اور ان کی نجی زندگی سے ہمیں کوئی واقفیت نہیں، تاریخ کی کتابوں کو لکھنے

والے کس قماش کے تھے، اپنی عملی زندگی میں کتنے فریبی، بدکردار، خوشامد پسند، حکومت کے تنخواہ دار، وظیفہ خوار، اور غلام رہے ہوں ایسا کوئی شخص کوئی تاریخ مرتب کرتا ہے تو آنکھ بند کر کے ساری دنیا کیوں اعتبار کر لیتی ہے؟ جب کہ تاریخ کے بیان کرنے میں قدم قدم پر جھوٹ کا احتمال موجود ہے اور رطب و یابس واقعات کے جمع کرنے کے شکوک وشبہات موجود ہیں، ایک مؤرخ گھر میں بیٹھ کر صدیوں کی تاریخ مرتب کر لیتا ہے اور پہلے کی لکھی ہوئی چند کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب مکمل کر لیتا ہے اس کو کیا معلوم کہ جن کتابوں کو اس نے سامنے رکھا ہے اس کے مصنّفین نے چشم دید حالات لکھے ہیں یا افواہوں کو قلم بند کیا ہے، اور پھر اس کے لکھنے میں اس کا کوئی مفاد تو وابستہ نہیں، کسی کی خوشامد کے زیر اثر وہ کتاب تو نہیں مرتب کر رہا ہے پھر مصنف اپنے مآخذ ومصادر جو بتاتا ہے اس کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے کا کیا ثبوت ہے، کیا اس سے زیادہ مستند اور قابل اعتماد ثبوت ہے جو محدثین اپنے مآخذ کے متعلق بتاتے ہیں، اپنے شیخ کا نام بتاتے ہیں ان سے حدیث سننے کو بیان کرتے ہیں ان کے حالات بتاتے ہیں ان کے شاگردوں کے نام بتاتے ہیں ان کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کی شہادتیں پیش کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے یہ حدیث سنی، اسی طرح ہر راوی اپنے شیخ کے بارے میں ساری تفصیلات جانتا ہے۔ اس احتیاط اور دیانت داری کے باوجود کہ اس سے زیادہ سچائی کا ثبوت ممکن نہیں پچاسوں ہزار فرشتہ صفت انسانوں کو تم جھوٹا کہتے ہو؟ یہ دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا اعجوبہ ہے، اس کو علمی تحقیق کے نام پر ہٹ دھرمی، تعصب اور تنگ نظری کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

انسانیت کا سارا اجتماعی نظام انھیں اصولوں پر چلتا ہے، ایک دوسرے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر مرحلہ میں کسی نہ کسی بات پر اعتماد کرنا ضروری ہوتا ہے، پھر محدثین نے کیا جرم کیا ہے کہ ان کی سچائی اور صداقت ودیانت پر یقین نہیں کیا جاتا؟ ظاہر ہے کہ یہ علمی تحقیق کے نام پر اسلام کے صاف شفاف دامن پر داغ لگانے کی کوشش ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں، اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے آگے سدِّ

سکنڈری کھڑی کرنی ہے، یہودیت، صیہونیت، عیسائیت اور الحاد کے جراثیم دماغوں میں موجود ہیں جو صحیح فکر اور اخلاص و دیانت داری سے نام نہاد مفکرین کو محروم کرتے جا رہے ہیں۔ اب ان میں انصاف پسندی، راست بازی، صداقت و دیانت کے جوہر کا فقدان ہو چکا ہے، ورنہ صورت حال اتنی واضح ہے کہ محدثین نے روایتوں کے بیان کا جو بے لچک اصول مقرر کر رکھا ہے اور جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں اور جن صفات سے متصف ہونا راوی کے لئے لازمی قرار دیا ہے ان حالات میں تا حد امکان بشری جھوٹ اور غلط بیانی کے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں، اس کے باوجود کوئی ان کو سچا نہیں مانتا تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ خود جھوٹا ہے اور اس کے دل میں کھوٹ ہے۔

مستشرقین کا سب سے بڑا اعتراض

احادیث کو نا قابل اعتماد ثابت کرنے کے لئے انھوں نے سب سے زیادہ زور اس بات کو ثابت کرنے پر لگایا ہے کہ رسول نے حدیث کو لکھنے سے خود منع فرمایا ہے اور یہ حکم تاکیدی تھا، اس لئے صحابہ نے حدیث لکھنا چھوڑ دیا اور جس نے پہلے سے لکھ رکھا تھا اس نے بھی اس کو مٹا دیا یہی وجہ ہے کہ اس دور کا کوئی مجموعۂ حدیث دریافت نہیں ہوا۔

دوسرے یہ کہ عربوں میں یوں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج برائے نام تھا، لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے چند افراد تھے جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اس لئے بھی حدیث کے مجموعے تیار نہیں ہوئے اور رسول کی طرف سے ممانعت اور حوصلہ شکنی کی وجہ سے احادیث کی حفاظت کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں کی گئی اور شاید اس کی کوئی مذہبی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر رسول بھی لوگوں کو لکھنے پر آمادہ کرتے اور صحابہ خود بھی سنی ہوئی حدیثوں کو قلمبند کر لیتے، جیسا کہ پابندی کے ساتھ قرآن کریم لکھنے کا اہتمام تھا، اور نزول وحی کے بعد فوراً کسی کاتب کو بلوا کر لکھ لیا جاتا تھا، چونکہ حدیثوں کا دین سے کوئی تعلق اس طرح کا نہیں تھا جو قرآن سے تھا اس لئے

اس کی حفاظت کا بندوبست نہیں کیا گیا۔

حقیقت کیا ہے؟

ہم اس پہلو پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ مستشرقین کے اسی فریب اور پروپگنڈے نے مسلمانوں کے ایک طبقہ کو گمراہ کیا اور وہ بھی مستشرقین کی آواز میں آواز ملا کر بولنے لگے اور پورا ایک گمراہ فرقہ ملت اسلامیہ میں پیدا ہو گیا اور مستشرقین کا یہی مقصد بھی تھا۔

انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر احادیث کو ناقابل اعتبار ثابت کر دیا جاتا ہے تو مسلمانوں کا دین ایک معمہ بن جائے گا، ان کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، ان کی شکل وصورت بگڑ جائے گی، اسلامی معاشرہ اور عائلی زندگی جو اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا، کیوں کہ ان تمام احکام کا قرآن میں بیان مجمل ہے، احادیث ان کے صحیح خدوخال کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور جب حدیثیں ناقابل اعتبار ہو جائیں گی تو نہ نماز کی کوئی متعینہ شکل رہ جائے گی اور نہ زکوٰۃ کا مستحکم مالی نظام، نہ روزہ نہ حج وعمرہ کے اصول وقواعد باقی رہ جائیں گے، وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ان بدبخت وبدنصیب مسلمانوں کی عقل پر ماتم کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں جنھوں نے چند یہودیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنا دین اور اپنی دنیا دونوں تباہ کر لی، ان کو سب سے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے تھی کہ آخر یہ مستشرقین جو کچھ کہتے ہیں اس میں سچائی ہے یا نہیں، حقیقت کیا ہے؟ اپنے گھر کا جائزہ لینا چاہئے تھا، مگر انھوں نے کہہ دیا کہ ایک صدی تک احادیث نہیں لکھی گئیں اور ان کو آنکھ بند کر کے مان لیا، اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا، احادیث پر غائرانہ نظر ڈالی ہوتی، مسلم محققین نے تدوین حدیث کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی کہ مستشرقین کا یہ دوسرا سب سے بڑا جھوٹ اور سب

سے بڑا فریب ہے جو احادیث کی عظمت واہمیت کو کم کرنے کے لئے علمی دنیا کو دیا گیا ہے، پوری اسلامی تاریخ اس جھوٹ اس فریب کے خلاف اور اس کی پھیلائی ہوئی غلط بیانی کی تکذیب کرنے اور اس کے خلاف شہادت دینے کے لئے موجود ہے، بشرطیکہ آنکھوں میں روشنی ہو اور سینوں میں دل ہو جس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔

مطلع عرب پر علم کا سورج طلوع ہو گیا

عرب میں لکھنے کا رواج ایّام جاہلیت میں یقیناً کم تھا کیوں کہ ان کی زندگی میں اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی تھی، لیکن جب عرب کی افق پر اسلام کا سورج طلوع ہوا تو عربوں کی زندگی جو جہالت کی تاریکیوں میں گم تھی یک بیک نئے سورج کی روشنی میں نہا گئی، عربوں کی زندگی میں جو ہمہ جہتی انقلاب آیا، اسلام نے ان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے اثرات ڈالے، انھیں اثرات میں یہ لکھنے پڑھنے کا رواج بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں لکھنے پڑھنے والوں کی جو کمی تھی ہجرت کے بعد مدنی زندگی کا آغاز ہوتے ہی اس میں انقلاب عظیم برپا ہو گیا کیوں کہ سب سے پہلی وحی نے عَلَّمَ بِالْقَلَمْ کی طرف اُن کی توجہ کو منعطف کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں لکھنے پڑھنے کے رواج کو آگے بڑھایا، کیوں کہ اب شب وروز معاہدوں کی نوبت آرہی ہے اور دستاویزوں کے لکھنے کی ضرورت پیش آرہی ہے، حکم ناموں اور احکام وقوانین کے نفاذ کے لئے ہدایت ناموں کا لکھنا ضروری ہو گیا تھا، اس لئے لکھنے پڑھنے کی سمت پوری سرگرمی سے قدم بڑھایا گیا، ان عہد ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو مسلمانوں اور یہودیوں عیسائیوں اور مشرکین عرب اور قبائل عرب کے سرداروں کے درمیان ہوئے اور پھر مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان تحریروں کا تبادلہ ہونے لگا، دعوتی خطوط جاری کئے گئے جواب تک کی دریافت کے مطابق کچھ کم وبیش ان کی تعداد ڈھائی سو تک پہنچ جاتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) نے لکھا ہے، پھر مسلمانوں کی کتاب قرآن کا نزول مجبور کر رہا تھا کہ جلد از جلد

ہر مسلمان لکھنا پڑھنا سیکھ لے، کیوں کہ کتابت وحی کی ضرورت تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کاتبانِ وحی کی مجموعی تعداد بعض اسلامی مؤرخین کی تصریح کے مطابق ۴۲ ہو جاتی ہے، کچھ مؤرخین ۲۶ ناموں کو دریافت کر سکے، میں نے اپنے طور پر جستجو کی تو مجھے ۱۹ ناموں کی فہرست ملی جن کی کتابت وحی کی صراحت موجود ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے بڑی تیزی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کی طرف قدم بڑھائے اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ بھی ہے جب جنگ بدر میں ستر ۷۰ مشرکین گرفتار ہوئے تو ان کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور تاوانِ جنگ لے کر چھوڑ بھی دیا گیا لیکن ان میں متعدد افراد ایسے تھے جو زرِ فدیہ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کو حکم دیا گیا کہ ان میں جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں وہ مسلمانوں کو ایک مقررہ مدت تک لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو ان کو رہا کر دیا جائے گا، چنانچہ اس پر عمل[1] ہوا، یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے۔

مدینہ پہنچ کر یہودیوں کی مختلف آبادیوں سے متعدد معاہدے ہوئے اور دستاویزیں لکھی گئیں، یہودیوں کی کاروباری زبان سریانی تھی اس لئے اظہار خیال کے لئے تحریروں میں وہ یہی زبان استعمال کرتے تھے، عربی قصداً نہیں لکھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت سے فرمایا کہ سُریانی زبان سیکھ لو مجھے یہودیوں پر اعتماد نہیں ہے تاکہ ان سے خط و کتابت میں آسانی ہو، چنانچہ انھوں نے پندرہ دنوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی کہ سُریانی تحریروں کو پورے اعتماد سے پڑھ کر سمجھ لیتے اور سُریانی زبان میں اس کا جواب بھی لکھ دیتے تھے[2]۔ مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی لکھنے پڑھنے کا رواج ہو چلا تھا یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمانوں میں علمی ذوق وشوق اب بہت بڑھ چکا تھا، کیوں کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں تعلیم کے معاملہ میں سب سے آخر میں عورتوں کا نمبر آتا ہے اور آج بھی نوے فی صد عورتیں اَن

---

[1] مسند احمد بن حنبل مطبوعہ دار صادر بیروت، ج۱،ص ۲۴۷

[2] مشکوٰۃ، ص ۳۹۹، طبقات ابن سعد، ج۱،ص ۱۱۵، ترمذی، ج۲،ص ۹۶۔

پڑھ ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس اُمّی قوم نے جب تعلیم کی طرف توجہ کی تو ان کی سرگرمیوں میں عورتیں بھی شریک ہوگئیں جیسا کہ ایک روایت میں شفاء بنت عبداللہ سے اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کتابت سیکھنے کی صراحت موجود ہے۔ (ابوداؤد، ج ۲، ص ۵۴۲) بحرین، عمان اور یمن کے عاملوں کو صدقات وزکوٰۃ وغیرہ کے قوانین واصول لکھ کر دیئے جاتے تھے اور دوسرے حکم نامے اور ہدایت نامے جاری[۱] ہوتے رہتے تھے، حضرت علیؓ کی نیام میں بھی اس طرح کی کچھ دستاویزی تحریریں رہتی تھیں[۲]۔

کتابت سے کیوں اور کس کو منع کیا گیا؟

اب پورے مدینہ میں تعلیم وتعلّم پورے شباب پر آچکا تھا اب نہ کاتبوں کا فقدان تھا اور نہ تحریر کے وقت کاتب کی تلاش کے لئے تگ ودو کرنے کی ضرورت تھی کیوں کہ لکھنے کا فن عام ہو چکا تھا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حدیث کی کوئی دینی اہمیت تھی تو لوگوں نے کیوں نہیں لکھا؟ بلکہ اُلٹے ان کو منع کیا گیا، مستشرقین نے اس بحث میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے لیکن فن حدیث سے نابلد ہونے کی وجہ سے حکم ممانعت کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے یا تجاہل عارفانہ کر گئے، یقیناً ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ جس نے قرآن کے سوا لکھا ہو اس کو مٹا دے[۳] لیکن اسی کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت بھی ملا لیجئے تو ممانعت کی نوعیت معلوم ہو جائے گی، جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ میں حضورؐ کے سامنے حدیثوں کو لکھ لیا کرتا تھا تو کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہر بات لکھنے کی نہیں ہوتی، حضور کبھی برہمی کی حالت میں ہوتے ہیں اور کبھی غضب کے حال میں، تو میں نے حضورؐ سے لوگوں کی اس بات کو کہا تو آپؐ نے اپنے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ یاد رکھو ہر حال

[۱، ۲] مشکوٰۃ ص: ۳۰۰، کتاب القصاص وابوداؤد، ج: ۱، ص: ۲۱۸، باب فی زکوٰۃ السائمۃ ص: ۲۱۹۔

[۳] ابوداؤد، ج ۱، ص ۵۱۳، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔

میں اس سے حق بات ہی نکلتی ہے ناحق بات کسی حالت میں میری زبان سے نہیں نکل سکتی[1]۔ ایک طرف غیر قرآن لکھنے کی ممانعت اور جو لکھا جا چکا اس کو مٹا دینے کا حکم اور دوسری طرف حضورؐ کے سامنے حدیثوں کو لکھنے کا اعتراف اور حضور کی جانب سے اس کی تائید اور حوصلہ افزائی، بظاہر تم کو اس میں تضاد نظر آتا ہے لیکن جو لوگ فن حدیث کے رمز شناس اور مزاج داں ہیں وہ ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں پاتے ہیں کیوں کہ ایسے تمام مواقع پر جمع تطبیق کے اصول سے کام لیا جاتا ہے اور اسی اصول کی روشنی میں حدیث کا مصداق و محمل پورے اعتماد کے ساتھ متعین ہوتا ہے دونوں حکم اپنی جگہ باقی ہے، اور دونوں پر عمل ہوا، غیر قرآن لکھنے کی ممانعت ان لوگوں کے لئے ہے کہ جو لوگ قرآن لکھتے ہیں وہ قرآن کے ساتھ کوئی دوسری بات ہرگز نہ لکھیں چاہے وہ قرآن کی تفسیر و تشریح یا کسی لفظ کی وضاحت سے متعلق ہو یا کوئی اور وظیفہ یا دعا، کیوں کہ جو لوگ آئندہ کلامِ الٰہی کے مزاج داں نہیں ہوں گے وہ غیر قرآن کو قرآن میں مدغم کر دیں گے، کلامِ الٰہی میں تحریف ہو جائے گی، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے لئے جو مصحف لکھوا رہی تھیں تو کاتب سے فرمایا کہ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالْوُسْطٰى جب لکھو تو لفظ ''الصلوٰۃ الوسطیٰ'' کے بعد لفظ ''صلوۃ العصر'' لکھنا[2] ظاہر ہے کہ صلوٰۃ العصر کا لفظ قرآن میں نہیں ہے اگر یہ باقی رہ جاتا تو لوگ اس کو قرآن کا ایک لفظ سمجھ لیتے، اسی طرح ابی بن کعب نے اپنے ذاتی مصحف پر یاد کرنے کے لئے دعاء قنوت لکھ رکھی تھی، ایک مستشرق کو یہ روایت مل گئی تو اس نے دعویٰ کر دیا کہ قرآن میں دو سورتیں نہیں لکھی گئیں جب کہ ابی بن کعب کے مصحف میں درج تھیں؟ یہ غلط فہمی صرف اس لئے ہوئی کہ جس کاغذ پر قرآن لکھا تھا اسی کاغذ پر ایک سمت یہ دعا بھی لکھ رکھی تھی، اگر قرآن کو غیر قرآن سے اتنی تاکید کے ساتھ الگ نہ رکھا جاتا تو مستقبل میں سخت اختلافات پیدا ہو جاتے، بعض قرأۃ شاذہ ہیں ایک دو لفظوں کا وجود اسی صورت

---

[1] ابوداؤد، ج:۱،ص:۵۱۳، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔

[2] ابوداؤد، مطبوعہ رشیدیہ دہلی، ج۱، باب الصلوٰۃ الوسطیٰ، ص۵۹۔

حال کا نتیجہ ہے اسی لئے جمہور امت میں قرأۃ شاذہ کا اعتبار نہیں کیا گیا[۱] کتابت کی ممانعت انھیں خاص حضرات اور خاص حالات میں تھی اور اجازت جو دی گئی وہ عام لوگوں کے لئے تھی یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام میں کچھ حضرات حدیثیں لکھ لیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لکھنے کا بھی علم تھا اور کبھی ان کو منع نہیں فرمایا بلکہ بعض صحابہ سے آپ نے خود فرمایا کہ لکھ لیا کرو، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک انصاری کا ذکر ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کی کہ مجھے حدیثیں یاد نہیں رہتی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ لکھ لیا کرو[۲] بہت سے حکم نامے اور صدقات وزکوٰۃ کے قوانین ان کو باقاعدہ لکھ کر دیئے جاتے تھے اور جن عاملوں کو یہ کتاب الصّدقات دی جاتی تھیں وہ ان کو محفوظ رکھتے تھے اور اسی کے مطابق زکوٰۃ کی وصولی کرتے تھے[۳] اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو بلا استثناء حدیثوں کو لکھنے سے روک دیا تھا، یہ علمی دنیا کو دھوکا اور فریب دینا ہے، سچائی کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لوگ اپنی یادداشتوں میں حدیثیں لکھتے رہتے تھے، بہت سے صحابہ کرام کے پاس بہت سی حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں، تاریخوں میں تلاش وجستجو کے بعد ان کے تذکرے ملتے ہیں، مزید تلاش وجستجو جاری رکھی جائے تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے، چند صحیفوں کی نشاندہی اجمالی طور پر آپ کے اطمینان کے لئے کی جاتی ہے۔

عہد صحابہ کے مجموعہائے حدیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مجموعہ حدیث **الصحیفة الصّادقه** (بخاری، ج ۲، ص ۲۲، کتاب العلم، باب کتابت العلم) صحیفہ[۴] علی ابن ابی طالب

---

۱ روح المعانی علامہ محمود آلوسی مطبوعہ مصطفائیہ دیوبند۔ ۲ ترمذی، ج ۲، ص ۱۰۶۔

۳ ابوداؤد، ج ۱، ص ۱۹-۲۱۸، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ السائمۃ۔

۴ ابوداؤد، ج ۱، ص ۲۷۸۔

رضی اللہ عنہ کتاب الصدقہ[1] جس میں زکوٰۃ، صدقات اور عشر وغیرہ کی حدیثیں تھیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ان کے پاس موجود تھی جیسا کہ متعدد روایتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے، خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے متعدد صحیفے[2]، صحیفۂ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ[3]، صحیفۂ عبداللہ بن عباس[4]، صحیفۂ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ[5]، صحیفۂ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ[6]، صحیفۂ سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ[7]، صحیفۂ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ[8]، اور ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ[9] کے صحیفوں کا ذکر روایتوں اور تاریخوں میں ملتا ہے۔

ان میں سے بعض مجموعے ضخیم ترین تھے، اس کا اندازہ ابوہریرہ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثوں کا سننے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں صرف عبداللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنیٰ ہیں کیوں کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیتے تھے اور میں اس وقت نہیں لکھتا[10] تھا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی روایتیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے زیادہ تھیں، اس کی روشنی میں جب ہم حدیثوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو حضرت ابوہریرہ کی پانچ ہزار تین سو چونسٹھ روایتیں ملتی ہیں، یا اس سے کچھ کم وبیش، اس لئے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جب آخر عمر میں حدیثوں کو لکھا تاکہ ضائع نہ ہو جائیں تو ان کے پاس جو مخطوطہ رہا ہوگا، اس میں یقینی طور پر پانچ ہزار سے زیادہ حدیثیں رہی ہوں گی، اس کی تائید اس اندراج سے بھی ہوتی ہے جو فتح الباری میں ہے کہ عمرو بن امیّہ ضمری نے بیان کیا کہ ابوہریرہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے گئے تو انھوں نے مجھے بہت سے کتابیں دکھائیں اس کے الفاظ ہیں **فارانا کتباً کثیرۃ من حدیث رسول اللّٰہ صلی**

---

[1] ابوداؤد، ج ا، ص ۲۱۹، ۲۱۸۔
[2] المستدرک للحاکم، ج ۳، ص ۵۷۳۔
[3] الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۳۷۔
[4] تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۴۳۳۔
[5] جامع بیان العلم وفضلہ علامہ ابن عبدالبر۔
[6] التاریخ الکبیر (بخاری)، ج ۷، ص ۱۷۶۔
[7] تہذیب التہذیب، ج ۴، ص ۲۳۶۔
[8] کتاب الثقات، ص ۳۹۶، بحوالہ دراسات حدیث نبوی، ج ا، ص ۱۱۰۔
[9] فتح الباری، ج ا، ص ۲۱۵، مطبوعہ سلفیہ۔
[10] بخاری، ج ۲، باب کتاب العلم۔

اللہ علیہ وسلم[1]۔ اس لئے ابو ہریرہ کے پاس جو مخطوطہ تھا اس میں پانچ ہزار حدیثیں لکھی ہوئی تھیں تو بقول ابو ہریرہؓ عبداللہ ابن عمرو کی حدیثیں ان سے زیادہ تھیں تو ان کے صحیفے الصحیفۃ الصادقہ میں پانچ ہزار سے زیادہ ہی حدیثیں لکھی رہی ہوں گی اگر دونوں کو برابر بھی نیچے اتر کر مان لیا جائے تو کم از کم دس ہزار حدیثیں ضرور لکھی ہوئی دونوں حضرات کے پاس موجود تھیں اور عبداللہ بن عباسؓ کے مخطوطوں میں لکھی ہوئی حدیثوں کی تعداد کو اس میں شامل کر لیا جائے جس کے متعلق ان کے غلام کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کے صحیفے ایک اونٹ کا پورا بوجھ[2] تھا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف تین صحابہ کے پاس کتنی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں میں نے آپ کے سامنے گیارہ صحیفوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سے صرف تین صحیفوں میں لکھی ہوئی حدیثوں کی تعداد مستشرقین کی اڑائی ہوئی افواہ کی قلعی کھول دینے کے لئے کافی ہیں ابھی آٹھ صحیفوں کی لکھی ہوئی حدیثوں کا میں نے کوئی ذکر نہیں کیا اور ان کے علاوہ ۴۲ صحابہ کے پاس جو لکھی ہوئی حدیثیں تھیں ان کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے انھیں تین مخطوطوں سے اندازہ کر لیجئے۔

قیاس کُن زگلستاں من بہار مرا،

صحابہ کا مقام و مرتبہ

اس بحث میں اگر مستشرقین نے صحابہ کرام کے مقام و مرتبہ کو پیشِ نظر رکھ لیا ہوتا تو وہ بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتے تھے۔ ان کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مسلمانوں کے نزدیک اصحاب رسول کا کیا مقام اور درجہ ہے؟ کیوں کہ یہ ایک نبیادی بات ہے، پوری امت مسلمہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ **الصحابۃ کلھم عدول** ہر ہر صحابیٔ رسول سراپا صداقت اور مجسم راست بازی اور دین و دیانت

---

[1] فتح الباری، ج ۱، ص ۱۴۸۔

[2] تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۴۳۳۔

کا پیکر ہے اس لئے رسول کے بارے میں جو واقعہ یا بات وہ نقل کرتے ہیں اس میں کسی کے نزدیک شک وشبہ کا احتمال نہیں رہتا ہے کیوں کہ ان کو اپنے رسول کا تہدیدی فرمان یاد ہے **من كذب عليّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار**. جو میری جانب کسی غلط بات کو منسوب کرے گا اس کو اپنا ٹھکانہ جہنّم بنالینا چاہئے۔اس صورت حال میں کسی صحابی کی زبان سے رسول اللہؐ سے متعلق کوئی غلط بات نکل ہی نہیں سکتی، پھر رسول کی عظمت ومحبت جو ان کے دلوں میں پیوست تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے حالات پڑھو تو حیرت واستعجاب میں ڈوب جانا پڑتا ہے، اس لئے اپنے رسول کی ہر بات، ہر کام، اور ہر واقعہ ان کے دلوں پر نقش ہے جب کوئی شخص ان سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ دریافت کرتا ہے تو اُن کو رسول اللہؐ کا کوئی نہ کوئی واقعہ یاد آجاتا ہے اور وہ توضیح مسئلہ کے سلسلہ میں اس کو بیان کردیتے ہیں اسی کا نام حدیث ہے۔
حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی ذات کو جو مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اس نے پہلی ہی صدی میں جہاں دور دراز علاقوں تک حدیثوں کو پہنچا دیا وہیں یہ بھی ہوا کہ تمام صحابہ کی حدیثوں کو اُن سے ملاقات کے لئے آنے والے تابعین نے ان کی زندگی ہی میں سپردِ قرطاس کردیا اور حدیثوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا، میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہے جاتے ہیں، دس سال کی عمر میں آپؐ کی خدمت کے لئے پیش کئے گئے پھر کسی وقت بھی آپ سے جدا نہیں ہوئے، پورے دس سال سفر وحضر میں ساتھ رہے، اندر باہر کا کام کرتے، گھر کی زندگی سے لے کر باہر کی زندگی تک کے واقعات ان کی نگاہوں کے سامنے آئے، حضورؐ کی وفات کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی، حضورؐ کی وفات کے بعد بصرہ چلے آئے اور یہیں ۹۳ھ میں ۱۰۳ سال کی عمر میں وفات[1] پائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً ۸۳ سال زندہ رہے ان کی

[1] شذرات الذہب ابن العماد حنبلی، ج ۱، ص ۱۰۰ و ۱۰۱۔

ذات مرجع خلائق بن گئی اور ہزاروں افراد ایک صحابی رسول ہونے کی حیثیت سے ان کی زیارت کے لئے آتے رہے کیوں کہ ان کی وفات کے وقت روئے زمین پر صرف تین صحابہ اور موجود تھے اس لئے پوری دنیائے اسلام سے آپ سے ملنے کے لئے لوگ آتے رہے یہ بالکل ظاہر ہے کہ زیارت کرنے والوں کے سامنے سوائے ذکر رسولؐ کے اور کیا رہتا ہوگا، معلوم نہیں کتنے زائرین اور ملاقاتیوں کے سامنے انھوں نے حضور کے اقوال وافعال اور واقعات کو نقل کیا ہوگا، کسی بات کے بھولنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں کیوں کہ ساری باتیں آپ کے ذاتی تجربات ومشاہدات سے تعلق رکھتی تھیں اور ہر انسان اپنے تجربات اور مشاہدات کو تا زندگی یاد رکھتا ہے اس کے باوجود مسند انس بن مالکؓ میں ہمارے شمار کے مطابق ان کی صرف دو ہزار ایک سو اڑتیس روایتیں ہیں جن کو ان کے دو سو ایک شاگردوں نے ان سے سنا[1] اور ان کو نقل کیا ہے اور یہ وہ شاگرد ہیں جنھوں نے اپنے شاگردوں سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے اس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ صحابی کے حافظہ میں وہ روایتیں تو ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئیں مگر تابعین کو ان روایتوں کو ایک بار سن لینے کے بعد یاد رکھنا ممکن نہ تھا اس لئے یقیناً ان تمام شاگردوں نے ان کی تمام حدیثوں کو ضرور لکھا ہوگا تبھی بعد کی نسلوں کے سامنے انھوں نے بیان کیا اس طرح صرف حضرت انس کے حدیثوں کے ۲۰۱ مخطوطے تیار ہوگئے ہوں گے اور پوری دنیا میں پھیل گئے ہوں گے۔ خود حضرت انس اپنے بیٹوں اور پوتوں کو حدیثوں کے لکھنے کی تاکید کرتے رہتے تھے اور خود دوسرے تلامذہ کو بٹھا کر حدیثوں کا املا بھی کراتے تھے جیسا کہ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ حسان الانباری کا بیان ہے کہ ہم واسط حجاج کے پاس اس کے ایک عامل کی شکایت لے کر گئے ہمارے ساتھ ایک وفد تھا جب ہم حجاج کے دیوان میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک بزرگ درمیان میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بہت سے لوگ حدیثیں لکھ رہے ہیں ہم نے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ خادم رسولؐ حضرت انس بن مالکؓ ہیں میں نے ایک حدیث کی

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۹۸ تا ۲۹۲۔

درخواست کی تو آپ نے فرمایا: **سمعتُ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم یقول مر بالمعروف وانہ عن المُنکر ما استطعت**[۱].

۱ تاریخ بغدادی، ج ۸، ص ۲۵۹، مطبوعہ دار الفکر۔

غرضیکہ عہد رسالت سے لے کر پہلی صدی کے اخیر تک جب تک ایک صحابی بھی دنیا میں رہے حدیثوں کے بیان کرنے اور ان کے لکھنے کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا اس میں کبھی انقطاع نہیں پایا جاتا، رسول اللہؐ کی مجلس مبارک میں بیٹھ کر بھی لوگ احادیث لکھتے تھے یا آپ سے سن کر جب گھر جاتے تو گھر پر اس کو قلم بند کر کے رکھ لیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کا یہی معمول تھا، خود ان کا اپنا بیان ہے **فاما الصادقة فصحيفة كبتتُها من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم**[۲] یہ صحیفہ کتنا ضخیم تھا خود انھیں کا بیان ہے کہ میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے صرف امثال ایک ہزار یاد کئے ہیں[۳]۔ یہ صحیفہ ناپید نہیں ہوگیا آپ کا یہ مخطوطہ آپ کے پوتے شعیب کے پاس رہا اس سے روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں[۴]، عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے **نحن حول رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم نكتب**[۵] معلوم ہوا کہ بیک وقت کئی صحابہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے عبداللہ بن عمرو کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے کئی صحابہ سے کہا کہ حضورؐ کا ارشاد ہے: **من كذب عليّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار** تو ان لوگوں نے کہا بھتیجے ہم حدیثیں لکھ لیتے ہیں[۶]۔ حضورؐ نے ایک نوشتہ حضرت عمرو بن حزم کے ذریعہ یمن بھیجا تھا اس میں فرائض، سنن اور خون بہا کے مسائل تھے[۷] حضورؐ نے ایک اور نوشتہ لکھوا کر اہلِ یمن کے پاس بھیجا تھا، امام شعبیؒ نے اس نوشتہ کی حدیثوں کو بیان کیا ہے (مصنف ابن ابی شیبہ، زکوٰۃ، ص ۱۰ تا ۱۲) مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیثیں سن کر صاحبزادے ابو بردہ

۱ تاریخ بغدادی، ج ۸، ص ۲۵۹، مطبوعہ دار الفکر۔ ۲ دارمی، ص ۶۸۔
۳ عمدۃ القاری عینی، ج ۱، ص ۱۸۔ ۴ تہذیب التہذیب، ج ۸، ص ۵۴، ترجمہ عمرو بن شعیب۔
۵ سنن دارمی، ص ۶۸۔ ۶ طحاوی شریف، ج ۲، ص ۴۱۷۔
۷ المستدرک للحاکم نیساپوری، ج ۱، ص ۲۹۵ تا ۳۹۷ حاکم نے اس نوشتہ کی ۶۳ حدیثیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔

لکھتے لیتے تھے جب بہت سی حدیثیں لکھ چکے تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ان سے فرمایا کہ تم اپنا پورا مجموعہ لے آؤ اور سناؤ انھوں نے لاکر ساری حدیثوں کو سنایا تو اس کے جواب میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہاں میں نے ایسی ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے[1]۔

حاصلِ گفتگو

صحابہ کرام کو حدیثیں لکھنے کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ یہ تو ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات تھے اور تجربات اور مشاہدات کبھی نہیں بھولتے ہیں۔ گفتگو، احکام، مسائل اور واقعات کا موقعہ و محل سب باتیں ان کے صفحۂ ذہن پر مرتسم تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ضرورت کے وقت ضرور لکھتے تھے اس کا تاریخ کے پاس نا قابل انکار ثبوت ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ یہ حقیقت تو اور بھی نا قابل انکار ہے کہ صحابہ کرام کے حافظہ میں جتنی حدیثیں تھیں اگر ان میں کچھ حضرات نے نہیں لکھیں تو انھوں نے دوسروں کو املا کروادیا یا دوسروں نے صحابہ کی زبان سے سن کر از خود لکھ لیا۔ یہ لکھنے والے سب کے سب تابعین کرام کا گروہ ہے کیوں کہ صحابہ کو تو نہیں البتہ تابعین کو یاد کرنے کی ضرورت تھی اس لئے صحابہ کرام سے ملنے والے جب کوئی حدیث سنتے تو لکھ لیتے تھے۔ اس طرح صحابہ کی زندگی میں ان کی حدیثوں کے بلا مبالغہ ہزاروں احادیث کے مخطوطے تیار ہو گئے اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تابعین ان کو اپنے اپنے وطن لے گئے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر **قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم** کا نغمۂ جانفزا چھیڑ دیا اس طرح ؎ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری، والی شاعرانہ بات حقیقت بن گئی۔

صحابہ کرام کے مخطوطے تاریخ کے حوالے سے

اب ہم آپ کے سامنے بالترتیب ان تمام مخطوطات کی فہرست تاریخ کے

---

[1] مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۱۵۱۔

حوالے سے پیش کرتے ہیں جو صحابہ کرام نے اپنے ہاتھ سے لکھ رکھے تھے یا املا کرایا تھا یا اپنی حدیثوں کو کسی کی مدد سے لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ ہر مخطوط کی شہادت اور ناقابل انکار گواہی کے لئے تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں اگر چشمِ بینا اور گوشِ شنوا تم رکھتے ہو تو وہ شہادتیں تم آج بھی دیکھ سکتے ہو اور سن سکتے ہو[1]۔

اس گفتگو کا آغاز حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا جاتا ہے ان کے بارے میں وہ روایت تو غلط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انھوں نے جو حدیثیں لکھی تھیں بعد میں اس کو جلا دیا[2]۔ البتہ آپ نے اپنے دور خلافت میں حضرت انس بن مالکؓ کو جب بحرین کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان کو احادیث نبوی کا ایک نوشتہ دیا تھا جس میں صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہ کے مسائل تھے اس کا سرنامہ تھا **هذه فريضة الصدقة التي فرض رسول[3] الله على المسلمين** اور اس پر حضورؐ کی مہر ثبت[4] تھی، حضورؐ نے خود ایک کتاب ''الصدقۃ'' لکھوائی تھی شاید یہ وہی نوشتہ ہو[5]۔

ابوبکر ثقفی رضی اللہ عنہ متوفی ۵۱ھ نے اپنے صاحبزادے کو جو بحستان میں قاضی تھے، قضا سے متعلق بہت سے حدیثیں لکھ کر ارسال کی تھیں تا کہ ان کی روشنی میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں[6]۔

ابوشاہ یمنی صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ خطبہ لکھ کر

۱۔ مقالہ کے اس حصہ میں ہم نے مشہور عالم دین اپنے ہم وطن علمی دوست اور حدیثوں کو کمپیوٹرائز کرنے کی وجہ سے عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی مقیم ریاض کے اس مقالہ سے کلی طور پر استفادہ کیا ہے جو انھوں نے انگریزی زبان میں تدوین حدیث کے موضوع پر لکھا تھا جس کی بنیاد پر کیمبرج یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر اف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے اور اس مقالہ پر آپ کو فیصل ایوارڈ دیا گیا ہے پھر اس کا ترجمہ خود ہی عربی میں **دراسات في الحديث النبوي** کے نام سے ۲ جلدوں میں کیا۔ یہی عربی ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے ہم چاہتے ہیں کہ مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی افادیت کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے اسی جذبے سے ہم نے اس کے مختصر سے حصہ کو اردو میں منتقل کیا ہے، البتہ حوالجات میں ہم نے اپنی لائبریری میں موجود کتابوں ہی کو رکھا ہے دوسرے حوالے اصل کتاب میں دیکھے جائیں۔

۲۔ تذکرۃ الحفاظ، ج ۱، ص ۵۔ ۳۔ صحیح البخاری، ج ۱، ص ۱۹۴، ۱۹۵۔

۴۔ ابوداؤد، ج ۱، ص ۸ و ۹، مطبوعہ رشیدیہ دہلی۔ ۵۔ ترمذی شریف، ج: ۱، ص ۷۹، ابوداؤد، ج: ۱، ص ۱۵۶۔

۶۔ مسند احمد بن حنبل، مطبوعہ دار صادر بیروت، ج ۵، ص ۳۶۔

دیا گیا جو حضورؐ نے فتح مکہ کے موقعہ پر دیا تھا، جس کی ابو شاہ یمنی نے حضورؐ سے درخواست کی تھی[۱]۔

ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے جن کی وفات ۴۰ھ سے کچھ پہلے ہوئی ان کے بارے میں ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرت ابو رافع نے مجھے ایک مخطوطہ دیا تھا جس میں نماز سے متعلق حدیثیں ہیں[۲]۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھی ابو رافع کا ایک مخطوطہ تھا جس سے وہ اپنے لئے نقل کر رہے تھے[۳]۔

ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۴ھ جن کی روایت میں کتابت حدیث کی ممانعت ہے لیکن انھوں نے ایک سائل کو جو عبداللہ ابن عباسؓ سے مسئلہ پوچھ کر آیا تھا جواب دیا کہ میں عبداللہ کو احادیث رسول لکھ کر بھیج دوں گا تاکہ مسئلہ کی صحیح صورت حال کو سمجھ کر جواب دیں[۴]۔

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۲ھ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ کتابت حدیث سے منع کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب عبداللہ ابن عباسؓ ان کے پاس بصرہ آئے تو انھوں نے خود حدیثیں لکھ کر ان کو دیں[۵]۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۹ھ کے متعلق تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ انھوں نے اپنی روایتوں کی تعداد کو عبداللہ بن عمرو کی روایتوں کی تعداد سے کم ہونے کی وجہ بتائی تھی کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا، اس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے کبھی نہیں لکھا، حالاں کہ یہ بے بنیاد بات ہے وہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ حضورؐ کی مجلس ہی میں یا گھر جاتے ہی لکھ لیتے تھے اور میرا یہ

---

۱ مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۲۳۸

۲ الکفایہ خطیب بغدادی، ص ۳۳۰، ۳۳۱۔

۳ طبقات سعد، ج ۲، ص ۳۷۱۔

۴ مسند احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۶۰۔

۵ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۳۹۶۔

معمول نہیں تھا، مجھے اپنے حافظہ پر اعتماد تھا اس لئے میں نہیں لکھتا تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے اپنی حدیثوں کو لکھ لیا تھا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائیں، اور میرے ساتھ قبر میں نہ چلی جائیں، یہ صرف قیاس آرائی نہیں بلکہ حسن بن عمرو بن اُمیّہ الضمری کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو ان کی بیان کی ہوئی ایک حدیث سنائی تو ان کو تھوڑی دیر کے لئے تردد ہوا اور کہا کہ اگر میں نے تمہیں یہ حدیث سنائی ہو تو میرے مخطوطہ میں ضرور ہوگی اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر اندرون خانہ لے گئے تو مخطوطات کا ایک انبار نظر آیا اور ان میں تلاش کر کے جب حدیث مل گئی تو ابو ہریرہؓ نے کہا کہ میں کہہ رہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہوگا تو میرے یہاں ضرور لکھی ہوئی ہوگی دیکھو وہ حدیث مل گئی۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس پانچ ہزار سے زائد حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں[1]۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے ان مخطوطات سے لوگ نقل لے کر روایت کی بھی اجازت لیتے تھے بشیر بن نہیک نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے ان کی کتاب سے نقل کر کے ان سے روایت کی اجازت مانگی تو انھوں نے مجھے اجازت دی[2]۔ بشیر بن نہیک کے علاوہ دس حضرات کے بارے میں تاریخ ہمیں شہادت دیتی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کے مخطوطات سے حدیثیں لکھی ہیں[3]۔

ابی ابن کعب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۹ھ یا ۲۲ھ مشہور کاتب وحی، چوں کہ ان کو تفسیر قرآن سے زیادہ وابستگی تھی اس لئے ان کے پاس تفسیری روایات لکھی ہوئی موجود تھیں، ان کے نسخہ سے ابوالعالیہ رفیع بن مہران نے بڑی تعداد میں تفسیری احادیث قلم بند کی ہیں[4]۔

---

[1] فتح الباری، ج ۱، ص ۲۱۵، مطبوعہ سلفیہ، المستدرک للحاکم، ج ۳، ص ۵۱۱، جامع بیان العلم، ج ۱، ص ۷۴ وغیرہ۔

[2] دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۹۷۔

[3] تفصیل کے لئے دیکھئے الکفایہ، ص ۲۷۵، تہذیب التہذیب، ج ۹، ص ۳۴۲، طبقات ابن سعد، ج ۷، ص ۱۵۷، مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۵۳۱، میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۸۵، سیر اعلام النبلاء، ج ...... ص ۴۳۱، دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۹۹۔

[4] **التفسیر المفسرون** (ذہبی) ج ۱، ص ۵۱۱۔

اسماء بن عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا صحابیہ ہیں جو حضرت جعفر ابن ابی طالب کی بیوی تھیں، حضرت جعفر کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نکاح میں آئیں، پھر ان کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا تھا، ان کی وفات ۴۰ھ کے قریب ہوئی، ان کے پاس صحیفہ تھا جس میں احادیث رسول لکھی ہوئی تھیں[۱]۔

اُسید بن حُضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مروان بن الحکم خلیفہ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی انھوں نے خلیفہ کو احادیث رسول اور خلفاء راشدین کے فیصلے وغیرہ قلم بند کر کے بھیجے تھے[۲]۔

انس بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ۹۳ھ میں ہوا ہے آپ کے بارے میں مفصل لکھ چکا ہوں یہاں یہ بتانا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیثوں کو لکھنے والے مقام واسط کے متعدد افراد[۳] تھے، ان کے علاوہ جن لوگوں نے ان سے حدیثیں لکھی ہیں اور تاریخ میں ان کے ناموں کی صراحت ہے ان میں ثمامہ بن عبداللہ ابن انسؓ[۴]، مشہور راوی حدیث حُمید الطّویل[۵]، سلیمان[۶] التیمی، کثیر بن سلیم الراوی[۷] کے اسماء گرامی شامل ہیں ان کے پاس مخطوطات کی شکل میں حضرت انس کی حدیثیں موجود تھیں، ان میں سے بعض مخطوطے آج بھی ترکی وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ۷۲ھ میں ہوئی، طلبہ باقاعدہ ان کی خدمت میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور وہ املاء کراتے تھے[۸]۔

جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۷۴ھ میں وفات پائی ہے انھوں نے کچھ حدیثیں لکھ کر عامر بن سعد کو بھیجی تھیں[۹]۔

۱۔ تاریخ یعقوبی بحوالہ دراسات، ج۲،ص۱۱۴۔ ۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج۴،ص۲۲۶۔
۳۔ تاریخ بغداد، ج۸،ص۲۵۹۔ ۴۔ الکفایہ (خطیب بغدادی) ص۳۳۱۔
۵۔ بحوالہ دراسات النبوی، ج۱،ص۱۰۲۔ ۶۔ تہذیب التہذیب، ج۲،ص۵۷۔
۷۔ تہذیب التہذیب، ج۲،ص۵۷۔
۸۔ العلل، العلوم لابی خیثمہ، سنن دارمی، تقیید العلم وغیرہ، بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱،ص۱۰۴۔
۹۔ مسند احمد بن حنبل، ج۵،ص۸۹۔

جابر ابن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ۷۸ھ میں ہوا، اپنے دور میں وہ مفتی مدینہ تھے، مسائل میں لوگ آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مناسکِ حج سے متعلق احادیث نبوی کا ایک مجموعہ بھی ان کے پاس[1] تھا۔ حضرت جابرؓ سے سن کر جن لوگوں نے ان کی حدیثوں کو لکھا، اُن میں ابوسفیان[2]، ابوعثمان جعد بن دینار[3]، حسن بصری[4]، سلیمان[5] بن قیس الیشکری، عامر بن شراحیل شعبی[6]، عبداللہ بن عقیل[7]، عطار ابن[8] ابی رباح، قتادہ[9]، مجاہد[10]، مطرف[11]، محمد بن الحنفیہ[12] ابوجعفر محمد[13] بن علیؓ، ابوالزبیر[14] محمد بن مسلم، وہب ابن منبہ[15] کے نام تاریخوں میں بصراحت موجود ہیں ان تمام لوگوں نے ان کی حدیثوں کو قلم بند کیا۔

رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۴ھ کے پاس چمڑے اور جھلّیوں پر لکھی ہوئی احادیث تھیں اور بعض موقعوں پر انھوں نے احادیث کے اپنے اس مخطوطے کا حوالہ بھی دیا ہے جیسا کہ مروان کی تقریر کے بعد آپ نے اس کا حوالہ دیا ہے[16]۔ حضرت رافع کی ایک روایت میں ہے کہ ہم کئی آدمیوں نے حضورؐ سے گذارش کی **یا رسول اللّٰہ! انا نسمع منك شیئاً فنکتبھا، قال اکتبوا ولا حرج**[17]، اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت رافع کے ساتھ کچھ اور صحابہ بھی حدیثیں قلم بند کرتے تھے۔

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۵ھ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

۱ تذکرۃ الحفاظ، ج۱، ص۴۳۔ ۲ میزان الاعتدال، ج۲، ص۳۴۲، تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۳ التاریخ الصغیر البخاری، بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱، ص۱۰۴۔
۴ تہذیب التہذیب، ج۲، ص۲۶۷۔ ۵ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۶ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔ ۷ میزان الاعتدال، ج۲، ص۴۸۴۔
۸ مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص۲۲۶۔ ۹ تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۱۵۔
۱۰ طبقات ابن سعد بحوالہ دراسات، ج۱، ص۱۰۶۔ ۱۱ الکفایہ خطیب بغدادی، ص۳۵۴۔
۱۲ میزان الاعتدال، ج۲، ص۴۸۴۔ ۱۳ حوالہ مذکور۔
۱۴ تہذیب التہذیب، ج۹، ص۴۴۲۔ ۱۵ تہذیب التہذیب، ج۱، ص۲۱۶۔
۱۶ مسند احمد ابن حنبل، ج۴، ص۱۴۱۔ ۱۷ مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی، ج۱، ص۱۵۱۔

کے میر منشی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ انھیں کو جمع قرآن کرنے والوں کی جماعت کا سربراہ بنایا تھا، حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا کہ سُریانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لو انھوں نے دو ہفتہ میں سریانی سیکھ لی، چوں کہ یہ کاتب وحی تھے اس لئے کتابت حدیث میں احتیاط کرتے تھے، خلیفہ مروان بن الحکم نے ان سے حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اور انتظام یہ کیا کہ پردے کے پیچھے کاتبوں کو بٹھادیا، حضرت زید حدیثیں بیان فرماتے اور کاتب لکھتے جاتے تھے[۱]، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی بار اصرار کیا تو انھوں نے فرائض اور علم المیراث پر احادیث کا ایک مجموعہ لکھ کر دیا تھا[۲]، ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ علم الفرائض میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو زید ابن ثابتؓ نے لکھی ہے اور اس کے راوی قبیصہ ہیں[۳]، زید ابن ثابت سے جن لوگوں نے حدیثوں کو سن کر لکھا ان میں مشہور راوی حدیث ابو قلابہ کا نام بھی شامل[۴] ہے، حضرت زید بذات خود بہت کم حدیثیں لکھتے تھے، لیکن دوسروں کو املا کراتے تھے وہ حدیثیں بیان کرتے اور لوگ اس کو لکھتے جاتے تھے، کثیر ابن افلح کا بیان ہے کہ ہم لوگ زید کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور احادیث رسول لکھتے تھے[۵]۔

سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صحابیہ ہیں اور حضرت سعد بن خولہ کی بیوی ہیں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کی ہیں، بعض تابعین کو اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر دی ہیں اور تابعین نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں لکھی ہیں۔ عامر کا بیان ہے کہ حضرت سبیعہ نے عبداللہ بن عتبہ کو احادیث لکھ کر دی[۶] ہیں۔ امام زہری کا بیان ہے کہ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے مجھ سے بیان فرمایا

---

۱ سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۳۱۳، طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۱۱۷۔
۲ سیر اعلام النبلاء، ج ۲، ص ۳۱۲، سُنن دار قطنی، ج ۴، ص ۹۳۔
۳ کتاب العلل، ج ۱، ص ۲۳۶۔
۴ کامل ابن عدی، ج ۱، ص ۲۰۸، بحوالہ دراسات۔
۵ تقیید العلم، ص ۱۰۲، بحوالہ دراسات۔
۶ الکفایہ خطیب بغدادی، ص ۳۳۷۔

کہ والد نے عمر بن عبداللہ بن ارقم سے کہا کہ حضرت سبیعہؓ بنت الحارث الاسلمیہ کی حدیثیں لکھ کر بھیج دو چنانچہ لکھ کر بھیج دیں[۱]، مسروق کو بھی حضرت سبیعہؓ نے حدیثیں لکھ کر دی ہیں[۲]۔

سعد بن عبادة رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۱۵ھ انھوں نے احادیث رسول کو قلم بند کیا تھا آپ کا مخطوطہ خاندان کے بعض افراد کے پاس مدتوں رہا، آپ کی نسل میں وہ منتقل ہوتا رہا ان کی چوتھی پشت یعنی حضرت سعد کے پوتے کے لڑکے اسمٰعیل نے اپنے دادا کی اس کتاب سے روایتیں بیان کی ہیں[۳]۔

سمرة بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی وفات ۵۹ھ میں ہوئی مشہور صحابی رسول ہیں انھوں نے کتابی شکل میں احادیث جمع کر رکھی تھیں اور مسئلہ قضاء سے متعلق بہت سی احادیث کا ایک مجموعہ لکھ کر انھوں نے اپنے صاحبزادے کو ارسال فرمایا تھا، مشہور تابعی ابن سیرین کا بیان ہے **فی رسالة سمرة بن جندب علم کثیر**[۴] حضرت حسن بصری کے پاس اس کا ایک بڑا نسخہ تھا اس نسخہ سے انھوں نے بہت سی روایتیں بیان کی ہیں اگرچہ حسن بصری کو سمرۃ بن جندب سے سماع حاصل نہیں ہے اس لئے محدثین کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ یہ روایتیں اسی مخطوطہ سے ہیں۔ حسن بصری کے کئی شاگردوں نے اس نسخہ کو ان کے سامنے پڑھ کر اس کی روایت کی اجازت لی ہے اور شاگردوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، طبرانی نے تو المعجم الکبیر میں وہ پورا نسخہ ہی نقل کر دیا ہے[۵]۔ یہ نسخہ حضرت سمرہ کے صاحبزادے حضرت سلمان بن سمرہ کے پاس رہا، ابوداؤد اور سنن دارقطنی میں اس کا ذکر ہے۔

سہل بن سعد الساعدی انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۹۱ھ ان

۱۔ جامع صحیح بخاری کتاب المغازی، کتاب الطلاق وغیرہ میں ان کی حدیثیں مذکور ہیں۔
۲۔ سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق میں ان کی روایت موجود ہے۔
۳۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۵، ص ۲۸۵، تعجیل المنفعۃ، ص ۳۶ و ۳۱۴۔
۴۔ تہذیب التہذیب، ج ۴، ص ۲۳۶، الاستیعاب، ج ۱، ص ۶۳۔
۵۔ طبقات ابن سعد، ج ۷، ص ۱۱۵، سنن نسائی، ج ۱، ص ۲۰۵۔

کی حدیثوں کو ان کے شاگرد ابوحازم بن دینار نے جمع کیا ہے اور ابوحازم کے صاحبزادے نے اس کی روایت کی ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کی روایتوں کو خود ان کے صاحبزادے عباس بن سہل اور مشہور محدث ابن شہاب زہری بھی روایت کرتے ہیں[1]۔

شداد بن اوس بن ثابت الانصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۸ھ مسائل دینیہ پر آپ کی نگاہ بہت وسیع تھی اور فقیہ کہے جاتے تھے ان کے بارے میں تاریخوں میں یہ تشریح پائی جاتی ہے کہ وہ نوجوانوں کو اپنے سامنے بٹھا کر حدیثیں املا کرایا کرتے تھے[2]۔

شمعون الازوی الانصاری ابوریحانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وفات رسول کے بعد آپ دمشق میں رہنے لگے تھے، ان کا مسلمانوں میں بڑا اعزاز واکرام تھا، ان کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تھا جو انھوں نے لکھ رکھا تھا[3]۔

اُم المومنین **حضرت عائشہ** رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی ان کے علم وفضل کا پوری اُمتِ اسلامیہ اعتراف کرتی ہے، صحابہ کے دور میں دینی امور اور مسائل میں ان کی رائے قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی۔ مسائل کے سلسلہ میں اکابر صحابہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ہر مسئلہ سے متعلق ان کے پاس کوئی نہ کوئی حدیث ضرور مل جاتی تھی۔ روایت حدیث کے ساتھ درایت میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا، احادیث کے ذخیرے میں چند صحابہ کو کثرتِ روایات کی جو خصوصیت حاصل ہے انھیں میں حضرت عائشہؓ کا بھی شمار ہے۔ مسند میں ان کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ملتی ہے[4]، یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کتابت جانتی تھیں یا نہیں لیکن یہ حقیقت تو ناقابل تردید دلائل سے ثابت ہے کہ آپ احادیث رسول کا املاء کراتی

[1] تہذیب التہذیب، ج۴، ص۲۵۲ وجلد۶ ص۳۳۳، الہدی الساری (ابن حجر) ص ۱۸۵۔
[2] سیر اعلام النبلاء، ج۲ ص ۳۳۱ و ص۳۳۲۔
[3] الاصابہ (ابن حجر) ج۲، ص۱۵۷۔
[4] سیر اعلام النبلاء، ج۲، ص۱۰۱۔

تھیں اور مسائل کے سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کرنے والوں کو احادیث لکھ کر ارسال کی جاتی تھیں اسلامی ملکوں سے اہل علم آپ سے حدیثیں سننے کے لئے اور سن کر لکھنے کے لئے برابر آتے رہتے تھے اس لئے ان کی زندگی ہی میں ان کی املاء کرائی ہوئی حدیثیں جن کے پاس تھیں ان میں ان کے کاتب سالم بن امیہ[1] التیمی کا نام سر فہرست ہے، عمر[2] بن عبداللہ کو بھی عبداللہ ابن ابی اوفی نے ان کی احادیث لکھ کر دی تھیں، ان کے علاوہ عروہ بن الزبیر[3]، معاویہ[4] ابن سفیان کے پاس لکھی ہوئی ان کی حدیثیں موجود تھیں۔

عبداللّٰہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۷۳ھ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کو قاضی مقرر کیا تھا، اور ان کو کچھ حدیثیں لکھ کر دی تھیں[5]۔

عبداللّٰہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۶۸ھ کی ذات کثرت روایت کے لئے مشہور ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ احادیث رسولؐ کے دیوانے اور عاشق صادق تھے نوجوانی کی عمر تھی، تلاشِ حدیث میں مشقتیں اٹھاتے تھے اور ہمت نہیں ہارتے تھے ان کا معمول تھا کہ مدینہ کی گلیوں میں چلے جاتے اور جن سے ملنا ہوتا ان کو آواز دیکر باہر زمین پر اپنی چادر بچھا کر بیٹھ جاتے گرد وغبار سے اٹ جاتے گھر والے گھر سے نکل کر جب دیکھتے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں تو بہت شرمندہ ہوتے، حضرت ان سے صرف یہ کہتے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے آپ مجھے سنا دیجئے، وہ سنتے اور لکھ لیتے اور واپس آجاتے، اسی طرح ان کا روزانہ گشت جاری رہتا اور ہر حدیث کو سن کر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسرے صحابہ سے بھی اس کی تصدیق کرتے تب اس پر مکمل اعتماد کرتے[6] خود بھی احادیث لکھتے تھے اور کتابت کے لئے ملازم بھی رکھتے تھے اور اس

۱۔ فتح الباری، ج ۶، ص ۳۴۔
۲۔ الکفایہ، ص ۳۳۶، بخاری شریف کتاب الجہاد۔
۳۔ الکفایہ، ص ۲۰۵۔
۴۔ مسند حمیدی، ج ۱، ص ۱۲۹، مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۸۷۔
۵۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۴۔
۶۔ سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۲۳۰۔

سے احادیث نقل کراتے تھے[۱] ان سے دور دراز کے لوگ حدیثیں سننے کے لئے آتے اور اپنے تلامذہ کو احادیث املا بھی کراتے تھے[۲]۔

جن لوگوں کو انھوں نے حدیثیں املا کرائیں یا خود اپنے قلم سے لکھ کر دی ہیں ان میں متعدد نام تاریخوں میں ملتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کے پاس عبداللہ بن عباس کی حدیثیں لکھی ہوئی موجود تھیں، ان میں کچھ ممتاز حضرات کے نام درج ذیل ہیں۔ ابن ابی مُلیکہ، الحکم بن مقسم[۳]، ان کی چند روایتوں کے علاوہ سب عبداللہ بن عباس کے املا کرائے ہوئے مخطوطہ سے ہیں[۴]۔

سعید بن جبیرؓ کا بیان ہے کہ میں عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں بیٹھ کر تختیوں پر حدیثیں لکھا کرتا تھا[۵] حضرت عکرمہ کے پاس عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیری روایتوں کا مجموعہ تھا[۶]، عمرو بن دینار کے پاس بھی ابن عباس کی املا کرائی ہوئی حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا، خود ان کا بیان ہے کہ میں ابن عباس کی مجلس میں کھڑے ہو کر احادیث لکھا کرتا تھا[۷] ابن عباس کی روایتوں اور ان کی املا کرائی ہوئی حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ حضرت کُریب کے پاس تھا، تاریخ کی شہادت ہے کہ وہ کتابیں ایک اونٹ کا بوجھ تھیں، عبداللہ بن عباسؓ کے صاحبزادے علی ابن عبداللہ کو معلوم ہوا کہ والد کی املاء کرائی ہوئی حدیثوں کا مخطوطہ کُریب کے پاس ہے تو انھوں نے اس کا مطالبہ کیا تو کریب نے ان کو لکھا کہ آپ کو بھیج دوں گا[۸]۔ حضرت مجاہد کے پاس ابنِ عباسؓ کی تفسیری روایتوں کا مجموعہ تھا، ابن ابی مُلیکہ کا بیان ہے کہ میں نے خود مجاہد کو ابن عباس کے پاس لکھتے ہوئے دیکھا ہے، ابن عباس املاء کرا رہے تھے اور مجاہد لکھ رہے تھے[۹]۔

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما متوفی ۷۴ھ علم و عمل کے جامع

---

۱ الاصابہ، ج ۲، ص ۳۳۲۔ ۲ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۲۲۴ و ۲۴۸ و ۲۹۴۔

۳ مقدمہ مسلم شریف، ص ۱۳، مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۲۴۳۔ ۴ فتح المغیث، ج ۲، ص ۱۳۸۔

۵ کتاب العلل، ج ۱، ص ۵۰۔ ۶ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۱۸۔

۷ حوالہ مذکور۔ ۸ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۱۶۔

۹ التفسیر والمفسرون، ج ۱، ص ۱۰۴۔

تھے، اکابر فقہائے مدینہ میں شمار کئے جاتے تھے، کثیر روایتوں والے صحابہ کرام میں آپ کا بھی شمار ہے، وہ اپنے خطوط اور مراسلات میں عام طور پر حدیثیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے خود آپ کا اپنا کوئی صحیفہ نہیں تھا اور نہ کوئی مخطوطہ رکھتے تھے البتہ ان سے حدیثیں سن کر متعدد حضرات نے ان کی روایتیں لکھی ہیں۔سعید بن جُبیر کا بیان ہے کہ میں ابن عمر اور ابن عباس دونوں کی مجلس میں جایا کرتا تھا ان کی حدیثیں اپنے کجاوے کی لکڑی پر لکھ لیتا تھا اور جب منزل پر پہنچتا تو اس کو نقل کر لیتا تھا[١]جمیل بن زید الطائی نے ابن عمر کو دیکھا ہے مگر ان کی زندگی میں ان کی حدیثیں نہیں لکھ سکے۔اس ارادے سے جب وہ مدینہ گئے تو ان کا انتقال ہو چکا تھا تو مدینہ کے اہل علم سے پوچھ پوچھ کر ابن عمر کی حدیثیں لکھیں[٢]،عبدالعزیز بن مروان[٣]،عبدالملک بن مروان[٤]،اور عبیداللہ بن عمر[٥] کے پاس ان کی کچھ حدیثیں لکھی ہوئی تھیں،البتہ حضرت نافع کے پاس عبداللہ ابن عمر کی حدیثوں پر مشتمل ایک کتاب تھی[٦]۔

عبداللّٰہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ٦٣ھ ان کے پاس حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ایک مرتبہ متعدد صحابہ کی موجودگی میں انھوں نے عرض کیا کہ حضورؐ کی طرف کسی بھی غلط بات کا انتساب کتنا خطرناک ہے، حضورؐ کے ارشاد سے ہی آپ حضرات کو معلوم ہے تو حدیثوں کو بیان کرنے کا کام کتنا نازک ہے پھر آپ لوگ حدیثوں کے بیان کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں تو ان تمام حضرات نے فرمایا کہ ہم لوگ حدیثوں کو لکھ کر صحیح صحیح محفوظ کر لیتے ہیں[٧]، یہ حضورؐ کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور حضورؐ کو ان کے لکھنے کا حال معلوم تھا[٨]، ان کے حدیث کے مخطوطوں سے بھری ہوئی صندوقیں تھیں۔اکثر موقعوں پر اپنے مخطوطے نکال کر لوگوں کو حدیثیں سناتے تھے[٩]،آپ اپنے تلامذہ کو سامنے بٹھا کر حدیثیں املا کراتے تھے[١٠]ان کی

١۔ تقیید العلم، ص١٠٣، بحوالہ دراسات۔
٢۔ التاریخ الکبیر (بخاری) ج٢،ص ٢١٥۔
٣۔ مسند احمد بن حنبل، ج٢، ص ١٥٢۔
٤۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج١، ص ١٢٠۔
٥۔ مسند احمد بن حنبل، ج٢، ص ٤٥۔
٦۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج١، ص ١٢١۔
٧۔ مجمع الزوائد ج١، ص ١٥١۔
٨۔ سیر اعلام النبلاء، ج٣، ص ٥٨، سنن دارمی، ج١، ص ٢٦۔
٩۔ مسند احمد بن حنبل، ج٢، ص ١٧٦۔
١٠۔ مسند احمد بن حنبل، ج٢، ص ١٦٢۔

املاء کرائی ہوئی حدیثیں متعدد افراد کے پاس مخطوطوں میں موجود تھیں، ان میں سمرہ[۱] اور شعیب کے نام ہیں۔ شعیب حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے پوتے ہیں، ان کے پاس اپنے دادا کے ہاتھ کا لکھا ہوا حدیثوں کا مخطوطہ تھا، ان کی ساری روایتیں جو حدیث کی کتابوں میں ہیں اسی مخطوطہ[۲] سے ہیں ان دونوں حضرات کے علاوہ شفیع[۳] ابن ماتع۔ عبدالرحمٰن بن سلمہ[۴] الجمحی، عبداللہ[۵] رباح الانصاری، عامل عبداللہ بن[۶] عمرو بن العاصؓ کے پاس بھی ان کے املاء کرائی ہوئی حدیثیں موجود تھیں۔

عبداللہ بن مسعود الھذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۳۲ھ فقہائے صحابہ میں شامل تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو بہت سی خصوصیات حاصل تھیں، بعض آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کی پیش کی ہوئی تحریروں کو مٹا دیا ہے، اس کی وجہ صرف غیر معتبر اور ناقابل اعتماد تحریروں سے احتراز تھا، کیوں کہ خود ان کے پاس لکھی ہوئی حدیثیں موجود تھیں، انھوں نے اپنے لکھنے کا ذکر کیا ہے، ان کے صاحبزادے کے پاس حدیثوں کا ایک مجموعہ تھا وہ لوگوں کے سامنے اس کو پیش کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ میرے والد کی لکھی ہوئی ہے[۷]۔

عتبان بن مالک انصاریؓ ۶۰ھ سے قبل آپ کا انتقال ہوا، آپ نے خود حدیثیں تو نہیں لکھیں، البتہ مشہور صحابی رسول حضرت انس بن مالکؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ عتبان بن مالک کی حدیثیں لکھ لو، اور انہوں نے لکھا[۸]۔

علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۴۰ھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے بہت سی دستاویزیں لکھوائی ہیں، صلحنامہ حدیبیہ آپ ہی کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا، حضورؐ نے اپنے سامنے بٹھا کر ایک چمڑے پر کچھ مسائل لکھوائے

---

۱ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۹۹۔
۲ ترمذی، ج۲، ص۱۴۰، میزان الاعتدال، ج۲، ص۲۶۴، تہذیب التہذیب ترجمہ عمرو بن شعیب۔
۳ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج۱، ص۱۲۵۔
۴ حوالہ مذکور۔ ۵ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۹۲۔ ۶ مسند احمد بن حنبل، ج۲، ص۱۸۳۔
۷ کتاب العلل، ج۱، ص۳۲۲، جامع بیان العلم، ج۱، ص۲۷، بحوالہ دراسات۔
۸ مسلم شریف، ج۱، کتاب الایمان ص:۵۴۔

تھے، ان کے پاس حضور کا ایک صحیفہ تھا جس میں بہت سے احکام تھے[۳]، آپ کے پاس ''کتاب الصدقہ'' بھی تھی، بوقت ضرورت اس کی حدیثیں آپ بیان بھی کرتے تھے[۴]۔

آپ دوسرے صحابہ کو حدیثوں کے لکھنے کی جانب توجہ دلایا کرتے تھے اور کبھی کبھی دوسروں کو آپ حدیثیں املا بھی کراتے تھے[۳]، ان کے چھوٹے چھوٹے صحیفے بہت سے حضرات کے پاس تھے، تاریخوں میں سات آٹھ نام مجھے صراحت سے ملے ہیں، پھر ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کے مجموعے بھی تیار کئے گئے، محدثین ان فیصلوں اور فتووں کو روایت بھی کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی حدیثیں جن لوگوں کے پاس تھیں اور مخطوطہ رکھتے تھے ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں، یہ حضرات انھیں مخطوطوں ہی سے روایت کراتے ہیں، براہ راست حضرت علیؓ سے ان کی روایتیں نہیں ہیں۔ حارث اعور[۴]، حجر بن عدی بن جبلہ[۵]، حسن[۶] بن علی ابن ابی طالب، خلاس بن الہجری[۷]، عامر شعبی[۸]، عبداللہ بن عباس[۹]، عطاء بن ابی رباح[۱۰]، اور مجاہد[۱۱]۔ ان تمام حضرات کے بارے میں تصریح ملتی ہے ''انما ھی من کتاب''.

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۲۳ھ کا نام دوام جریدۂ عالم پر ثبت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کا عشق دیوانگی کی حد کو پہنچا ہوا تھا، انتہائی صائب الرائے، ان کی بہت سی روایتوں کو مرضیٔ الٰہی اور منشاء قدرت کی تائید حاصل ہوئی اور اس کو بطور فخر جذبۂ احسان مندی کے ساتھ بیان بھی کرتے تھے، ان کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہے لو کان بعدی نبیٌ لکانَ عُمر عام طور سے یہ مشہور ہے کہ آپ حدیث کو لکھنا تو درکنار اس کے بیان کرنے کے بھی سخت

۱۔ المستدرک للحاکم نیشاپوری، ج ۲، ص ۱۴۱، مسند احمد بن حنبل میں متعدد روایتوں کے ذیل میں اس کا ذکر آیا ہے۔
۲۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۱، ص ۱۴۱۔
۳۔ طبقات ابن سعد، ج ۶، ص ۱۱۶۔
۴۔ حوالہ مذکور۔
۵۔ حوالہ مذکور، ص ۱۵۴۔
۶۔ کتاب العلل، ج ۱، ص ۱۰۴۔
۷۔ میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۶۵۸، تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۱۷۶۔
۸۔ بحوالہ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ۱، ص ۱۳۰۔
۹۔ مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۳۔
۱۰۔ بحوالہ دراسات، ج ۱، ص ۱۳۱۔
۱۱۔ دراسات، ج ۱، ص ۱۳۱۔

مخالف تھے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سے حدیث کے مخطوطے کو جلوا دیا بلکہ تمام اسلامی ممالک میں حکم بھیج دیا کہ اس طرح کی تمام کتابوں کو تلاش کر کے جلا دیا جائے اور جب لوگوں کو حدیث بیان کرتے ہوئے سنتے تھے تو برہم ہو جاتے تھے، کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو حدیث بیان کرنے پر ڈانٹ چکے تھے، کثرتِ روایت پر ان کو دُرّہ لگایا تھا، بعض لوگوں کو حدیث بیان کرنے پر قید کر دیا تھا، اس طرح اکثر روایتیں یا تو جھوٹی ہیں یا ان میں کوئی نہ کوئی سقم ہے، کوئی روایت منقطع ہے تو کوئی ضعیف اور ساقط الاعتبار اور بعض مجہول راویوں کے سہارے روایت چلی ہے جو روایت صحیح ہے اُسے میں خود آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جاہ وجلال بھی نظر آتا ہے اور رعب داب بھی، اسی کے ساتھ حدیث بیان کرنے پر اظہار برہمی بھی پایا جاتا ہے اور سزا کی دھمکی بھی، میں اس روایت کو ابوداؤد سے پوری نقل کرتا ہوں آپ خود بھی اس کے الفاظ پر غور کریں۔

روایت یہ ہے:

عن ابی سعید الخدری، قال، کنت جالساً فی مجلس من مجالسِ الانصار فجاء ابوموسیٰ فزعاً، فقلنالہ، ما افزعك؟ قال، امرنی عمر أن اٰتیہ، فاتیتُہ، فاستاذنت ثلاثاً، فلم یوذن لی، فرجعتُ، فقال، ما منعك أن تاتینی؟ فقلتُ، قد جئت فاستاذنت وثلاثاً فلم یوذن لی، وقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم، اذا استاذن احدکم ثلاثاً فلم یوذن لہٗ فلیرجع، قال، لتاتینی علی ھذا بالبینة، قال، فقال ابوسعید لا یقوم معك الّا اصغر القوم قال، فقام ابوسعید معہ فشھد لہ[1].

ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ میں انصار کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابوموسیٰ اشعریؓ بہت گھبرائے ہوئے آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا پریشانی ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ نے مجھے بلایا تھا، ان کے گھر گیا تو دروازے پر پہنچ کر تین مرتبہ آواز

[1] ابوداؤد شریف، ج ۲، ص ۷۰۴، مطبوعہ رشیدہ دہلی۔

دی مگر اجازت نہیں ملی تو میں واپس چلا آیا، حضرت عمر نے دوبارہ بلوایا اور پوچھا کہ آپ کیوں نہیں آئے؟ تو میں نے کہا کہ آیا تھا تین مرتبہ اجازت طلب کی جب کوئی آواز نہیں آئی تو واپس چلا گیا، کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے تین مرتبہ استیذ ان کے بعد کوئی جواب نہ ملے تو تو لوٹ جاؤ، حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس بیان پر گواہ لاؤ، (ورنہ سمجھ لو) ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ ان گواہوں مین سب سے کم عمر میں ہوں اس لئے میں ہی چلوں گا انھوں نے جا کر ابوموسیٰ اشعریؓ کی تائید کی اور فرمایا کہ حضورؐ نے ایسا ہی فرمایا ہے، ابوموسیٰ نے صحیح کہا ہے۔

اس روایت کے بعد ایک اور روایت ہے جو حضرت عمرؓ کے دلی منشاء کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے سخت رویہ کی علت کو بتاتی ہے، یہ روایت خود ابوموسیٰ اشعریؓ کی ہے:

فقال لالی مُوسیٰ انّی لم اتّھمُك ولکنّ الحدیث عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شدید[1].

ابوموسیٰ! میں تم پر کوئی الزام نہیں لگاتا، بات صرف یہ ہے کہ حضورؐ کی حدیثوں کا معاملہ بڑا ہی اہم ہے (یعنی بڑی احتیاط سے بیان کرنا چاہیئے)

حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ حدیثوں کو بیان کرنے میں جری نہ ہو جائیں کیوں کہ مستقبل میں بد باطن افراد اس کے ذریعہ فتنہ برپا کر سکتے ہیں، یہ احتیاط تمام صحابہ میں ازخود موجود تھی، اور امیر المومنین کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کی ذمہ داری اور زیادہ تھی اس لئے وہ زیادہ سختی کا معاملہ کرتے تھے، ان کی یہ منشاء ہرگز نہیں تھی کہ حدیثیں نہ بیان کی جائیں اور نہ لکھی جائیں، انھوں نے جن کتابوں کو جلایا ہے وہ اسرائیلی خرافات اور یہودیوں کے نوشتے اور تحریریں تھیں، کیوں کہ ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ یہ واقعہ خود پیش آچکا تھا کہ کہیں سے وہ ایک تحریر لائے اور حضورؐ کو سنانے لگے، وہ سناتے جاتے تھے اور حضورؐ کا چہرہ مبارک غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے سرخ ہوا جا رہا تھا، حضرت عمرؓ کی جب نگاہ اٹھی تو سہم کر رہ[2] گئے اور فوراً جا کر اس تحریر کو جلا دیا، یہ

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۷۰۴۔ [2] مسند دارمی، مطبوعہ کان پور، ص ۶۲۔

بات ان کو یاد تھی، اس لئے یہودیوں کی لغویات اور روایات سے لوگوں کو نفرت دلانے کے لئے اس طرح کی ساری تحریروں کو جلوا دیتے تھے، اور کبھی کبھی سزا کی دھمکی بھی دیتے تھے، یہ معاملہ اسی طرح کی تحریروں اور نوشتوں کے ساتھ تھا کہیں سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صحابئ رسولؐ سے کوئی نوشتہ لے کر جلایا ہو، **ذلك بهتان عظيم.**

حضرت عمرؓ اپنے حکم ناموں میں بالعموم احادیث لکھا کرتے تھے جیسا کہ عتبہ[1] بن فرقد کو آذربیجان جو خط لکھا ہے یا ابوعبیدہ[2] بن الجراح کے جواب میں جو تحریر بھیجی ہے اور اسی طرح دوسرے عاملوں کو جو ہدایات ارسال فرمائی تھیں ان میں حدیثوں کے حوالے دیتے تھے۔ خود انھوں نے ایک "کتابُ الصدقۃ" رکھی تھی جس میں زکوٰۃ، صدقات وغیرہ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں[3]۔

عمرو بن حزم انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ۵۰ھ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کا عامل بنا کر بھیجا تھا اور دستور العمل کے طور پر ان کو ایک تحریر لکھوا کر دی تھی، جس میں طہارت، نماز، مال غنیمت، صدقات، خراج، دیات وغیرہ کے احکام تھے، عطاء بن ابی رباح نے اس کتاب کو پڑھا ہے، انھوں نے حضورؐ کے بعض مکتوبات کو بھی ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے[4]۔

فاطمة الزهراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں ان کی وصیت تھی[5]۔

فاطمه بن قيس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضورؐ کی بعض حدیثوں کو حضرت امّ سلمہؓ کو املا کرایا تھا[6]۔

---

١ مسند احمد بن حنبل، ج ١، ص ٢٦۔
٢ مسند احمد بن حنبل، ج ١، ص ٢٨ و ٤٦، سیر اعلام النبلاء، ج ٣، ص ٣٤٠۔
٣ التاریخ الکبیر (بخاری) ج ١، ص ٢١٨۔
٤ الاصابۃ (ابن حجر) ٥٨١٠، الاستیعاب ١٩٠٧۔
٥ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ٢٨٢۔
٦ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ٤١٣۔

محمّد بن مسلمة رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ٤٦ھ ان کے انتقال کے بعد ان کی تلوار کے نیام سے ایک صحیفہ نکلا جس میں حضور کی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں[1]۔

معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ١٨ھ جب ان کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک نوشتہ دیا گیا تھا جس میں زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کے احکامات تھے[2]۔

معاویه ابن ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ احادیث لکھوا کر منگائی تھیں، خود آپ بھی لوگوں کو ادعیہ ماثورہ کی تعلیم دیتے رہتے تھے[3]، عبدالرحمٰن بن شبل کو اپنے ہاتھ سے کچھ حدیثیں لکھ کر دی تھیں[4]۔

مغیره ابن شعبه رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں ارشادات نبویؐ درج تھے[5] مروان بن الحکم کو بھی کئی تحریروں میں آپ نے احادیث رسول لکھ کر ارسال فرمائی تھیں[6]، مغیرہ ابن شعبہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اپنی تحریروں میں احادیث لکھ کر بھیجی تھیں[7]۔

ام المؤمنین حضرت میمونه رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت الحارث الہلالیہ متوفی ٥١ھ کی حدیثوں کو ان کے غلام عطاء بن یسار نے لکھا تھا[8]۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ٦٥ھ کی احادیث قیس[9] بن الہیثم، ضحاک بن قیس[10]، یزید بن النعمان[11] کے پاس تھیں کچھ انھیں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تھیں یا منشی سے لکھوا کر دی تھیں، کچھ حدیثیں لکھوا کر قتادہ کو بھی بھیجی گئی تھیں[12]۔

واثله بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ متوفی ٨٣ھ آپ اپنے تلامذہ کو

---

١ دراسات فی الحدیث النبوی، ج ١، ص ١٤٠۔
٢ الاصابہ، ج ٣، ص ٤٣٤۔
٣ دراسات، ج ١، ص ٤٠۔
٤ دراسات فی الحدیث النبوی، ج، ص ١٤٠۔
٥ بخاری کتاب الاذان، ج ١، ص ١٥٥۔
٦ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص ٩٤۔
٧ بخاری کی متعدد روایات میں اس کا ذکر آیا ہے، مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص ٢٤٥، ٢٤٩، ٢٥٠۔
٨ مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص ٣٣٣۔
٩ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص ٢٧٧۔
١٠ دراسات، ج ١، ص ١٤٢۔
١١ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص ٢٧٣۔
١٢ مسند احمد بن حنبل، ج ٤، ص ٢٧٦۔

سامنے بٹھا کر احادیث کا املا کراتے تھے، معروف الخیاط کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت واثلہؓ کو طلبہ کی ایک جماعت کو املاء کراتے ہوئے دیکھا ہے[۱]۔

عہدِ صحابہ کی سرگرمیاں

جستہ جستہ تاریخوں میں جن صحابہ کرام کے لکھنے کا اتفاقاً تذکرہ آ گیا ہے اور ہزاروں صفحات پلٹنے کے بعد جو ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ پتھر کی لکیریں ہیں، ان حقائق کی روشنی میں مستشرقین کا وہ اعتراض کہ عہد صحابہ میں حدیثیں لکھی گئیں اور ہر مستشرق نے اپنی کتاب میں اس دعوئے پر پورا زورصرف کیا ہے، پاور ہوا ہو جاتا ہے، اتنی بڑی تعداد میں اتنی مضبوط مستند اور نا قابل انکار شہادتوں کے بعد بھی اگر کوئی اپنے اعتراض کو دہراتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ علمی دیانت کے تقاضوں کو سمجھنے سے بھی محروم ہے یا اس کے دل کا کھوٹ یہ باتیں کہنے کے لئے مجبور کرتا ہے جس میں صداقت کا دور دور کہیں پتہ نہیں۔

آپ کو اس دور کی علمی تاریخ کو اس دور کے ماحول، حالات، جذبات، دینی سرگرمیوں اور اصحاب رسول کی دین کے سلسلے میں انتھک جدوجہد کو پیش نظر رکھ کر مطالعہ کرنا چاہئے، تبھی آپ سچائیوں کو پاسکیں گے اور حقائق تک آپ کی رسائی ہو سکے گی۔

جن صحابہ کی پوری زندگی دین کی اشاعت کے لئے وقف تھی، دین کی تبلیغ کا جو پودا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے لگایا تھا اس کی آبیاری کو صحابہ نے اپنی زندگی کا واحد مشن بنا رکھا تھا، اور وہ اپنے خون کے سینچے ہوئے ہزاروں نقوش تاریخ کے صفحات پر چھوڑ گئے ہیں تو کیا ان کے بارے میں کاغذ، قلم اور روشنائی سے اس کی آبیاری میں کسی کوتاہی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، جب کہ دین کی اشاعت کا سب سے موثر ذریعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تھی، آپ کے اخلاق و عادات کا بیان تھا، آپ کے احکام و فرامین کی اشاعت تھی، آپ کی زندگی کے ایک

---

[۱] سیر اعلام النبلاء، ج ۳، ص ۲۵۹۔

ایک پہلو کی تصویر کشی تھی، اُسوۂ رسول کو دنیا کے سامنے پیش کر کے دوسروں کے دلوں میں ایمان کی روشنی پہنچائی جا سکتی تھی، اس نکتہ سے صحابہ کرام خوب واقف تھے، اس لیے شب و روز کا ہر ہر لمحہ میں کسی نہ کسی بہانے ذکر رسول ضروری تھا، حضورؐ کے اسفارِ غزوات و جہاد، آپ کے اوامر و نواہی کا ذکر، آپ کی عبادت و ریاضت، آپ کے اخلاق کریمانہ کی عکاسی یہی سب پہلو سب سے زیادہ موثر تھے اس لئے احادیث رسول از خود درمیان میں آجاتی تھیں، چوں کہ رسول اللہؐ کی پوری زندگی ان کی نگاہوں کے سامنے گذری تھی، اس لئے ۲۳ رسالہ نبوت کے زمامہ کا ایک ایک واقعہ صفحۂ ذہن پر مرتسم تھا، ان کا بیان ان حضرات کا سب سے دل کش، محبوب، پسندیدہ، سکون بخش مشغل تھا، جہاں ضرورت پڑی زبان سے زبانِ رسولؐ کو بیان کر دیا اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی تحریر سے کام لیا، یہی بیانات حدیث ہیں، اس لئے صحابہ کے پورے دور میں صرف مدینہ ہی نہیں مکہ مکرمہ، بصرہ، کوفہ، مصر، شام، دمشق، حمص وغیرہ، شہروں میں جہاں جہاں صحابہ کرام اقامت پذیر ہو گئے وہاں وہاں حدیث کے مدرسے کھل گئے اور حدیث کا فیضان عام ہوتا چلا گیا، اسلامی ممالک کے اندر صحابہ ہی میں **قَالَ قَالَ رَسُولِ اللہ صَلّی اللہ علیہ وسلم** کا نغمۂ ایمان افروز ہر طرف گونج رہا تھا، اس مقدس ذکر سے اسلامی شہروں کی فضا معمور تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی صدی میں نوے سال باقی تھے، اسی دور میں تابعین پیدا ہوئے جن کو بعد میں صحابہ کرام کے علوم کی اشاعت کا فریضہ انجام دینا تھا، جب وہ دین و ایمان کی پاکیزہ فضا میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تو ہر طرف، ہر جگہ حتی کہ اپنے گھر میں اپنے ماں باپ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا والہانہ انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے سنا وہ اَن دیکھے محبوب کے دیوانے ہو گئے، حضورؐ کی زیارت نہ ہونے کی حسرت لے کر ہر صحابی کے پاس پہنچے، ان کی زیارت کرنا، ان کی زبان سے حضورؐ کا ذکر جانفزا سننا ان کے شب و روز کا مشغلہ بن گیا۔ اب زمانہ کچھ اور آگے بڑھ چکا تھا، اسباب و وسائل از خود پیدا ہو چکے تھے اس لئے تابعین اپنے

ساتھ قلم، کاغذ اور تختیاں لے کر سفر کرنے لگے۔ جو کچھ صحابہ سے سنتے وہ سب کچھ لکھ لیتے، اس طرح پوری اسلامی دنیا میں اہلِ علم کے علمی قافلے رواں دواں تھے لوگ جتھے بنا کر صحابہ کے پاس جاتے اور ان سے حدیثیں لکھتے، اس طرح تمام صحابہ سے احادیث کا عطر کشید کر کے ساری دنیا کی علمی فضاؤں میں اس کی خوشبو کو پھیلا دینے کا فخر و امتیاز انھیں تابعین کبار کو حاصل ہے، **فجزاهم الله خير الجزاء.**

تابعین کبار کے عہد میں

میں نے اب تک عہد رسالت اور خالص عہد صحابہ میں جن حضرات نے احادیث قلمبند کر کے رکھی تھیں ان کا تذکرہ کیا ہے، ظاہر ہے کہ ان کے علاوہ بہت سے نوشتے اور مخطوطے اور یادداشتیں ہوں گی جن کا ذکر تاریخوں میں نہیں آسکا ہوگا یا اگر آیا ہے تو وہاں تک رہوارِ جستجو کے قدم نہیں پہنچے ہوں گے، یہ اتفاقاً تاریخوں میں روایتوں میں کہیں کہیں کسی کی تحریروں اور نوشتوں کا ذکر آ گیا ہے اور ان کی تلاش کر کے جمع کیا گیا ہے ورنہ عقل کہتی ہے کہ صحابہ کرام جو عشق رسول میں دیوانے تھے جن کے ایک اشارے پر پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ جانے والے، سمندروں میں گھوڑے دوڑانے والے، دشمنوں کے دہکتے ہوئے ماحول میں چھلانگ لگا دینے والے، ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، شوہر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر موت کے منہ میں چلے جانے کو اپنی سعادت سمجھنے والے صحابہ کرام کیا حضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہی حضورؐ کی صحبتوں کی برکات وانعامات زندگی کے جوش وخروش اور جذبات کی ہنگامہ آرائیوں سے ایک دم بے تعلق ہو جائیں گے؟ انسانی فطرت سے جو لوگ واقف ہیں اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ یقینی طور پر ہر ہر صحابی اپنی زندگی کی آخری سانس تک حضورؐ کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے رہا ہوگا، تنہائیوں میں حضورؐ کو یاد کر کے ان آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے رہے ہوں گے، اٹھتے بیٹھتے حضورؐ کا تصور آنکھوں میں سمایا رہا ہوگا۔

جذبات صحابہ کے وارثوں کی ایک مثال

ایک مخلص اور سچا مسلمان حج کر کے آتا ہے تو ایک سال تک مکہ و مدینہ کا تذکرہ کرتے ہوئے نہیں تھکتا، جہاں بیٹھتا ہے، جس مجلس میں رہتا ہے، جس سے ملتا ہے ہر حال میں خانہ کعبہ کی جلالت شان اور گنبد خضریٰ کے ایمان افروز اور ورح نواز نظاروں کے تذکرے ہی میں اس کو سکون قلب ملتا ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ میں ہمہ وقت مدینہ کی گلیوں، راستوں، پہاڑوں اور اس کی زیارت گاہوں کا ہی تذکرہ کرتا رہوں۔ سوتے جاگتے مکہ مدینہ کا ہی خواب دیکھتا رہتا ہے۔ آپ سنتے سنتے تھک جائیں گے لیکن وہ بیان کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا، یہ روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جب کہ آج ہمارا ایمانی جذبہ بہت کمزور پڑ چکا ہے، مکہ مدینہ کی ساری فضائیں بدل چکی ہیں، لیکن اس فضا میں چند دنوں رہ کر جو والہانہ عقیدت و وابستگی اس تصور کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہیں، یہیں کی پاکیزہ فضاؤں میں حضورؐ کے تنفس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، مدینہ کا ذرہ ذرہ اس کو بے تاب کر دیتا ہے کہ آؤ اپنی عقیدت کی پیشانیوں کو ان پر رکھ دو، ہر پتھر کہتا ہے کہ آگے بڑھو اور مجھ کو چوم لو، وہاں کے نخلستان کھجوروں کے درخت، مسجد نبوی کا گوشہ گوشہ، حجرۂ پاک کی جالیوں کا ایک ایک روزن اشاروں سے کہتا ہے باادب، ہوشیار، یہ بارگاہِ عالیشان ہے۔ یہاں قدموں سے نہیں سر کے بل چلا جاتا ہے، اس کی راہوں میں دیدۂ و دل بچھائے جاتے ہیں، کہیں ان خاک ذروں پر تمہارے قدم نہ پڑ جائیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدمِ مبارک کو بوسہ دے کر عظمت و احترام کا بلند درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تصورات، جذبات اور والہانہ وابستگی زائر کے دل و دماغ کو مسحور کر لیتی ہے۔ پھر وہ دل میں مدینہ کی گلیوں کی یادوں کو بسا کر بوجھل قدموں سے اپنے وطن واپس لوٹتا ہے تو پوری زندگی کے لئے مدینہ کی یاد اس کا سب سے عظیم اور سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتی ہے۔

صحابہ کا بلند ترین مقامِ عشق

جنھوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتوں سے فیض اٹھایا تھا ان کی وارفتگی و دیوانگی کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، دل ہی نہیں عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ صحابہ کرام ساری زندگی حضور کے ذکر پاک کو اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھتے رہے ہوں گے کیوں کہ حضور کی ذات سے جس کام اور بات کی نسبت ہو جاتی ہے مسلمانوں کے نزدیک سند کا درجہ رکھتی ہے، حجت اور دلیل شرعی ہوتی ہے اس سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں انھیں کی روشنی میں زندگی کی راہیں متعین ہوتی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا جاتا ہے۔

حضور کا ہر قول وفعل یکساں حجت ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زبان سے ارشاد فرما دینا، یا صحابہ کی موجودگی میں کسی کام کا کرنا تو بہت بڑی سند اور حجت تو ہے ہی آپ کا صرف مسکرا دینا بھی سو دلیلوں سے بڑی دلیل بن سکتا ہے، ایک مثال لیجئے، عبداللہ ابن مغفل رضی اللہ عنہ ایک جنگ میں چربی کی ایک تھیلی پا جاتے ہیں اس کو اٹھا کر کرتے میں چھپا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور دل میں یہ سوچتے ہیں کہ اس میں کسی کو حصہ نہیں دوں گا، اسی حالت میں ان کی نگاہ اٹھ جاتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ شہنشاہِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے مسکرا رہے ہیں[۱]۔ روایت یہیں ختم ہو جاتی ہے، عبداللہ ابن مغفلؓ کی بے ساختہ حرکتوں کو دیکھ کر حضورؐ کا صرف مسکرا دینا دلیل شرعی بن گئی کہ مال غنیمت میں کھانے پینے کی چیز چربی، شہد، انگور وغیرہ مل جائے تو مسلمان فوجیوں کو استعمال میں لانا جائز ہے یہ مال غنیمت میں خیانت اور ''غلول'' میں شامل نہیں جس کے لئے روایتوں میں بڑی بڑی وعیدیں آئی ہوئی ہیں حتی کہ سوئی دھاگا بھی مالِ غنیمت میں سے کسی نے لے لیا تو قیامت میں اس سے مواخذہ ہوگا۔

---

[۱] مشکوٰۃ شریف، ج ۲، ص ۳۴۹، ابوداؤد، ج ۲، ص ۳۶۹، کتاب الجہاد باب فی اباحۃ الطعام فی ارض العدو۔

حضور کی ذات سے متعلق ہر واقعہ ناقابلِ فراموش تھا

ان حالات میں صحابہ کرام معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ ایسی صورت حال میں حدیثوں کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے تھی، حدیثوں کے موجودہ ذخیرہ کو خلاف عقل تصور کرنا یہ ذہن وفکر اور عقل کی نارسائی ہے، تاریخ کا مطالعہ حالات اور ماحول کے تناظر میں کرنا چاہئے ورنہ بہت سے حقائق تمہاری نگاہوں سے مستور رہ جائیں گے، جیسا کہ کچھ لوگ حدیثوں کی کثرت دیکھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

تاریخ ہر قوم کا تاریخی ورثہ ہے

بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ نویسی نام ہے صرف فتوحات اور جنگ آرائی کا، آپ ہندوستان کی تاریخ اٹھا کر پڑھئے دس دس بارہ بارہ ضخیم جلدوں میں آپ کو ہندوستان کی تاریخ ملے گی، ابتداء سے انتہا تک آپ سوائے لڑائیوں، فوج کشیوں اور قتل وخونریزی اور غارت گری کے واقعات کے آپ کو اور کیا ملے گا، ایک طالع آزما تلوار ہاتھ میں لے کر اٹھتا ہے اور ملتان سے آسام تک فتح کر ڈالتا ہے، اب اس ملک کی پوری تاریخ اسی ایک شخص کے گرد گردش کرتی رہ جائے گی، صرف اسی کے کارنامے تاریخ کے صفحات میں جگہ پائیں گے، کتاب کا ہر عنوان ہر باب کسی جنگ کی داستان ہوگا، تباہیوں کی کہانی سناتا ہوا نظر آئے گا، گویا وہ ملک ایک بڑا مذبح ہے جہاں صرف ایک ہی کام ہوتا ہے کہ انسان انسان کو ذبح کرتا رہتا ہے، اور کوئی دوسرا کام نہیں، کیوں کہ پوری تاریخ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صرف بابر، ہمایوں، اکبر، شاہجہاں، جہانگیر اورنگ زیب رہتے تھے، جب کہ دوسرے کروڑوں افراد اس ملک میں بستے تھے ان کی کہانی آپ کو کوئی تاریخ نہیں سناتی اور جس کی ذات، جس کا اقتدار، جس کی حکومت نے لاکھوں انسانوں کو اپنی خواہشات

کے بت پر بھینٹ چڑھا یا اس کی ذات تاریخ کا محور بن گئی۔

لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جو ملکوں اور شہروں کو فتح کرنے والے نہیں بلکہ دلوں کی دنیا کو فتح کرنے والے ہیں اور ایسے انسانوں کے دلوں کو فتح کرنے والے ہیں جن کے سینوں میں گوشت اور خون سے بنا ہوا نرم نازک دل نہیں تھا بلکہ ان کے سینوں میں دل بجائے سنگ خارا کا ٹکڑا رکھ دیا گیا تھا، درندہ صفت اتنے تھے کہ اپنے جگر گوشوں کو جب ناپسند کرتے تو کسی کھائی میں اس طرح پھینک دیتے جیسے کوئی غلاظت پھینکتا ہے۔ جھگڑالو اور خصومت پسند، سخت دل اور انسانیت کے اتنے بڑے دشمن کہ ایک اونٹنی کسی کے کھیت میں پڑ جائے تو اس قصہ کو لے کر چالیس سال تک لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں اور ہزاروں آدمی اس آگ میں بھسم ہو جاتے ہیں۔

ایسے شقی القلب انسانوں کو رام کرنا، ان کے دلوں کو فتح کرنا عقل و خرد کی دنیا میں ناممکنات میں سے تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلوں کو فتح کیا کہ پوری انسانیت کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے پھر ایسے محسنِ انسانیت کو اس دور کا انسان کیسے فراموش کر سکتا تھا اس لئے لاکھوں صحابہ کرام نے اپنی زندگی بھر حضورؐ کے واقعات، بیانات، ہدایات، احکام کو ہو بہو یاد رکھا اور دوسروں سے بیان کیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، یہی بیان تو حدیث ہے، اپنے محبوب رہنما کی ہر بات کو اس اندیشہ سے کہ ذہن سے نہ نکل جائے اپنی زندگی میں لکھ لیا تو اس کو تسلیم کرنے کے لئے آپ کا دل کیوں تیار نہیں ہوتا؟ چودہ سو سال بعد دو چار یہودیوں نے آپ کو یہ سبق پڑھا دیا کہ حدیثیں دو سو سال بعد لکھی گئی ہیں اس لئے سب جھوٹی ہیں یہ سن کر آپ کے دل میں کانٹا چبھنے لگا۔

صحابہ کی ساری حدیثیں قلم بند ہو چکی تھیں

صحاح ستہ کی کتابوں کو دیکھ کر احمقوں نے سمجھ لیا کہ حدیث کا وجود اس صدی میں ہوا، حدیثوں کو لکھنے کا آغاز تو عہد رسالت ہی میں ہو چکا تھا اور عہد صحابہ میں ساری

حدیثیں کلی طور پر لکھی جا چکی تھیں، صحابہ کرام نے خود لکھ لیا اگر خود نہیں لکھا تو دوسروں کو املا کرادیا۔ اگر یہ بھی نہیں ہوا تو انہوں نے زبانی یاد کیا اور تابعین کرام نے ان کو قلم بند کرلیا اس طرح ساری کتابیں جو بعد میں کتابی شکل میں مرتب ہو کر دنیا میں پھیلیں عہد صحابہ میں مکمل طور پر لکھی جا چکی تھیں جیسا کہ میں نے صرف حضرت انس بن مالکؓ کی مثال دی تھی کہ ان کے دوسوایک شاگردوں نے ان کی حدیثیں ان کی زندگی ہی میں لکھ لی تھیں، اسی طرح عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، اور حضرت عائشہؓ کی بیان کردہ ہزاروں ہزار حدیثیں ان حضرات کی زندگی میں قید تحریر میں آچکی تھیں اور کئی سو حضرات نے ان کو قلم بند کیا تھا، حدیثوں کے لکھنے کا عہد رسالت سے جو سلسلہ شروع ہوا تو اخیر تک پورا سلسلہ مربوط ہے اور اس میں کوئی کڑی ٹوٹی نہیں ہے کیونکہ پہلی صدی کی آخری دہائی میں بھی چند صحابہ روئے زمین پر موجود تھے، آخری صحابی ۱۰۰ھ میں اس دار فانی سے رحلت فرماتے ہیں اس لئے پہلی صدی مکمل طور پر صحابہ کی صدی ہے، براہ راست حضورؐ سے حدیث سننے والوں کی صدی ہے اور اس صدی میں تابعین نے صحابہ سے قلم کاغذ لے کر ملاقاتیں کی ہیں اور ہر صحابی کی حدیثیں قلم بند کر ڈالی ہیں اس کے بعد دوسری صدی کا آغاز تابعین و تبع تابعین کا مشترکہ دور آتا ہے اور کتابت حدیث کا سلسلہ اب دراز سے دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔

پہلی صدی کا ایک سرسری جائزہ

میں نے پہلی صدی کو صحابہ کی صدی کہا ہے اس لئے کہ آخری صحابی کا ۱۰۰ھ میں انتقال ہوا ہے، پہلی صدی کے ربع آخر یعنی ۷۵ھ میں ۲۵ صحابہ کرام موجود تھے اب صرف وہی صحابہ کرام باقی رہ گئے تھے جن کی عمریں دراز تھیں ۸۰ھ میں صحابہ کی جماعت ختم ہو چکی تھی ۸۱ھ میں صرف ۱۸ صحابہ تھے جن میں سات آٹھ شام کے مختلف شہروں میں تھے اور بقیہ دوسرے اسلامی ممالک کے دوسرے شہروں میں انفرادی طور پر تھے اور ۹۰ھ جب آتا ہے تو پہلی صدی کی آخری دہائی میں صرف چھ صحابہ کرام

روئے زمین پر رہ جاتے ہیں[1]۔

اس طرح پہلی صدی کے آخری ۲۵ سال خالص صحابہ کی مدت میں شامل نہیں کئے جاسکتے بلکہ اکابر تابعین اور صحابہ کرام کا مشترکہ دور کہا جاسکتا ہے اس لئے پہلی صدی کی علمی سرگرمیوں میں تابعین کا بہت اہم کردار ہے اس لئے صحابہ کی کتابتِ حدیث کے بعد اکابر تابعین کی جدوجہد کا جائزہ لے کر پہلی صدی کی کتابت حدیث کی سرگرمیوں کا مطالعہ مکمل ہوسکتا ہے۔ تابعین کرام ہی علوم صحابہ کے اولین امین ہیں، پہلی صدی کی پہلی دہائی کو خارج کر دیا جاتا ہے کہ حضور اس دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں تو نوے سال بچتے ہیں، خلافت راشدہ کے دور میں جتنے لوگ پیدا ہوئے وہ پہلی صدی کے اختتام تک عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے اس لئے ہمارے جائزہ میں سوائے چند تابعین کے اکثر کا انتقال پہلی ہی صدی میں ہو چکا ہے، اس لئے اکابر تابعین کا دور پہلی صدی کے اختتام پر ختم ہوجاتا ہے اس لئے ان کی ساری علمی سرگرمیاں پہلی صدی ہجری کی سرگرمیاں ہیں اور اس وقت کی ہیں جب علم سینوں اور دماغوں میں بھی موجود تھا اور زبانوں پر بھی تازہ تھا اس لئے تابعین نے علم حدیث کی حفاظت اور اس کو صحیفوں میں محفوظ کرنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے وہ بلا استثناء سب کا سب پہلی صدی کا علمی کارنامہ ہے، پہلی صدی کے تمام ہونے سے قبل ہی انہوں نے صحابہ کے علوم کو کاغذوں اور صحیفوں کے حوالے کر دیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۶۵ سالوں میں احادیث کا ذخیرہ لکھ کر محفوظ کیا جاچکا تھا، چوں کہ ابھی پریس کی ایجاد کو صدیوں کا انتظار تھا اس لئے باضابطہ مرتب کتابیں وجود میں نہیں آئی تھیں، یہ کام بعد میں ہوا، اگر ہم خلافت راشدہ کے بعد ۴۰ھ سے صحابہ کی علمی سرگرمیوں میں ان کے تلامذہ تابعین کو بھی شریک مان لیں اور ان کو ماننا ضروری بھی ہے تو پہلی صدی کے آخری ۶۰ سال صحابہ اور تابعین کی مشترکہ جدوجہد اور مشترکہ علمی سرگرمیوں کا دور کہا

---

[1] شذرات الذہب (ابن العماد الحنبلی) کی جلد اول کے تفصیلی مطالعہ اور فہرست سازی کے بعد یہ معلومات سپرد قلم کی جارہی ہیں۔

جائے گا، اب ہم اکابر تابعین کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام کی حدیثیں لکھیں۔

اکابر تابعین اور کتابتِ حدیث

اس جائزہ میں بالعموم ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلی صدی میں مصروفِ عمل تھے اگرچہ کچھ کا انتقال دوسری صدی کے آغاز میں ہوا ہے۔

ابان بن عثمان عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ولادت ہوئی ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا، انہوں نے سب سے پہلے کتاب المغازی مرتب کی بعد کے لوگ اس کو پڑھتے اور پڑھاتے تھے[۱]۔

ابراھیم نخعی متوفی ۹۶ھ اپنے حافظہ پر مکمل اعتماد ہونے کی وجہ سے وہ خود تو حدیثیں نہیں لکھتے تھے لیکن اپنے شاگرد رشید حضرت قتادہ کو اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر دی تھیں[۲]۔ ابراہیم نخعی اپنے تلامذہ کو بٹھا کر احادیث کا املا کراتے تھے[۳]۔

ابو سلمه بن عبدالرحمن خلافت عثمانی میں پیدا ہوئے، وہ اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر اہل علم کو دیتے تھے[۴]۔

ابو قلابه متوفی ۱۰۳ھ جلیل القدر محدث تھے بہت سے صحابہ سے انہوں نے حدیثیں لکھیں تھیں[۵]۔ احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ لکھا ہوا ان کے پاس جمع تھا کہ وہ کتابیں ایک اونٹ کا پورا بوجھ تھیں، مرتے وقت وصیت کی تھی کہ یہ ساری کتابیں مشہور محدث ایوب سختیانی کے حوالے کر دی جائیں خود ایوب سختیانی کا بیان ہے کہ میں نے حمال کو تیرہ چودہ درہم مزدوری دی تھی، تمام مخطوطے ایک اونٹ پر بار کر کے میرے پاس لائے گئے تھے[۶]۔

ابو الزناد ابن شہاب زہری کے ساتھ صحابہ کی خدمت میں جاتے تھے تو

---

۱ تہذیب التہذیب ج اص ۹۷ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۶
۲ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۹
۳ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۹۰، ۲۳۲
۴ تاریخ بغداد ج اص ۲۱۸
۵ الکفایہ ص ۳۵۱
۶ تذکرۃ الحفاظ ج اص ۸۸

اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ قلم لے کر جاتے تھے، صحابہ سے جتنی حدیثیں سنتے تھے سب لکھ لیتے تھے[۱]۔

ابو الملیح بن اسامہ متوفی ۸۹ھ وہ صحابہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پابندی کے ساتھ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے[۲]۔

ام الدرداء متوفی ۹۳ھ تابعیہ ہیں وہ اہلِ علم سے تختیاں لے کر اپنے ہاتھ سے حدیثیں لکھ کر ان کو واپس کر دیتی تھیں[۳]۔

جابر ابن زید متوفی ۹۳ھ ان کے تلامذہ ان کی مجلس میں بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے اور وہ املاء کراتے تھے[۴]۔

حارث بن عبد اللہ متوفی ۶۵ھ ان کے پاس احادیث کے بہت سے مخطوطے تھے جو بعد کے لوگوں کے ہاتھوں میں آئے اور اس سے روایتیں کی گئی[۵]۔

حبار بن جزئی السلمی متوفی ۱۰۰ھ انہوں نے متعدد صحابہ کرام سے ملاقات کر کے ان سے حدیثیں لکھی تھیں[۶]۔

حمران بن ابان مولیٰ عثمان بن عفانؓ متوفی ۷۵ھ حضرت ابوبکر صدیق سے شرف ملاقات حاصل ہے صحابہ کی حدیثیں جمع کی تھیں اور جب وہ اپنی ساری کتابیں لے کر بصرہ گئے ہیں تو ان سے بہت سے لوگون نے حدیثیں لکھیں[۷]۔

حسن بصری سے ان کی حدیثیں لکھنے والے لکھ کر ان سے روایت کرنے کی اجازت حاصل کرتے اور وہ اجازت دیدیتے تھے[۸]۔

حمید الطویل نے بھی حسن بصری کی بہت سی حدیثوں کو لکھ کر اپنے پاس رکھا تھا[۹]۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۰۳
۲۔ دراسات فی الحدیث النبوی ج ا ص ۱۴۵
۳۔ حوالہ مذکور۔
۴۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۲۱
۵۔ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۱۶
۶۔ دراسات ج ا ص ۱۴۶
۷۔ ثقات ابن حبان ج ا ص ۱۷۱
۸۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۳۹
۹۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۹

خالد بن معدان ابن ابی کریب الکلاعی متوفی ۱۰۳ھ انہوں نے ستر صحابہ سے ملاقاتیں کیں تھیں، ان کے پاس صحابہ سے سنی ہوئی حدیثوں کے صحیفے تھے اوران کو جزدانوں میں باندھ کر بڑی حفاظت سے رکھتے تھے[۱]۔

ذکوان ابو صالح السمّان متوفی ۱۰۱ھ حضرت ابو ہریرہ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، انہوں نے ابو ہریرہؓ کی حدیثیں لکھ لی تھیں[۲] اوران سے دوسروں نے ہزاروں حدیثیں لکھیں[۳]۔

ابو العالیہ الریاحی رفیع بن مہران بصری متوفی ۹۰ھ کاتبِ وحی اُبی بن کعب سے قرآن پڑھا وہ لوگوں کواحادیث لکھنے کی برابرتاکید کرتے رہتے تھے خود انہوں نے ایک تفسیر لکھی تھی، اپنے پاس کی حدیثوں کا املاء کراتے تھے، ابواب فقہیہ کے طرز پران کے یہاں احادیث مرتب لکھی ہوئی تھیں[۴]۔

رجاء بن حیوۃ احادیث کاایک ضخیم مجموعہ لکھا ہوا اپنے پاس رکھتے تھے[۵]۔

سالم بن ابی الجعد متوفی ۱۰۰ھ کبارتابعین میں شمار ہے صحابہ سے سن کر پابندی سے وہ حدیثیں لکھ لیتے تھے[۶]، ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ وہ صحابہ سے سن کر تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے[۷]۔

سعید بن جبیر متوفی ۶۵ھ مشاہیر صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں، انھوں نے تفسیر قرآن لکھی تھی ان کے تلامذہ نے اس تفسیر کی نقلیں لیں، ان تلامذہ میں ضحاک، عبدالملک بن مروان، عزرہ، عطاء بن دینار ہُذنی اورقتادہ شامل ہیں[۸]۔

سعید بن فیروز ابوالبختری متوفی ۸۳ھ ان کے پاس فدک اور اموال بنی نضیر سے متعلق بہت سی حدیثیں لکھی ہوئی تھیں[۹]۔

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ج اص ۷۵ا　　۲ دراسات ج اص ۱۴۷
۳ حوالہ مذکور　　۴ کتاب العلل ۱۷۶ بحوالہ دراسات
۵ سنن دارمی ص ۶۹　　۶ طبقات بن سعد ج:۶ ص:۲۰۳　　۷ ترمذی ج:۲، ص:۲۳۸
۸ طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۱۰، ۱۸۶، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۰، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۹۸، ج ۴ ص ۷۳
۹ دراسات ج اص ۱۴۹۔

سلیمان بن قیس الیشکری متوفی ۸۰ھ وہ ہمیشہ پابندی سے حدیثیں لکھتے تھے[۱]۔

سلیمان بن یسار خلافت عثمانی میں ولادت ہوئی اور ۱۰۴ھ کے قریب وفات پائی ان کے پاس حدیثوں کا مخطوطہ تھا[۲]۔

شراحیل بن شرحبیل متوفی ۶۰ھ دمشق میں سکونت تھی، لوگ ان کے پاس آتے تھے اور ان سے حدیثیں لکھتے تھے[۳]۔

شفیق بن سملة الاسد وابووائل متوفی ۸۱ھ یہ حدیثوں کا املا کراتے تھے، ان سے حدیثیں لکھنے والوں میں سعید بن مسروق الثوری بھی ہیں جن کے ذریعہ احادیث کا یہ ذخیرہ مشہور محدث سفیان ثوری تک پہنچا جو کتابوں کی شکل میں تھا[۴]۔

شہر بن حوشب الاشعری متوفی ۱۰۰ھ وہ بول کر اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھواتے تھے[۵]۔

صالح بن کیستان امام زہری کے ساتھ صحابہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے حدیثیں لکھتے تھے[۶]۔

ضحاک بن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ آپ کی تفسیر قرآن ہے اور مناسک حج کے مسائل پر مشتمل حدیثوں کا مجموعہ بھی تھا[۷] حسین بن عقیل کے پاس یہ رسالہ موجود تھا۔

طاؤس بن کیسان متوفی ۱۰۰ھ ان کے پاس ایک کتاب تھی جس میں احادیث رسول لکھی ہوئی تھیں وہ اپنے تلامذہ اور دوسرے اہل علم کو حدیثیں املا کراتے تھے[۸]، مشہور محدث لیث ابن ابی سلیم بڑی بڑی تختیاں لے کر طاؤس کی خدمت میں جاتے اور حدیثیں لکھتے تھے[۹]۔

۱۔ تقیید العلم ص ۱۰۸ بحوالہ دراسات۔
۲۔ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۲۹۔
۳۔ کتاب الثقات ص ۳۳۱۔
۴۔ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۰۔
۵۔ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۵۹۔
۶۔ کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۸۔
۷۔ الفہرست ابن ندیم ج ۳۴ کتاب العلل ج ۱ ص ۴۳۔
۸۔ سنن دارقطنی ج ۲ ص ۹۰
۹۔ تاریخ ابن ابی خیثمہ ج ۳ ص ۵۸ بحوالہ دراسات۔

عامر بن شراحیل شعبی ھمدانی متوفی ۱۰۳ھ مشہور محدث اور تابعی ہیں کوفہ کے قاضی تھے، خود ان کے اپنے قوی حافظہ پر پورا اعتماد تھا، بعض احادیث ان کے حافظہ سے نکل گئیں تو نہ لکھنے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہے اس لئے اپنے تلامذہ کو برابر تاکید کرتے رہتے تھے کہ جو لکھایا جارہا ہے پوری پابندی سے لکھ لو، وہ مستقل طور پر اپنی حدیثوں کا املاء کراتے تھے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں ان میں کتابُ الجراحات، کتابُ الفرائض، کتابُ الطلاق، کتابُ المغازی، اور احادیث فقہیہ کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے[1]۔

عامر بن عبداللّٰہ بن مسعود الھذلی مشہور صحابی رسولؐ ابن مسعودؓ کے صاحبزادے ہیں ۸۱ھ میں وفات پائی انھوں نے بہت سی حدیثیں قلمبند کر کے مشہور محدث یحییٰ بن ابی کثیر کو ارسال کی تھیں[2]۔

عبدالرحمٰن بن عائد الازوی متوفی ۸۰ھ جلیل القدر تابعی ہیں کچھ لوگوں نے تو ان کو صحابی بھی کہا ہے، انھوں نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا لوگوں نے ان کی کتابوں کو ترازو پر تول کر آپس میں تقسیم کیا تھا[3]۔

عبدالرحمٰن بن عبداللّٰہ بن مسعودؓ یہ صحابی رسولؐ ابن مسعودؓ کے دوسرے صاحبزادے ۷۹ھ میں انتقال کیا ان کے لڑکے معن نے اپنے والد کے مخطوطہ کو اہلِ علم کے سامنے پیش کیا[4]۔

عبدالرحمٰن بن غنم متوفی ۷۸ھ میں انتقال ہوا، فقہائے شام میں آپ کا شمار ہے ان کی احادیث کو میسرہ نے اپنی کتاب میں جمع کیا ہے[5]۔

ابوعثمان الھندی کا انتقال ۹۵ھ میں ہوا، عہد جاہلیت میں ولادت ہوئی حضور کے عہد مبارک میں اسلام قبول کیا مگر شرف صحبت حاصل نہ ہوسکا، ان کے املا سے ان کی حدیثوں کو مشہور محدث سلیمان التیمی نے جمع کیا اور لکھا[6]۔

---

۱ تاریخ بعداد ج ۱۲ ص ۲۳۰، ۲۳۲۔ ۲ المعجم الکبیر طبرانی ج ۵ ص ۹۷۔

۳ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۰۴، تاریخ الفسوی ج ۲ ص ۱۱۸ بحوالہ دراسات۔

۴ بحوالہ دراسات ج ۱ ص ۱۵۴۔ ۵ حوالہ مذکور۔ ۶ مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۱۰۔

عبداللّٰہ ابن رباح انصاری متوفی ۹۰ھ انھوں نے اپنی حدیثیں عبدالملک[۱] بن حبیب الازدی اور ابوعمران[۲] الجونی کو املاء کرائیں۔

عبداللّٰہ بن ابی قتادۃ الانصاری متوفی ۹۹ھ ان کی حدیثوں کو یحییٰ نے قلمبند کرکے ہشام کے پاس ارسال کی تھیں[۳]۔

ابوھاشم عبداللّٰہ بن محمد بن علی متوفی ۹۹ھ انھوں نے خود احادیث کو قلم بند کیا تھا اور حدیثوں کے کئی مجموعے ان کے پاس تھے، انتقال کے وقت انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری یہ ساری کتابیں محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے پاس بھیج دی جائیں[۴]۔

عبداللّٰہ بن ہُرمز متوفی ۱۰۰ھ انھوں نے خاص طور پر حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثوں کو قلم بند کیا تھا[۵]۔

عبیداللّٰہ بن ابی رافع کا انتقال ۸۰ھ کے قریب ہوا، یہ حضرت علیؓ کے کاتب تھے حضرت معاویہ اور حضرت علی کے درمیان ہونے والی جنگوں پر کتاب لکھی تھی[۶]۔

عبیدہ بن عمرو السلمانی عہد رسالت میں ایمان لائے لیکن شرف صحبت حاصل نہیں ہوا، عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مخصوص تلامذہ میں تھے انکے پاس احادیث کے بہت سے مخطوطے تھے اور اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے تھے[۷]۔

عروہ بن الزبیر بن العوام متوفی ۹۳ھ ان کا شمار مدینہ منورہ کے اجلّہ علماء میں تھا، انھوں نے امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث کو ان

---

۱. تہذیب التہذیب ج:۶،ص ۳۸۹۔
۲. مسند احمد بن حنبل ج ۲ص ۱۹۲۔
۳. مسند احمد بن حنبل ج ۵ص ۳۱۰۔
۴. طبقات ابن سعد ج:۵،ص:۲۴۱،تہذیب التہذیب ج:۶،ص:۱۶۔
۵. مسند احمد بن حنبل ج ۲ص ۵۳۱۔
۶. تہذیب التہذیب ج ۷ص ۱۰،۱۱،المعجم الکبیر (طرانی) ج اصفحات ۱۰۹،۲۱۵،۲۲۷۔
۷. طبقات ابن سعد ج ۶ص ۶۳،تہذیب التہذیب ج ۷ص ۸۴۔

کی زندگی میں ہی قلم بند کرلیا تھا، حضرت عائشہؓ کو بھی ان کے لکھنے کی خبر تھی، ایک دن انھوں نے عروہ سے بلا کر پوچھا کہ تم میری حدیثوں کو لکھتے ہو؟ تو انھوں نے کہا، ہاں لکھتا ہوں تو اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے کہا **لا باس بذلك**[۱] حضرت عروہؓ اپنی تمام اولاد کو بھی ابواب فقہیہ کی ترتیب پر حدیث پڑھاتے تھے، اور دوسرے شاگردوں کو سامنے بٹھا کر حدیثوں کا املاء کراتے تھے، لکھ لینے کے بعد دوبارہ ان کو سنتے تھے انھوں نے بہت سی تالیفات بھی مرتب کی تھیں جیسے **السیرۃ النبویہ** اس کے اجزاء حدیث کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں[۲]۔

عطاء بن ابی رباح وہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ حدیثوں کا املاء کراتے تھے[۳]۔

عکرمہ مولٰی ابن عباسؓ متوفی ۱۰۵ھ ابن عباس کے ممتاز شاگردوں میں ہیں ابن عباس کے علوم کی ان کے پاس بہت سے کتابیں موجود تھیں[۴]۔ عکرمہ کی کتابوں سے نقل لینے والوں میں ایوب[۵] سختیانی، جابر ابن زید[۶]، حسین بن قیس سلمہ[۷] بن وہرام، عثمان بن غیاث کے نام ملتے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز امیر المومنین جنھوں نے سب سے پہلے علماء کو احادیث جمع کرنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی، انھوں نے خود حدیثیں لکھی ہیں[۸]۔

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ کی پروردہ ہیں ۹۸ھ میں انتقال کیا، اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو خاص طور پر حکم دیا تھا کہ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن سے مل کر ان کی حدیثوں کو قلم بند کرلیا جائے[۹]، اس کے علاوہ انھوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کرائے تھے[۱۰]۔

قاسم بن محمّد بن ابی بکر الصدیق متوفی ۱۰۵ھ جن لوگوں کو انھوں نے حدیثیں املا کرائی ہیں ان میں طلحہ بن عبدالملک الایلی[۱۱] اور ابوبکر بن محمد بن

---

۱ الکفایہ ص ۲۰۵۔ ۲ المعجم الکبیر، مسند احمد بن حنبل، فتوح البلدان وغیرہ۔
۳ سنن دارمی ص ۶۹۔ ۴ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۵۔
۵ دراسات ج ۱ ص ۱۶۱۔ ۶ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۹۳۔
۷ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۳۔ ۸ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۱۴۷۔
۹ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۷۶۔ ۱۰ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۵۳۔
۱۱ صحیح بخاری فتح الباری ج ۱ ص ۱۰۴ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۳۵۳ سنن دارمی ص ۱۰۸۔

حزم[۱] کے بھی نام ہیں۔

کثیر بن مرة الحضرمی کا انتقال ۷۵ھ کے قریب ہوا ہے، اکابر صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے جن اہل علم کو حدیثیں لکھ کر ارسال کرنے کا حکم بھیجا تھا ان میں ان کا بھی نام ہے اور انھوں نے صحابہ سے سنی ہوئی حدیثوں کو لکھ کر رکھا تھا ان کو نقل کر کے بھیج دیا[۲]۔

مجاهد بن جبر المکی کی وفات ۱۰۲ھ میں ہوئی، مشہور مفسر قرآن ہیں، عبداللہ بن عباس کی تفسیری روایتوں کے جامع ہیں وہ ابن عباس کی خدمت میں تختیاں اور قلم لے کر حاضر ہوتے تھے اور جو سنتے تھے اس کو لکھتے جاتے تھے[۳] مجاہد کی تفسیر میں ایک کتاب بھی ہے[۴] مجاہد کی روایتوں کو جن حضرات نے لکھا ہے ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ ابن ابی نجیح[۵]، ابن جُریج[۶]، سفیان بن عیینہ[۷]، الحکم بن عُتیبہ، قاسم بن ابی بزہ[۸]، لیث بن ابی سلیم[۹]، مجاہد کے مخطوطے سے یہ حضرات نقل کرتے تھے۔

ابن الحنفية محمد بن علی ابن ابی طالب متوفی ۸۳ھ

احمد بن مہدی کا بیان ہے کہ عبدالاعلیٰ کی ابن الحنفیہ سے روایتیں ان کی کتاب سے ہیں[۱۰]۔

محمع بن کبشه انصاری متوفی ۱۰۰ھ کوفہ میں قیام پذیر تھے، اہلِ علم ان سے فتاویٰ لکھتے تھے[۱۱]۔

معاذه بنت عبدالله العدديه کی وفات ۸۳ھ میں ہوئی، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ سے روایت کی ہے ان کی حدیثیں یزید الشک ابوقلابہ اور قتادہ کے پاس لکھی ہوئی تھیں[۱۲]۔

۱۔ دراسات ج ۱ ص ۱۶۳۔
۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۳۹۔
۳۔ طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۵۷۔
۴۔ تفسیر طبری بحوالہ دراسات۔
۵۔ فہرست ابن ندیم ص: ۳۳۔
۶۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۵۴۔
۷۔ حوالہ مذکور۔
۸۔ کتاب الثقات ص ۵۸۵ بحوالہ دراسات۔
۹۔ بحوالہ دراسات ج: ۱، ص: ۱۶۵۔
۱۰۔ بحوالہ دراسات۔
۱۱۔ تعجیل المنفعۃ ص ۳۷۵۔
۱۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۲، الکفایہ ص ۲۲۹۔

مغیث ابن سمی الاوزاعی کی وفات ۸۰ھ کے قریب ہوئی، ابن معین نے لکھا ہے کہ ان کے پاس حدیثوں کا ایک مخطوطہ تھا[۱]۔

مقسم بن بحیرہ کا انتقال ۱۰۱ھ میں ہوا ان کے پاس حدیثوں کا ایک مخطوطہ تھا جس سے الحکم اور عثمان المشاہد نے نقل کیا[۲]۔

معطور الحبشی ابوسلام شامی تابعی ہیں ان کی وفات ۱۰۰ھ میں ہوئی ان کی لکھی ہوئی حدیثیں تھیں اس کتاب سے وہ اپنے تلامذہ کو املاء کراتے تھے[۳]۔

ھند بنت الحارث الفراسیہ ۱۰۰ھ میں انتقال کیا، امہات المومنین سے روایت کرتی ہیں ان کی حدیثوں کو امام زہری نے لکھا ہے[۴]۔

ھشام بن عروہ کی بیان کردہ حدیثوں کو بہت سے لوگوں نے لکھا تھا وہ اپنے مخطوطے لے کر آتے اور ان کو سنا کر اجازت لیتے اور وہ اجازت دیتے تھے[۵]۔

یحییٰ ابن جزار العرنی آپ کی وفات ۸۰ھ میں ہوئی اکابر صحابہ سے روایت کی ہے ان کی حدیثوں کو کتابوں میں لکھنے والوں میں حکم بن عتیبہ بھی ہیں، حسن بن عمارہ کا بیان ہے کہ الحکم نے یحییٰ کی احادیث پر مشتمل کتاب مجھے دی اور میں نے اس کو حفظ کیا[۶]۔

امام ابن شھاب زھری کا انتقال تو ۱۲۴ھ میں ہوا لیکن صحابہ سے حدیثیں انھوں نے سب کی سب پہلی صدی کے آخر میں سنی ہیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے **اول من دوّن الحدیث**، انھوں نے احادیث کے اتنے مخطوطے لکھے کہ ان کو منتقل کرنے کے لئے کئی اونٹوں پر بار کیا گیا[۷]۔

حجت تمام ہو چکی

میں نے آپ کے سامنے پہلی صدی ہجری میں حدیثوں کے لکھنے سے متعلق

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۵۵۔ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۴۳۴۔
۳۔ تاریخ ابن ابی خیثمہ ج ۳ ص ۵۸ بحوالہ دراسات۔ ۴۔ بخاری کتاب الاذان ۱۵۷۔
۵۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۳۹۔ ۶۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۰۵، ۳۰۶۔
۷۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶۔

شہادتیں پیش کی ہیں جو اس بات کو آئینہ کر دیتی ہیں کہ پہلی صدی ہجری رخصت ہونے کے لئے جب رخت سفر باندھتی ہے تو جہاں وہ ایک ایک صحابی کو اپنا رفیق سفر بنا لیتی ہے وہیں حدیث کی ساری امانتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو سپرد کی تھیں صحابہ کرام مکمل طور پر آنے والی نسلوں کو سپرد کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے اور حدیث کا سارا سرمایہ کلی طور پر پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ مستقبل کے حوالے کیا جا چکا تھا، میری پیش کردہ شہادتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ پادر ہوا ہو جاتا ہے کہ پہلی صدی میں حدیثیں نہیں لکھی گئیں۔ اب یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صداقت و دیانت و رانسانیت و شرافت کے سارے تقاضوں سے محروم ہے کیوں کہ ان شہادتوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے احادیث کے اتنے مخطوطے تیار ہو چکے تھے کہ ان کا شمار کرنا بھی مورخین کے لئے ممکن نہیں رہ گیا ہے اور پھر اسی احتیاط کے ساتھ ان اکابر امت کے پاس حدیثوں کا ذخیرہ پہنچا جنھوں نے ان کو کتابی شکل میں ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا جو آج ہمارے سامنے ہے۔

فجزاهم الله خير الجزاء

ایک قدیم ترین مجموعۂ حدیث کا تعارف

کتابُ السّنن، مؤلفه امام الحافظ المتقن الثبت سعید بن منصور بن شعبه الخراسانی المکی متوفی ۲۲۷ ھ

سعید بن منصور کی کتاب السنن کا مخطوطہ بارہ صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا، پہلی بار یہ کتاب ۱۹۶۸ء میں علمی دنیا کے سامنے آئی، اس کتاب کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ حدیث کے تمام مجموعوں بالخصوص صحاح ستہ سے بہت پہلی کی تصنیف ہے۔

اس کتاب کی دریافت سے مستشرقین کا وہ اعتراض پادر ہوا ہوجاتا ہے جو وہ کیا کرتے تھے کہ صحاح ستہ کو مؤلفین نے اپنے اقول لکھ کر ان کے ساتھ فرضی سندیں جوڑ دی ہیں، کتاب السنن کے مخطوطہ نے یہ دریافت کردیا کہ صحاح ستہ کے مؤلفین نے جو روایتیں بیان کی ہیں اور اپنی سندوں میں جو نام لیئے ہیں وہ سب حقیقی ہیں اور ان سے پہلے کے محدثین اور اہل علم نے انھیں سندوں سے وہی روایتیں بیان کی ہیں۔

کتاب السنن کے مؤلف اور جامع اپنے دور کے مشہور محدث سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی ثم مکی ہیں۔

سعید بن منصور

سعید بن منصور کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ **الامام الحافظ، شیخ الحرم سعید بن منصور ابوعثمان الخراسانی المروزی ثم البلخی ثم المکی المجاور مؤلف کتاب السنن،** ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم اور محدثین کے نزدیک ان کا کیا مقام و مرتبہ تھا انھوں نے اپنی پوری زندگی علم حدیث کی خدمت کے لئے وقف کر

رکھی تھی، ان کی علمی زندگی ک زمانہ دوسری صدی ہجری کا نصف آخر ہے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انہوں نے حدیثوں کے سماع میں صرف کیا۔

علمی اَسفار

ان کی ولادت خراسان کے ایک مقام جوز جان میں ہوئی، بچپن کا زمانہ بلخ میں گذرا وہیں سے تعلیم کا آغاز بھی ہوا اور پھر سن شعور کے بعد دور دراز کے مختلف علاقوں میں جا کر اس دور کے مشہور محدثین سے حدیثوں سماع کیا اور پوری پابندی اور احتیاط کے ساتھ جمع کرتے رہے، علم حدیث حاصل کرنے کے سلسلے میں انھوں نے بہت سے اسلامی شہروں کا سفر کیا ہے، خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام، جزیرہ کے تو مسلسل سفر کئے اور ہر جگہ سے وہاں کے مشہور محدثین سے استفادہ کیا اور ان کو قلمبند کرتے رہے۔

شیوخ حدیث

ان کے شیوخ حدیث کی فہرست بہت طویل ہے، علامہ ذہبی نے ۱۳۱ شیوخ حدیث کے نام لکھے ہیں، ابوالحجاج یوسف المزّی المتوفی ۷۴۲ھ نے ۴۷ محدثین کے اسماء گرامی کی نشاندہی کی ہے جن سے سعید بن منصور نے حدیثوں کا سماع کیا ہے جن سے بہت ہی ممتاز اور مشہور محدثین کے نام ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

امام دارالہجرۃ مالک بن انس صاحب مؤطا، لیث بن سعد، فلیح بن سلیمان، ابوعوانۃ الوضاح، حماد بن زید، ابوالاحوص، فضیل بن عیاض، سفیان بن عیینہ، ابومعشر السندی، سوید بن ابی ثور، ہُشیم، حزم بن ابی حزم، مہدی بن میمون، حدیج بن میمون، عبداللہ بن جعفر المدینی، جریر بن عبدالحمید، معتمر بن سلیمان، ابن ابی ذئب، عبداللہ بن المبارک، اور اسمٰعیل بن علیہ وغیرہ۔

تلامذہ

ان سے روایت کرنے والے ان کے تلامذہ کی فہرست بہت ہی پرشکوہ ہے اس

فہرست میں امت اسلامیہ کے جلیل القدر محدثین اور ائمہ فن کے اسماء گرامی شامل ہیں، علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ان سے روایت کرنے والے ۲۲۳ محدثین کے نام لکھے ہیں اور یوسف المزی نے ۴۵ محدثین کے نام شمار کرائے ہیں اس فہرست کے ممتاز ترین ناموں میں سے چند درج ذیل ہیں۔

امام احمد بن حنبل صاحب المسند ،امام ابوداؤد السجستانی صاحب السنن، امام مسلم القشیری صاحب الجامع الصغیر، امام ابومحمد الدارمی، محمد بن یحییٰ الذہلی ، بشیر بن موسیٰ، ابوزرعۃ الدمشقی، ابوحاتم الرازی، علی بن عبدالعزیز البغوی، ابن سحاق التستری، احمد بن نجدۃ بن العربان الہروی۔ یہی احمد بن نجدۃ سعید بن منصور سے ان کی کتاب السنن کے راوی ہیں، ان کے علاوہ ایک دوسرے محدیث محمد بن علی بن زید الصائغ بھی سعید بن منصور سے ان کی کتاب السنن کی روایت کرنے والے ہیں اور آج علمی دنیا کے سامنے کتاب کا جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ انہیں موخر الذکر راوی کی روایت سے ہے۔

ائمہ فن رجال کی رائیں

سعید بن منصور کی شخصیت، فن اسماء الرجال کے اماموں اور محدثین کی نگاہوں میں ممتاز ترین شخصیت تھی، جس نے بھی ان کا ذکر کیا ہے بڑی عظمت کے ساتھ کیا ہے خود ان کے معاصرین نے ان کے بارے میں بلند کلمات استعمال کئے ہیں، میں بہت ہی اختصار کے ساتھ سعید بن منصور کے معاصرین سے لے کر بعد کے دور تک کے تذکرہ نویسوں کی رائیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جن سے محدثین کے درمیان ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشہور مؤرخ ابن السعد الکاتب صاحب الطبقات الکبریٰ متوفی ۲۳۰ھ ان کے معاصرین میں ہیں کیونکہ ان کے تین سال پہلے سعید بن منصور کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی ہے، انہوں نے اپنی مشہور عالم کتاب ''طبقات بن سعد'' میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

''سعید بن منصور کی کنیت ابوعثمان ہے ان کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی[۱]''

امام بخاری صاحب الجامع الصحیح نے ان کا زمانہ پایا ہے کیونکہ سعید بن منصور کی وفات کے ۲۹ سال بعد امام بخاری کا ۲۵۶ھ میں انتقال ہوا ہے، انھوں نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں ان کے متعلق لکھا ہے۔

''سعید بن منصور نے مکہ مکرمہ میں ۲۲۹ھ کے آس پاس وفات پائی ان کی کنیت ابوعثمان ہے، مکہ میں سکونت اختیار کرلی تھی حدیث کا سماع ان کو عبداللہ ابن ایاد، حجر بن الحارث سے حاصل ہے[۲]''

امام بخاری نے جب ''التاریخ الکبیر'' کی تلخیص کر کے ''التاریخ الصغیر'' مرتب کی تو اس میں سعید بن منصور کی وفات ۲۲۷ھ ہی تحریر کی ہے یہی تمام مستند مورخین نے بھی لکھی ہے، بخاری نے ان کے بارے میں ''الثبت'' کا لفظ استعمال کیا ہے یہ دونوں بیانات اس لئے اہمیت رکھتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات سعید بن منصور کے معاصر اور ہم زمانہ ہیں اس لئے ہم اسماء الرجال کی دوسری مشہور اور مستند کتابوں سے کچھ دوسری تفصیلات بھی ترتیب زمانہ کے لحاظ سے پیش کرتے ہیں۔

امام بخاری کے بعد ابوحاتم رازی متوفی ۲۷۷ھ محدث رے کا زمانہ آتا ہے انھوں نے بذات خود سعید بن منصور سے حدیث کا سماع کیا ہے اس لئے ان کو ذاتی واقفیت ہے ان کے صاحبزادے ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ کے نام مشہور ہیں۔ وہ سعید بن منصور کے بارے میں اپنے والد ابوحاتم رازی کی روایت بیان کرتے ہیں۔

''سعید بن منصور کی کنیت ابوعثمان ہے، مکہ میں قیام تھا اور وہیں انتقال فرمایا ہے، میرے والد (ابوحاتم رازی) اور ابوزرعہ محدث دونوں کی روایت ہے کہ ہم سے عبدالرحمٰن نے بیان کیا، انھوں نے حرب ابن اسمٰعیل سے سنا انھوں نے مجھ سے کہا کہ امام ابن حنبل جب سعید بن منصور کا ذکر آتا تھا تو ان کی بڑی

۱۔ طبقات بن سعد ابن سعد الکاتب متوفی ۲۳۰ھ ج ۵ ص ۵۰۲

۲۔ التاریخ الکبیر امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ ج ۲ ر ۱ ص ۲۷۴ نمبر شمار ۱۷۲۲۔

تعریفیں کرتے تھے، انھیں دونوں کی روایت ہے کہ محمد بن عبداللہ بن نمیر سے سعید بن منصور کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ثقہ ہیں، عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ میرے والد نے بھی ان کو ثقہ کہا ہے[۱]''

ابن ابی حاتم کے بعد ابن الجوزی کا زمانہ آتا ہے ان کا سال وفات ۵۹۷ھ ہے ان کی کتاب ''المنتظم'' جو اب تک پندرہ جلدوں میں چھپ چکی ہے بقیہ جلدیں زیر طباعت ہیں، ابن الجوزی نے ان شاگردوں کی نشاندھی کی ہے، مثلاً۔

(۱) شمار نمبر ۱۹۱ عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن لاحق البزار نے سعید بن منصور سے سماع کیا۔

(۲) شمار نمبر ۲۱۶ جعفر ابن محمد بن القعقاع ابو محمد البغوی سُرّ من رای میں رہتے تھے اور سعید بن منصور سے سنی ہوئی روایتوں کو بیان کرتے تھے۔

(۳) شمار نمبر ۲۴۲ محمد بن خلیفہ بن صدقہ ابو جعفر المعروف بہ عنبر و یرعاقولی کے باشندے تھے انہوں نے سعید بن منصور سے روایت کی ہے۔

اس کے بعد ابوالحجاج یوسف المزیّ کا دور آتا ہے جن کا سال وفات ۷۴۲ھ ہے انہوں نے اپنی ضخیم ترین اور مشہور ترین کتاب تہذیب الکمال میں سعید بن منصور کا مفصل ذکر کیا ہے جس کا نمبر شمار ۲۳۶۱ ہے انہوں نے سعید بن منصور کے ان شیوخ حدیث میں سے ۴۷ کے نام لکھے ہیں جن سے سعید بن منصور نے حدیثوں کا سماع کیا ہے اور ان کی روایتیں اپنے مجموعۂ حدیث میں لائے ہیں اور پھر اس کے بعد سعید بن منصور سے روایت کرنے والوں میں ۴۵ مشہور تلامذہ کے اسماء گرامی لکھے ہیں جن میں سے بہت سے عالم اسلام کے نامور محدثین میں سے ہیں اور آج تک علمی دنیا ان کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکی ہے اور نہ ہو سکتی ہے[۲]۔

علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ میں سعید بن منصور کا ذکر کرتے

۱؎　کتاب الجرح والتعدیل (ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ ج ۲ ص ۶۸ (قسم اول)

۲؎　تہذیب الکمال ابوالحجاج یوسف المزی متوفی ۷۴۲ھ ج ۱۱ ص ۷۷ تا ص ۸۲ شمار نمبر ۲۳۶۱۔

ہوئے لکھا ہے۔

''سعید بن منصور بن شعبہ الحافظ الامام الحجۃ ابو عثمان المروزی ثم الطالقانی ثم البلخی المجاور بمکۂ ''کتاب السنن'' کے مولف ہیں ان کو امام مالک، فلیح بن بن سلیمان، لیث بن سعد، عبداللہ بن اباد، ابو معشر السندی، ابو عوانۃ الوضاح اور ان کے طبقہ سے سماع حاصل ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابوبکر الاثرم، امام مسلم القشیری، امام ابوداؤد، بشر بن موسیٰ، ابو شعیب الحراتی، محمد بن علی الصائغ کے علاوہ اور دوسرے بہت سے لوگ[۱]''

علامہ ذہبی نے سعید بن منصور کی عظمت وجلالت علمی کے سلسلہ میں اکابر محدثین اور ائمہ اسماء الرجال اور ائمہ جرح وتعدیل کے بہت سے اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں وہ لکھتے ہیں:

سلمہ بن شعیب کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل کے سامنے سعید بن منصور کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ان کی بڑی تعریف کی اور ان کی عظیم علمی خدمات کا ذکر کیا مشہور محدث ابوحاتم رازی نے بیان کیا کہ: ''ھو ثقۃ من المتقنین الاثبات ممن جمع و صنف[۲]''

حرب الکرمانی سعید بن منصور سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں ان کا بیان ہے کہ سعید بن منصور نے ہم لوگوں کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں[۳]۔

مشہور مؤرخ اسلام اور محدث ومفسر حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں سعید بن منصور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سعید بن منصور مشہور کتاب السنن کے مصنف ہیں، ان کے فضل وکمال میں کچھ ہی لوگ ان کے دور میں ان کے شریک وسہیم ہیں ان کی وفات مکہ مکرمہ

۱؎　تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷۔

۲؎　تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷۔

۳؎　البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ ج ۱۰ ص ۲۹۹۔

میں ۲۲۷ھ میں ہوئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے قدماء کی کتابوں میں سعید بن منصور سے متعلق جتنی تفصیلات ہیں ان کو سمیٹ لیا ہے اور ان کا تذکرہ بہت ہی مفصل لکھا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے نام ونسب اور سکونت کا ذکر کرنے کے بعد ان کے شیوخ حدیث اور سعید بن منصور سے روایت کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ان محدثین وعلماء فن اسماء الرجال کے اقوال نقل کئے ہیں جنھوں نے سعید بن منصور کی عظمت وجلالت علمی کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا ہے، اسی سلسلہ میں سعید بن منصور کی اس خصوصیت بیان روایت میں احتیاط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اگر اپنے مجموعہ حدیث کی کسی روایت میں ایک لفظ بھی مشکوک ہو گیا تو پھر وہ اس روایت کو ہمیشہ کیلئے ترک کر دیتے تھے اور اس کو کبھی بیان نہیں کرتے تھے[۱]۔

ابن حبان متوفی ۳۵۴ھ صاحب کتاب الثقات اور ابن العماد الحنبلی متوفی ۱۰۸۹ھ صاحب شذرات الذہب نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں سعید بن منصور کا ذکر بڑی عظمت واہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

وفات

زندگی کے آخری ایام آپ نے ہر طرف سے قطع تعلق کرکے مکہ مکرمہ میں بسر کئے، یہیں انہوں نے اپنی کتاب السنن کو مرتب کیا، ان سے کتاب السنن کے سماع کرنے والے یہیں آتے رہے، اس کے بعد پھر کبھی مکہ مکرمہ سے باہر نہیں گئے۔ اسی مقدس سرزمین اور مقدس مشغلہ میں رہتے ہوئے ۲۲۷ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، عام مؤرخین کے یہاں یہی سال وفات ہے، صرف امام بخاری نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر میں ان کا سال وفات ۲۲۹ھ لکھا ہے، لیکن قطعیت کے ساتھ نہیں لکھا ہے اور شک وشبہ کا اظہار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب آپ نے التاریخ الصغیر لکھی تو اس

---

[۱] تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی ج۴ص ۸۹، ۹۰۔

میں انہوں نے ان کا سال وفات ۲۲۷ھ ہی لکھا ہے جو عام مؤرخین لکھتے رہے ہیں[۱]۔

کتاب السنن مستند کتاب ہے

یہ کتاب دنیا میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق و تعلیق و تحشیہ کے بعد مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی جب کہ یہ کتاب دوسری صدی کے آخر یا تیسری صدی کے آغاز میں تصنیف کی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضمانت ہے کہ جس مخطوطہ کی بنیاد پر یہ کتاب شائع کی گئی ہے وہ مشہور محدث سعید بن منصور کی کتاب ہے اس لئے اس کتاب کو مستند ہونے کے لئے سند کی ضرورت ہے اور یہ نا قابل تردید دلائل سے ثابت کر دیا جائے کہ یہ کتاب جس مخطوطہ سے نقل کر کے شائع کی گئی ہے وہ درحقیقت وہی روایات ہیں جن کو اس کے جامع سعید بن منصور نے اپنے تلامذہ کے سامنے بیان کیا ہے اور پھر ان کے تلامذہ نے یکے بعد دیگرے آنے والی نسلوں کے سامنے ان روایتوں کو بیان کیا ہے، اگر یہ سلسلۂ سند قابل اعتماد اور ثقہ راویوں کے ذریعہ کاتب مخطوطہ تک پہنچتا ہے تو یقینی طور پر اس مخطوطہ کو سعید بن منصور کی کتاب تسلیم کیا جا سکتا ہے چونکہ سعید بن منصور مشہور محدث ہیں، اسماء الرجال اور تذکرہ کی تمام کتابوں میں ان کا مفصل ذکر موجود ہے اس لئے ان کی روایتوں کو درجہ اعتبار حاصل ہو جائے گا۔

ہم اسی نقطۂ نگاہ سے اس مخطوطہ کے سلسلہ سند پر نظر ڈالتے ہیں، اسماء الرجال کی

---

[۱] سعید بن منصور کے تفصیلی حالات کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھی جائیں۔ سیر اعلام النبلاء (علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ) ج ۱۰ ص ۵۸۶ تا ۵۹۰۔ تہذیب التہذیب الکمال (ابوالحجاج یوسف المزی متوفی ۷۴۲ھ) ج ۱۱ ص ۷۷ تا ۸۲۔ تذکرۃ الحفاظ (علاہ ذہبی) ج ۲ ص ۴۱۶، ۴۱۷، طبقات ابن سعد (ابن سعد الکاتب متوفی ۲۳۰ھ) ج ۵ ص ۵۰۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت پہلا ایڈیشن، التاریخ الکبیر (امام بخاری) القسم الاول من الجزء الثانی مطبوعہ حیدرآباد ص ۵۱۶۔ کتاب الجرح والتعدیل (ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ) ج ۴ ص ۶۸۔ البدایہ والنہایہ (حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ) ج ۱۰ ص ۲۹۹۔ شذرات الذہب (ابن العماد الحنبلی متوفی ۱۰۸۹ھ) ج ۲ ص ۶۲۔ میزان الاعتدال (علامہ ذہبی) ج ۲ ص ۱۵۹۔ تہذیب التہذیب (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ) ج ۴ ص ۸۹، ۹۰۔ العبر (علامہ ذہبی) مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء ج ۱ ص ۳۱۴۔

متعدد مستند کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب السنن کی سعید بن منصور سے روایت کرنے والے دو محدث ہیں، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی دونوں نے صراحتاً یہ نام لکھے ہیں ایک احمد بن نجدۃ بن العربان ہیں اور دوسرے راوی محمد بن علی بن زید الصائغ ہیں چونکہ بعد کا سلسلہ سند مؤخر الذکر راوی سے چلتا ہے اس لئے ہم اسمار الرجال کی کتابوں سے ان کا تعارف پیش کرتے ہیں۔

رجال سند

مطبوعہ کتاب السنن کے آغاز میں جو سند مذکور ہے وہ اس طرح ہے:

اخبرنا الشیخ الحافظ ابوالبرکات عبدالوهاب بن المبارك بن احمد، ابن الانماطی، قال، انبانا الثقة ابوطاهر احمد بن الحسن الباقلانی الکرخی، قال انبانا ابوعلی الحسن بن احمد بن ابراهیم بن الحسن بن محمد بن شاذان قراءة علیه وانا اسمع، فقال اخبرنا ابو محمد دعلج السجستانی قال، اخبرنا محمد بن علی بن زید الصائغ، قال، حدثنا سعید بن منصور، قال، باب الحث علیٰ تعلیم الفرائض ...... الیٰ آخرہٖ.

اس سلسلہ سند میں سعید بن منصور سے روایت کرنے والے محمد بن علی بن زید الصائغ ہیں ان کا سعید بن منصور سے روایت کرنا ثابت ہے جیسا کہ علامہ ذہبی اور حافظ بن حجر عسقلانی دونوں کے یہاں یہ صراحت ملتی ہے دونوں کے الفاظ یہ ہیں:

محمد بن علی بن زید الصائغ واحمد بن نجدة بن العربان وهما راویا کتاب السنن عنه[1].

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ابن زید الصائغ مؤلف کتاب سعید بن منصور سے اس کتاب کے روای ہیں اس لئے اب یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ ابن الصائغ کون ہیں؟ اور ان کا علمی مقام ومرتبہ کیا ہے اور اہلِ علم میں ان کی روایتون کا کیا درجہ ہے،

---

[1] سیر اعلام النبلاء (ذہبی) ج ۱۰ ص ۵۸۹، تہذیب التہذیب (حافظ ابن حجر عسقلانی) ج ۴ ص ۸۹۔

اس پر مختصر طور سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔

محمد بن علی بن زید الصائغ اپنے دور کے محدث تھے، مکہ میں سکونت تھی، حجاز کے متعدد محدثین نے ان سے روایت کی ہے، ان روایت کرنے والوں میں امام طبرانی اور دعلج کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان دونوں نے ان سے روایتیں لی ہیں، مشہور محدث امام طحاوی نے بھی ان سے روایت کی ہے ان کا پورا نام ابوعبداللہ بن محمد بن علی بن زید الصائغ المکی ہے ان کو محدث مکہ کہا جاتا تھا، ذی قعدہ ۲۹۱ھ میں وفات پائی، بعض مؤرخین نے ان کا سال وفات ۲۹۰ھ بھی لکھا ہے[۱]، انھوں نے براہ راست مؤلف کتاب سعید بن منصور سے اس کتاب کی روایت کی ہے پھر ان سے روایت کرنے والے دعلج بن احمد بن دعلج ہیں۔

ان کو پورا نام ونسب دعلج بن احمد بن دعلج المعدل ابومحمد وابواسحاق السجستانی ہے۔ حدیث کے سماع کے لئے مختلف مقامات کے سفر کئے پہلے وہ خراسان گئے پھر رے، حلوان، بغداد، بصرہ، اور مکہ مکرمہ کے علمی اسفار کئے اور وہاں کے محدثین کے حلقوں میں بیٹھ کر ان سے حدیثوں کا سماع کیا، معاشی اعتبار سے بہت خوشحال اور فارغ البال تھے، حسن سلوک اور خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے، علم حدیث حاصل کرنے والوں کی مدد کے لئے جائدادیں وقف کر رکھی تھیں، آخر دور میں مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی ان کے شیوخ حدیث میں عثمان بن سعید الدارمی، حسن بن سفیان الفسوی، ابن البراء، محمد بن ابراہیم البوشنجی، عبداللہ بن احمد بن حنبل، محمد بن ربح البزار، محمد بن علی بن زید الصائغ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

خود دعلج سے روایت کرنے والوں میں ابن حیویہ، امام دارقطنی، ابن رزقویہ ابوالقاسم علی بن بشران، عبدالملک بن بشران وغیرہ کے نام اسماء الرجال کی کتابوں میں ملتے ہیں، دعلج ائمہ اسماء الرجال نے نزدیک، ثقہ، ثبت، مامون ہیں، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ہم نے اپنے شیوخ حدیث میں ان سے ''اثبت'' نہیں دیکھا، آپ کی

---

[۱] سیر اعلام النبلاء (علامہ ذہبی) چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۶ء ج ۱۳ ص ۴۲۸، ۴۲۹۔

وفات مکہ مکرمہ میں ۳۵۱ھ میں ہوئی[1]۔

مذکورہ بالا دعلج سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے حسن بن احمد بن ابراہیم ہیں پورا نام الحسن بن احمد بن ابراہیم ابن الحسن بن محمد ابن شاذان البزار ہے آپ کی ولادت ۳۳۹ھ میں ہوئی انہوں نے جن شیوخ حدیث سے روایتوں کا سماع کیا ہے ان میں عثمان بن احمد الدقاق، النجاد، الخلدی کے اسماء گرامی شامل ہیں، ابن الجوزی نے ان کو ثقہ صدوق لکھا ہے، ذہبی نے ان کا بیان لکھا ہے کہ ایک دن ایک نوجوان آیا اس نے کہا کہ شیخ محترم! میں نے رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپ نے فرمایا کہ اپنی بات ابوعلی ابن شاذان سے پوچھ لو، اور جب ان سے ملاقات کرو تو ان کو میری طرف سے سلام کہہ دینا، یہ کہہ کر نوجوان چلا گیا اور ابوعلی پر گریہ طاری ہو گیا، روتے جاتے تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ میرا کوئی ایسا اچھا عمل نہیں ہے کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلام پانے کا مستحق سمجھا جاؤں سوائے اس کے کہ میں قرأت حدیث میں شب و روز حدیث میں مشغول رہتا ہوں اور جب جب ذکر پاک آتا ہے تو بار بار آپ پر درود پڑھتا رہتا ہوں۔

اس واقعہ کے بعد وہ زیادہ دنوں تک دنیا میں نہیں رہے دو یا تین مہینے کے بعد سفر آخرت کے لئے رخت سفر باندھ لیا ان کا سال وفات ۴۲۶ھ ہے[2]۔

انھوں نے سعید بن منصور کی کتاب السنن کی روایت دعلج سے کی ہے اور ابن شاذان البزاز سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے احمد بن الحسن الباقلانی ہیں۔

علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے **"الشیخ الامام المحدیث الحجة ابوطاهر احمد بن الحسن بن احمد بن الحسن ابن خدادا د الکرجی الباقلانی البغدادی"** ذہبی نے ان کو ثقہ صالح لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ زہد و تقویٰ میں مشہور تھے ان کو حدیث کا سماع ابوعلی شاذان،

---

[1] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) چوتھا ایڈیشن ج۱۶ ص۳۰.

[2] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) ج ۱۷ص ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷۔

ابوالقاسم بن بشران، اور ابوبکر البرقانی سے حاصل ہے اور ان سے روایت کرنے والے عبدالوہاب وغیرہ ہیں۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ ہمارے شیخ عبدالوہاب فرمایا کرتے تھے کہ امام باقلانی جمعہ کو پورے دن مصروف عبادت رہتے تھے، اصحاب حدیث اور اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے ''من السبت الی الخمیس''، تعلیم وتدریس سنیچر سے جمعرات تک بس، جمعہ کا دن میرا اپنے خاص دن ہے، نماز وتلاوت کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتے تھے اور جامع مسجد میں بھی جمعہ کے دن حدیث کی قرأت نہیں کرتے تھے، بغداد میں سکونت تھی جب نظام الملک بغداد آیا تو اس نے چاہا کہ بغداد کے تمام محدثین سے حدیث کا سماع کرے اس لئے اس نے تمام محدثین کے ساتھ امام باقلانی کو بھی بلایا کہ ان کے محل پر آ کر حدیث کی قرأت کریں، مگر وہ نہیں گئے، بہت اصرار کیا مگر وہ اپنی بات پر قائم رہے، یہاں تک کہ ۴۸۹ھ میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے[۱]۔

امام باقلانی سے کتاب السنن کی روایت کرنے والے عبدالوہاب بن المبارک ہیں، یہ امام ابن الجوزی کے شیخ اور استاذ ہیں ان کا ذکر علامہ ذہبی نے ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔

''الشيخ الامام الحافظ المفيد الثقة المسند بقية السلف ابوالبركات عبدالوهاب بن المبارك بن احمد بن الحسن بن بندار البغدادى الانماطى''

ان کو جن شیوخ سے حدیث کا سماع حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں، ابومحمد الصریفینی، ابوالحسن بن النقود، ابوالقاسم ابن البسری، ابونصر الزینبی وغیرہم ان کے علاوہ دوسرے شیوخ حدیث سے بھی ان کو سماع حاصل ہے، بہت ہی متقی، صاحب زہدوورع تھے، اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتے تھے، ابن الجوزی ان کے بارے میں صحیح السماع، ثقة ثبت کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کا

---

[۱] سیر اعلام النبلاء (ذهبی) ج ۱۹ ص ۱۴۴.

بیان ہے کہ میں ان کے سامنے حدیث کی قرأت کرتا تھا تو وہ روتے جاتے تھے، مجھے ان کے بیان سے زیادہ ان کے رونے سے علمی فائدہ پہنچا میں نے ان سے اتنا استفادہ کیا کہ اس کے مقابلے میں دوسروں سے کچھ حاصل نہیں کیا میں ان کی خدمت میں ان دنوں حاضر ہوا جب وہ انتہائی لاغر ہو چکے تھے ان کی وفات ۱۱ رمحرم ۵۳۸ھ میں ہوئی[۱]۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس مخطوطہ کا کاتب کون ہے؟ اور قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں تفصیل پیش ہے، کتاب السنن کے مخطوطہ کے کاتب محمد بن احمد بن علی الخطیب الدمشقی ہیں جنھوں نے ربیع الاول ۷۲۵ھ میں اس کی کتابت سے فراغت حاصل کی انہوں نے جس مخطوطہ سے اسے نقل کیا ہے وہ انہیں مذکورہ بالا عبدالوہاب ابن المبارک کی روایت سے ہے کاتب نے ان کی مکمل سند کو ابتداء میں نقل کر دیا ہے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

اگر چہ عبدالوہاب ابن المبارک اور کاتب مخطوطہ کے زمانہ میں ۱۸۷ سال کا فرق ہے لیکن کاتب کے سامنے جو مخطوطہ ہے وہ عبدالوہاب کا مستند مخطوطہ ہے اس لئے اس پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اب اسی مخطوطہ کی بنیاد پر کتاب السنن کی طباعت ہوئی جو آج علمی دنیا کے سامنے ہے۔

طرزِ تصنیف

کتاب السنن دنیا میں پہلی بار ۱۹۶۸ء میں محدیث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق و تعلیق و تحشیہ کے بعد مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے دو جلدوں میں شائع کی گئی، اس کی کل روایتوں کی تعداد ۲۹۲۸ ہے، اس کا طرز تحریر صحاح ستہ سے قدرے مختلف ہے اگر چہ اس کی ترتیب ابواب فقہیہ کے طرز پر ہے، چونکہ کتاب السنن کا مخطوطہ نامکمل دریافت ہوا ہے، اس لئے کتاب الطہارۃ کتاب الصلوٰۃ وغیرہ کے ابواب نہیں ہیں اہل علم نے مسائل ومباحث کو مدنظر رکھ کر شائع کردہ ایڈیشن کو تیسری

---

[۱] سیر اعلام النبلاء (ذہبی) ج ۲۰ ص ۱۳۴، ۱۳۵۔

جلد قرار دیا ہے اور اسی کو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے۔

اس کا پہلا حصہ علم الفرائض اور کتاب الوصایا سے شروع ہوتا ہے ان ابواب کی روایتوں کا سلسلہ ۱۲۰ صفحات تک چلا گیا ہے، احادیث کے مجموعوں میں علم الفرائض اور کتاب الوصایا سے متعلق اتنا بڑا ذخیرہ کسی کتاب میں یکجا نہیں ہے، فرائض کے باب کی ابتداء میں خارجہ بن زید بن ثابت کی روایت میں کہا گیا ہے کہ علم الفرائض پر سب سے مفصل کلام زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا ہے پھر ان کی بیان کردہ تفصیلات کو مسلسل دس صفحوں میں بیان کیا گیا ہے اس باب پر تقسیم وراثت کی سیکڑوں شکلیں بیان کی گئی ہیں اور صورت میں کس کا کتنا حصہ ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے، کتاب الفرائض میں سوائے چند مرفوع روایتوں کے بقیہ پورے باب میں صرف صحابہ کرام، تابعین اور فقہاء کے اقوال و آثار، فتاویٰ، بیانات، توضیحات اور مقدمات کے فیصلے ہیں اور ہر بات کو مولف نے پوری سند کے ساتھ بیان کیا ہے اس لئے یہ تفصیلات بطور حجت کہیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر پہلی صدی ہجری کے آخر تک روزمرہ کی زندگی میں تقسیم وراثت کی جتنی صورتیں سامنے آئیں ان میں خلیفہ وقت، قاضی، یا جس فقیہ کے سامنے صورت حال پیش کر کے شرعی حکم معلوم کرنا چاہا انھوں نے اس صورت خاص میں شریعت کا فیصلہ بتادیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کے واقعات اور فیصلے زیادہ ہیں ان کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت عثمان بن عفانؓ، زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ کے فیصلے اور فتاوے کثرت سے ہیں تابعین میں حسن بصری، مسروق بن الاجدع، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، محمد بن سیرین، مجاہد، اور قاضی شریح کے فیصلے، فتاوے، اقوال و آرا ہیں، ان آثار سے اس دور کے مسائل روزمرہ کی زندگی کے حوادث و حالات اور معاشرہ کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے، فقہ کی کتابوں میں امکانی اور فرضی صورتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام بیان

کیئے گئے ہیں ان روایتوں میں حقیقی واقعات کے وجود میں آنے پر شریعت کا حکم بیان کیا گیا ہے، کچھ ایسے مسائل بھی پیش آجاتے تھے کہ اس کی نظیر عہد رسالت میں نہیں تھی اس لئے ان مسائل میں بھی شریعت کا حکم متعین کرنا ضروری تھا، صحابہ کرام اور فقہاء نے ان تمام مسائل میں شریعت کا حکم متعین کیا کیونکہ نظیر کی عدم موجودگی میں وہ اجتہاد سے کام لیتے تھے جس کا دروازہ شریعت میں کھلا ہوا ہے۔

تقسیم وراثت میں ایک بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ سامنے آیا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ ایک ''خنثیٰ مشکل'' وراثت کا دعویدار ہوا، فقہاء کے یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کولڑکے کا حصہ دیا جائے یا لڑکی کا؟ دونوں کے حصے میں بہت بڑا فرق ہے، اس کا تعین کیسے ہو؟ ابوزیاد کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تھا اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے، اہل علم سے مشورے کیئے، مگران کے پاس بھی اس کا کوئی حل نہیں تھا، ایک اہل علم سے مشورے کیئے، مگران کے پاس بھی اس کا کوئی حل نہیں تھا، ایک اہل علم نے کہا کہ مسئلہ کا حل جابر بن زید کے پاس ہوسکتا ہے، اتفاق سے وہ ان دنوں جیل میں تھے، ان کو جیل سے رہا کیا گیا اوران کو مجلس میں بلا کر ان کے سامنے صورت حال پیش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ مخنث کو ایک دیوار کے متصل کھڑا کر دو اور اس سے پیشاب کرنے کے لئے کہا جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا پیشاب دیوار پر گرتا ہے تو اس کولڑکا تسلیم کیا جائے اورلڑکے کا حصہ دیا جائے گا، اوراگر اس کا پیشاب اس کی رانوں پر گرتا ہے تو اس کولڑکی مان کر لڑکی کا حصہ دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ان مسائل کی جن کی نظیر پہلے دور میں نہیں ملتی، غرضیکہ بعد کے دور میں فرائض سے متعلق بہت سی شکلیں اور صورتیں سامنے آئیں اگر بہ نظر غائر ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بہت سی صورتوں کا ہو بہو جواب مل جائے گا، فرائض اور وصیت کی روایات کتاب کے ایک تہائی حصہ میں ۱۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ان ابواب کی روایتوں کی تعداد ۴۸۶ ہے۔

کتاب النکاح و کتاب الطلاق

اس کے بعد کتاب النکاح اور پھر کتاب الطلاق آتی ہے ان دونوں ابواب میں بھی مرفوع روایتوں کی تعداد بہ نسبت آثار و اقوال صحابہ و تابعین کے بہت کم ہے، صحابہ کرام اور تابعین، تبع تابعین اور فقہاء کے فتاوے، اقوال و آثار اور فیصلے زیادہ ہیں مسلم معاشرہ میں جو واقعات ظہور پذیر ہوتے تھے اگر اس میں حکم شرعی معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تو فریقین یا کوئی ایک فریق خلیفہ، قاضی، یا کسی فقیہ کے پاس جاتا اور صورت حال پیش کر کے شرعی حکم معلوم کرتا تھا تو اس کو شرعی فیصلہ بتا دیا جاتا تھا اس طرح سیکڑوں اور ہزاروں واقعات ان روایتوں کے ذریعہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں اور ان کے بارے میں شرعی احکام کا علم ہو جاتا ہے، نکاح و طلاق کی بے شمار شکلیں اور صورتیں پیدا ہوئیں بعض بہت پیچیدہ شکلیں بھی سامنے آئیں جن کی نظیر عہد رسالت میں موجود نہیں تھی مگر فقہائے صحابہ و تابعین کی دوربین نگاہوں نے ان کا شرعی حل تلاش کر لیا۔ روایتوں کا جائزہ لینے سے اس دور کی تہذیب، سماجی حالات اور مسلم معاشرہ میں روز مرّہ کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں اور اس دور میں ظہور پذیر ہونے والے بہت سے واقعات ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں، کتاب النکاح اور کتاب الطلاق میں جن صحابہ، تابعین، قاضیوں اور فقیہوں کے اقوال و آثار، فتاوے اور فیصلے آئے ہیں ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ، عمر بن الخطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ، عثمان بن عفانؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوالدرداءؓ، ابوایوب انصاریؓ، ابوہریرہؓ، محمد بن مسلمہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کے نام بار بار آتے ہیں، ان کے علاوہ بعض بعض جگہ کچھ دوسرے صحابہ کے بھی اقوال ہیں۔ تابعین میں جن حضرات کے نام بہ کثرت آئے ہیں ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیا ہیں۔

طاؤس بن کیسان، عامر بن شراحیل شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن سعید، یزید بن

میسرہ، ابوقلابہ، جابر بن سعید، ابومسلم الخولانی، مکحول، قاضی شریح، حسن بصری، عطاء بن ابی رباح، سعید بن مسیّب، عکرمہ، علقمہ، مجاہد وغیرہ۔

نکاح وطلاق کی سیکڑوں صورتیں ایسی سامنے آئیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح حکم نہیں تھا، ان میں غور وفکر اور اس اجتہاد کی ضرورت تھی جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر توصیف فرمائی تھی، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن بھیجا جارہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر تمہارے سامنے لوگوں کے مقدمات ومعاملات آئیں تو تم کیسے فیصلہ کروگے؟ جواب دیا کہ قرآن سے، حضورؐ نے فرمایا اگر قرآن میں نہ ملا تو پھر کیا کروگے؟ تو جواب دیا سنت رسولؐ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا، پھر حضورؐ نے سوال فرمایا کہ اگر در پیش صورت حال کا جواب قرآن اور حدیث دونوں میں نہیں ملا تب تم کیا کروگے؟ اس کے جواب میں معاذ بن جبلؓ نے فرمایا۔

اجتھد برائی ولا الو. میں انتہائی غور وفکر سے کام لوں گا اور منشاء شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا حضورؐ کے الفاظ ہیں۔

الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ لما یرضیٰ بہ رسول اللّٰہ[۱] خدا کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے خدا کا رسول خوش ہوتا ہے۔

کتاب السنن کی روایات وآثار سے اجتہاد کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے حدود وشرائط کیا ہیں؟ صحابہ وتابعین کے سیکڑوں اقوال وآثار ان کی نشاندہی کرتے ہیں، نکاح وطلاق کی ایسی ایسی صورتیں سامنے آئیں کہ عقل چکرا جاتی ہے لیکن شریعت کے مزاج داں اہل علم نے ان مسائل کا حل پیش کیا اور آج وہ فیصلے اور حل ہمارے لئے دلیل وحجت ہیں اور پوری ملت اسلامیہ کا ان پر

---

[۱] مشکوٰۃ باب العمل فی القضاء ص ۳۲۴.

عمل ہے کیونکہ وہ سب کے سب حدیث وقرآن کی منشا کے مطابق ہیں اور امت اسلامیہ کے سامنے ایک ایسی روشن اور صاف شاہراہ آجاتی ہے جس پر چلنے میں کوئی خطرہ نہیں رہتا۔

کتاب النکاح کے صفحات ۱۳۴ روایتوں کی تعداد ۵۶۸ ہے کتاب الطلاق کے صفحات ۱۲۷ اقوال وآثار اور روایتوں کی تعداد ۱۲۴۷ ہے، مطبوعہ کتاب السنن کی دوسری جلد کے آغاز میں کتاب الطلاق ہی کی روایتیں ہیں جو ۱۲۲ صفحات تک چلی گئی ہیں اس کے بعد کتاب الجہاد شروع ہوتی ہے اور اسی پر کتاب تمام ہوجاتی ہے، اس کے صفحات ۲۵۵ ہیں اور روایتوں کی تعداد ۶۷۹ ہے اس طرح پوری کتاب میں روایتوں کی تعداد ۲۹۷۸ ہوجاتی ہے، اس میں سب سے زیادہ طلاق سے متعلق روایتیں ہیں اس کی روایتوں کی تعداد دوسرے ابواب کی روایتوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں۔

کتاب الجہاد

کتاب الجہاد کے ابتدائی ابواب میں بہ نسبت دوسرے ابواب کے مرفوع روایتوں کی تعداد قدرے زیادہ ہے، اسی کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت کے واقعات وحوادث، قوانین واحکام فیصلے اور فتاوے، اصول وضوابط زیادہ ہیں کیونکہ عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور بہت سے ایسے حالات پیش آئے جو عہد رسالت اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ڈھائی سالہ دور خلافت میں نہیں پیش آئے ان حالات میں شریعت کی منشا کے مطابق اصول وضوابط بنانے کی ضرورت تھی، حضرت عمرؓ کے اجتہاد اور صحابہ کرام کی بصیرت دونوں نے مل کر ایسی بہت سی صورتوں میں فیصلے کئے جن کی نظیر پہلے موجود نہیں تھی ان مسائل سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ اسلامی تمدن کے تقاضے اور ضرورت تھی۔

اسلامی دعوت کو لے کر عساکر اسلامیہ مختلف ملکوں میں پھیل گئیں تو مجاہدین برسوں اپنے اہل وعیال سے دور رہنے لگے جب کہ انسان کے کچھ طبعی وفطری تقاضے

بھی ہوتے ہیں جن سے چشم پوشی ممکن نہیں تھی حضرت عمرؓ نے اس پہلو پر بھی نظر ڈالی اور اس کا ضابطہ مقرر کر دیا۔ **باب الغازی یطیل غیبۃ من اھلہٖ** میں کئی روایتیں اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں، میں یہاں بطور مثال صرف دو روایتیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تا کہ معاشرہ کی ضرورت اور حالات کی مجبوریوں میں قوانین کی ضرورت کا اندازہ ہو سکے۔

ایک روایت ہے، حضرت عمر فاروقؓ رات کے وقت مدینہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے ان کے ساتھ عبداللہ بن ارقم بھی تھے، انھوں نے کچھ دور پر تاریکی میں ایک سایہ سا دیکھا تو عبداللہ سے کہا کہ جا کر دیکھو کہ یہاں تنہا اندھیرے میں کون کھڑا ہے اور کیوں کھڑا ہے، عبداللہ گئے، دیکھا کہ ایک عورت تن تنہا کھڑی ہے، عبداللہ نے جا کر پوچھا تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اس نے بڑے غصہ میں کہا کہ تم اور تمہارے ساتھی جو وہاں ہیں کیوں کھڑے ہیں؟ عورت جانتی تھی کہ جو تھوڑی دوری پر کھڑے ہیں وہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروقؓ ہیں جن کے نام سے بڑے بڑے دل گردے والوں کے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے، لیکن عورت نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اور اس نے بہت ہی گرم لب ولہجہ میں کہا کہ عمر فاروقؓ کو کیا حق ہے کہ میرے شوہر کو ایک سال سے جہاد پر بھیج رکھا ہے؟ جیسے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہی نہیں ہے، عبداللہ نے واپس آ کر حضرت عمرؓ کو پوری بات بتا دی دوسرے دن انھوں نے محاذ پر حکم بھیج کر اس کے شوہر کو واپس بلا لیا۔

اس کے بعد ایک روایت میں جو واقعہ ہے اس نے حضرت عمرؓ کو مجبور کر دیا کہ مجاہدین کے لئے ڈیوٹی اور رخصت کے لئے کچھ اصول بنائیں اور کچھ ہدایات جاری کر دیں جن کی پابندی ہر مجاہد کے لئے ضروری ہو، یہ روایت اس پہلو پر روشنی ڈالتی ہے، روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ حسب معمول شب میں گشت پر تھے گلیوں میں گھوم پھر کر پہرہ دے رہے تھے، جب ایک گھر کے سامنے پہنچے تو اس گھر سے آواز آ رہی تھی کوئی عورت یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

تَطَاوَلَ هٰذَا اللَّيْلُ وَاسْوَدَّ جَانِبُهُ وَطَالَ عَلَىّ الاَّ خَلِيْلَ اُلَاعِبُهُ
فَوَاللّٰهِ لَوْلَا خَشْيَةُ اللّٰهِ وَحْدَهُ لَحُرِّكَ مِنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهُ

حضرت عمراس وقت تو واپس چلے آئے اور صبح کو اس گھر اور اس کے رہنے والوں کے بارے میں تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ اس عورت کا شوہر ایک سال سے جہاد میں ہے، آپ نے عورتوں کے ذریعہ معلومات حاصل کیں کہ عورت زیادہ سے زیادہ کتنے عرصہ تک بغیر شوہر کے گذار سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ٦ ماہ ہے، آپ نے تمام عساکر اسلامیہ میں یہ حکم جاری کردیا کہ کوئی مجاہد مسلسل ٦ ماہ سے زیادہ ڈیوٹی پر نہ رہے، اس کو رخصت لے کر اپنے اہل وعیال میں آنا ضروری ہے،

میں نے بطور مثال ان دو روایتوں کو آپ کے سامنے پیش کیا جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کتاب الجہاد کے بیشتر ابواب میں اسی طرح کے حالات ومسائل پیش آئے ہیں جن کے لئے اصول وضوابط بنانے کی ضرورت تھی، حضرت عمر نے اپنے دس سالہ عہد خلافت میں جو کارنامے انجام دیئے اور جن مسائل کو حل کیا جو قانون وضوابط بنائے ان روایتوں میں ان کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

کتاب الجہاد کے آخر میں **باب جامع الشهادة** ہے اس میں متفرق اور مختلف حوادث وواقعات جو اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان کا ذکر آیا ہے اور ان واقعات وحوادث سے متعلق روایتیں ہیں، جیسے خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کا محاصرہ، صحابہ کے خیالات وجذبات تعاون کی پیشکش وغیرہ، باغیوں نے گھر میں گھس کر شہید کردیا اس واقعہ کی تفصیلات پر مشتمل متعدد روایتیں ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں واقع حروب الروۃ کی روایتیں، غزوہ احزاب، غزوہ احد وغیرہ سے متعلق روایتیں اس باب میں ہیں، غرضیکہ اس عنوان کے تحت ایسی روایتیں جمع کی گئی ہیں جو مولف کے نزدیک کسی خاص عنوان کے تحت نہیں آسکتی تھیں، دوسری جلد کی سب سے آخری روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کا واقعہ ہے اور مدینہ میں داخلہ کی تفصیلات ہیں اور اسی روایت پر کتاب تمام ہوجاتی ہے۔

مصنف عبد الرزاق کی کتابُ الجامع کا قضیہ دلائل وشواہد کی روشنی میں

محدث کبیر حافظ ابوبکر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ کی مشہور عالم کتاب ''المصنف'' جس میں اکیس ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں ۱۹۷۲ء میں پہلی بار محدث جلیل ابوالمآثر حضرت العلامہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق اور تعلیق وتحشیہ کے ساتھ شائع ہوئی تو پوری علمی دنیا میں انتہائی عزت واحترام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا، قدر ومنزلت کے ہاتھوں سے لی گئی، عقیدت وشوق کی نگاہوں سے پڑھی گئی، روایتوں کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ امت کی نگاہوں سے اوجھل تھا جب مولانا اعظمی کی سالہا سال اور شبانہ روز کی جاں سوزی اور جدوجہد کے بعد منظر عام پر آیا تو عالم اسلام ہی نہیں یورپ کے علمی حلقوں میں بھی حیرت واستعجاب کے ہاتھوں لیا گیا، ہر علمی مجلس میں اس کا تذکرہ، علم حدیث کی ہر مقدس محفل میں اس کا ذکر خیر چل پڑا اور مولانا مرحوم کی علمی شہرت کو جیسے شہپر جبریل مل گیا اور پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام انتہائی عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہوگئی۔

اعتراض کا ایک پہلو

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی علمی تحقیق کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا، گفتگو کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل سکتا ہے اور کچھ ذہنوں میں شک وارتیاب کی گنجائش نکل سکتی ہے، ''المصنف'' کی اشاعت کے بعد بھی ایک ایسا پہلو نکل آیا اور اس پر گفتگو چل پڑی، المصنف کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کا ایک مکتوب ایک رسالہ میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

''مصنف'' کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی ہے اور اس کے

آڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو انتباہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے"

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب عرصہ دراز سے فرانس میں مقیم ہیں اور حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے کے فرد فرید ہیں اور مخلصانہ علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور آج عالم اسلام میں مخطوطات و آثار کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں اور ساری دنیا میں مخطوطات کی تلاش و جستجو میں سفر کرتے رہتے ہیں، مخطوطات کے بارے میں ان کی رائے دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور دلائل میں وزن ہوتا ہے اس لئے آسانی کے ساتھ رد نہیں کیا جا سکتا، مکتوبات نبوی کی دریافت اور ان کی تحقیق کے سلسلہ میں وہ عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور یورپ کے محققین سے علمی و تحقیقی جنگ لڑتے رہتے ہیں اور فتح وظفر کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، فرانسیسی، انگریزی، عربی اور اردو میں اس موضوع پر ان کے مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں وہ ایک خاص موضوع ''کتبات مدینہ'' پر لکچر کے لئے بلائے جاتے ہیں۔

مولانا اعظمی کا جواب

جب ڈاکٹر صاحب موصوف کا ''مصنف'' کے بارے میں یہ مکتوب شائع ہوا اور مولانا اعظمی کی نگاہوں سے گذرا تو مولانا نے اس کے جواب میں ایک مختصر مضمون لکھا جس میں ڈاکٹر حمید اللہ کے موقف کی تردید فرمائی جب کہ ان کی مکتوب میں اپنے شک وشبہ کے دلائل وشواہد پیش نہیں کئے گئے تھے، صرف ایک دعویٰ تھا دعوی کی بنیاد کیا تھی اس کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا تھا اس لئے مولانا موصوف کا جواب اس اظہار شک پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکا اور مولانا موصوف ڈاکٹر صاحب کو مطمئن نہ کر سکے مولانا مرحوم نے اپنے مختصر مضمون میں کتاب الجامع جو مصنف عبدالرزاق کی دسویں جلد کے صفحہ ۳۱۳ حدیث نمبر ۱۹۴۱۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۶۸ پر ختم ہوتی ہے پھر گیارہویں جلد میں حدیث نمبر ۱۹۷۳۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۴۷۱

حدیث نمبر۲۱۰۳۳ پرتمام ہوتی ہے اور مصنف عبدالرزاق کی تقریباً ڈیڑھ جلدوں میں ایک ہزار چھ سو چودہ حدیثوں کا مجموعہ ہے اس کو ڈاکٹر صاحب نے معمر کی کتاب الجامع قرار دیا تھا، مولانا اعظمی نے اس حصہ کو مصنف ہی کا ایک حصہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ مولانا موصوف نے اپنے مضمون میں اپنے موقف پر درج ذیل دلائل وشواہد پیش کئے تھے۔

۱-مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو مصنف عبدالرزاق کا ہی ایک حصہ قرار دینے پر پہلی دلیل کے طور پر شیخ محمد سعید سنبل کی کتاب الاوائل کا حوالہ دیا ہے اور ان کی یہ عبارت نقل کی **وبالسند المتقدم الی الامام الحجة عبدالرزاق الصنعانی اخبرنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللّٰہ عنه قال،کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الی انصاف اُذنیه، وھو اُخر مصنفه.**

یہ روایت مصنف عبدالرزاق میں شامل کتاب الجامع کی آخری روایت ہے اور شیخ سعید سنبل نے اس کو مصنف کی آخری حدیث لکھا ہے یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب الجامع مصنف ہی ایک جزء ہے اسی لئے انھوں نے یہ عبارت لکھی **وھو اٰخر مصنفه.**

۲- دوسری دلیل میں آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب بستان المحدثین کے ایک اندراج کو پیش کیا ہے، شاہ صاحب کی عبارت یہ ہے۔

’’طرفہ این است کہ مصنف خود را ختم کردہ است بشمائل، وشمائل راختم برذکر موئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کردہ می گوید **حدثنا معمر عن ثابت عن انس رضی اللّٰہ تعالٰی عنه، قال، کان شعر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم الیٰ انصاف اذنیهٖ.**

شاہ صاحب نے بھی کتاب الجامع کی اس آخری حدیث کو مصنف کی آخری حدیث قرار دیا ہے یعنی انہوں نے بھی کتاب الجامع کو مصنف ہی کا جزء تصور کیا۔

۳- مولانا نے تیسری دلیل یہ دی ہے کہ مصنف کے آخری حصہ میں شامل کتاب الجامع اگر معمر بن راشد کی ہوتی تو اس میں وہ روایتیں نہ ہوتیں جنھیں عبدالرزاق

نے اپنے دوسرے شیوخ سے لیا ہے اس داخلی شہادت کے سلسلہ میں مولانا نے مصنف کی دسویں جلد کی سات روایتیں اور گیارہویں جلد کی ۲۸ روایتیں پیش کی ہیں، ان روایتوں کو عبدالرزاق نے معمر کے بجائے اپنے دوسرے شیوخ حدیث سے لیا ہے اگر یہ حصہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو ۳۵ روایتوں کے اس میں شامل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی نہیں ہے بلکہ مصنف ہی کا ایک جزء ہے اس لئے مصنف کے ساتھ کتاب الجامع کے شائع ہونے پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عبدالرزاق کی کوئی کتاب الجامع ہے؟ تا کہ اس کو عبدالرزاق کی کتاب الجامع تسلیم کرلیا جائے؟ اس سلسلہ میں مولانا اعظمی نے کشف الظنون کا حوالہ دیا ہے اور تحریر فرمایا کہ اس میں عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر موجود ہے اس کے علاوہ مصر کے نوادسید اور شیخ ناصر الدین البانی کے حوالے سے مولانا نے بتایا کہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے اور نوادسید کی یہ تصریح بھی نقل کی ہے کہ اس مخطوطے پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع درج ہے اس کے علاوہ اور دوسرے سماعات کا بھی اندارج ہے۔

کیا جواب اطمینان بخش ہیں

مولانا اعظمی کا مضمون انھیں دلائل وشواہد پر مشتمل تھا لیکن کیا یہ جوابات ایک محقق عالم کے لئے تسلی بخش ہیں اور وہ مطمئن ہوجائے گا؟ مجھے اس میں شک ہے کیونکہ مولانا اعظمی نے اپنے ثبوت میں جن دو بزرگوں کے نام لئے ہیں یعنی شیخ سعید بن سنبل اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہا اللہ ان دونوں کا مقام ومرتبہ عظمت واحترام اپنی جگہ مسلم ہے علم حدیث کی خدمات اور اس کی نشر واشاعت میں ان کی جدو جہد سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا شمار متاخرین میں ہے، مخطوطات ابھی عام نہیں تھے اور ہر عالم کی رسائی وہاں تک مشکل

بھی تھی اس لئے ایسے تحقیق طلب مسئلہ میں ان کی رائے میں وہ وزن نہیں ہوگا جو ایک محقق اور مخطوطات کے ذخیروں سے واقف شخص کے لئے اطمینان بخش ہو، دوسری بات یہ کہ ان دونوں حضرات نے اس سلسلہ میں کوئی تحقیق نہیں فرمائی کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد کی ہے یا عبدالرزاق کی؟ بس اتنا ہوا کہ مصنف عبدالرزاق کے متداول نسخوں میں ضمیمہ کے طور پر کتاب الجامع لکھی ہوئی ملی اس لئے انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ بھی مصنف ہی کا ایک حصہ ہوگا، اس لئے انھوں نے حوالے میں مصنف عبدالرزاق کا نام لے لیا، اور کتاب الجامع کو ذیلی عنوان کے طور پر تسلیم کر لیا کسی نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ عبدالرزاق کی ایک کتاب الجامع ہے جو مصنف کے آخر میں لکھی ہوئی ہے۔ اور معمر بن راشد کی یہ کتاب الجامع نہیں ہے، اس لئے اس موضوع پر گفتگو کی گنجائش اب بھی باقی رہ جاتی ہے اور یہ کوئی قطعی ثبوت نہیں بن رہا ہے کہ مصنف کے آخر میں عبدالرزاق کے استاد معمر بن راشد کی کتاب الجامع نہیں ہے بلکہ خود عبدالرزاق کی اپنی کتاب الجامع ہے۔

تیسری داخلی شبہات میں ۳۵ روایتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر یہ معمر کی کتاب الجامع ہوتی تو اس میں یہ روایتیں کیوں ہیں؟ جب کہ عبدالرزاق نے ان روایتوں کو دوسرے شیوخ حدیث سے لیا ہے، یہ داخلی شہادت شک وشبہات سے خالی نہیں ہے ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاد معمر کی کتاب الجامع کو اپنی کتاب مصنف کا ضمیمہ بنایا تو جس باب سے متعلق ان کو اپنے دوسرے شیوخ سے جو روایتیں ملیں ان کو اس موقعہ پر لکھ دیا ہوگا، تاکہ مسئلہ زیر بحث پر اور روشنی پڑ جائے یہی وجہ ہے کہ ان روایتوں کی تعداد بہت محدود ہے کیونکہ کتاب الجامع میں ایک ہزار چھ سو چودہ روایتیں ہیں اس کے مقابلے میں دوسرے شیوخ کی روایتیں صرف ۳۵ ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عبدالرزاق نے اپنے استاذ کی کتاب میں بہت زیادہ اضافہ پسند نہیں کیا ہوگا اس لئے گنتی کی چند روایتوں پر اکتفا کیا، اس لئے مولانا اعظمی کے ان دلائل وشواہد کے باوجود بحث اب بھی تشنہ رہ گئی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا جوابی مضمون

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بحث کو اٹھایا تھا کہ مصنف کے آخر میں جامع معمر شائع ہوگئی ہے جب کہ وہ ایک مستقل کتاب ہے اور دوسرے کی ہے اسے المصنف کے ساتھ نہیں شائع ہونا چاہئے تھا اور اگر شائع کرنا تھا تو وہاں یہ وضاحت ضروری تھی کہ بطور ضمیمہ معمر کی کتاب الجامع مصنف کے عام مخطوطوں میں ملتی ہے اس لئے ہم بھی مصنف کے آخر میں اس کو شائع کر رہے ہیں، اسی اعتراض کے پیش نظر مولانا اعظمی نے کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف قرار دینے کی سلسلے میں اپنے مضمون میں دلائل دیئے تھے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ان دلائل سے مطمئن نہیں ہوئے، مولانا اعظمی کے اس مضمون کے بعد انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنے شک وشبہ یا دعویٰ کے وجوہ واسباب پر روشنی ڈالی اور پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اپنے نقطۂ نگاہ کا پھر اعادہ کیا کہ یہ کتاب الجامع معمر بن راشد ہی کی ہے مصنف عبدالرزاق کا جزء اور حصہ نہیں ہے انھوں نے کئی ٹھوس اور مضبوط دلیلیں دی ہیں، وہ مختصر طور پر درج ذیل ہیں۔

۱- جامع معمر بن راشد کے ترکی میں دو مخطوطے ہیں جس پر نام بھی صرف جامع معمر بن راشد ہے اور جن میں مندرجات بھی ایک چھوٹی کتاب کے ہیں، جلد میں اور کوئی چیز نہیں ان میں ایک جو بہت ہی قدیم ہے ۲۶۴ھ کا لکھا ہوا ہے وہ انقرہ میں ہے، دوسرا مماثل نسخہ استانبول میں ہے ان کا ایڈیشن ایک ترکی رفیق نے اشاعت کے لئے تیار کیا ہے، انھیں مصنف عبدالرزاق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں نے جامع معمر کے ان دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق کے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ ہو بہو ایک ہی چیز ہیں، فرق ہے تو وہی جو عام طور پر ایک ہی کتاب کے دو مخطوطوں میں ہوتا ہے، مکرر عرض کرتا ہوں کہ ان دونوں مخطوطوں پر جامع معمر درج ہے جامع عبدالرزاق نہیں۔

☆☆☆

۲-مولانا اعظمی نے دو محدثین کی وضاحت کا ذکر فرمایا تھا اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے تحریر کیا کہ مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے دنیا کے مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں کتاب الجامع کتاب کے آخر میں موجود ہے اگر ایسا ہی ایک نسخہ سعید سنبل یا حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کی نظر سے گذرا ہو اور انھوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، بے خیالی میں ہر کسی سے ایسا ہی ہوسکتا ہے اگر کسی نے ان کو توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی، موجودہ صورت حال سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔

۳-مولانا اعظمی نے جو داخلی شہادت پیش کی تھی وہ بھی ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے نزدیک کوئی خاص وزن نہیں رکھتی ان کا کہنا ہے کہ اگر جامع معمر میں جو مصنف کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے لی ہیں تو اس سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (یعنی ۹½ جلدوں تک) ان میں کثرت سے حدیثیں عبدالرزاق عن معمر کی سند سے ملتی ہیں اس سے وہ جامع معمر کا جزء نہیں بن جاتیں۔ سیرت ابن ہشام میں دیکھئے ابن ہشام نے کچھ چیزیں حذف کردی ہیں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھائی بھی ہیں سیرت ابن اسحاق مطبوعہ مراکش سے اس کا پتہ آسانی سے چل سکتا ہے، ایسا بارہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کردی جائے، ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کی طرف مخطوطے میں منسوب ہوگئی ہے، ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

۴-مولانا اعظمی نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ذکر کیا تھا اور دلیل میں کشف الظنون کا حوالہ دیا تھا اور ثبوت میں مصر کے نوادسید کے اس مخطوطے کو دیکھنے کو بیان کیا تھا، اس دلیل نے بھی ڈاکٹر صاحب کو متاثر نہیں کیا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

''دمشق کے مخطوطے کو مصر کے نوادسید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ وہ انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے ناواقف تھے، ترکی کے فواد سزگئیں اشاعت کے لئے جامع معمر کو یار کرنے کے بعد دمشق گئے اور وہاں کے مخطوطے کو دیکھا پھر رباط جا کر وہاں کے بھی مخطوطے کو دیکھا، وہ اپنی جرمن کتاب ''تاریخ تالیفاتِ عربی'' میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی عبدالرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں کچھ حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ اصابہ ابن حجر جلد ۴ صفحہ ۱۳۱۱ اور صفحہ ۳۰۶ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

۵- ڈاکٹر صاحب نے مزید ثبوت اور شہادت کے طور پر آخری بات یہ لکھی ہے کہ میری دانست میں پرکھنے کا بہتر معیار یہ ہے کہ داخلی شہادت پر جائیں، معمر بہت قدیم مؤلف ہیں ان کے استاد ہمام بن منبہ کے وقت حدیثوں کے مجموعوں میں کوئی تبویب مطلق نہیں ہوتی تھی، معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں لیکن جو زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھے، ان کے شاگرد عبدالرزاق تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ، عیدین، زکوٰۃ، صیام، عقیقہ وغیرہ کی حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت وہ ذیلی ابواب دیتے چلے جاتے ہیں یہ چیزیں صرف مصنف میں ملتی ہیں۔ کتاب الجامع میں نہیں ملتیں، اس کا نہج بالکل الگ ہے اور بتویب نسبتًہ ابتدائی حالت میں ہے، مصنف میں کتاب الاشربۃ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر یعنی جامع معمر میں نہ ہوتیں اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، یہی حال مصنف میں حضرت عمر کی وصیت کا ہے جو مصنف میں ہے اور جامع معمر میں بھی ہے، اور یہ بعض دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے، ایسی اور چیزیں ملتی ہیں جو اندرونی شہادت ہیں۔

کیا یہ شواہد قول فیصل ہیں؟

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا اعظمی کی ہر دلیل کو بڑے

ٹھوس اور وزن دار دلائل کے ساتھ رد کر دیا اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں جامع معمر کے مخطوطے موجود ہیں اور وہ ہو بہو وہی ہیں جن مصنف میں بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے، اس لئے قطعیت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی اور اس کو مصنف کا ہی ایک حصہ مان کر اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب نے جامع معمر کا قدیم ترین نسخہ دریافت کر کے ایک بہت ہی بڑا اہم ثبوت فراہم کر دیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جامع معمر کا یہ مخطوط ۳۶۴ھ میں لکھا گیا ہے یعنی حضرت معمر کی وفات کے دوسو گیارہ سال بعد اس لئے قدرتی طور پر یہ خیال آتا ہے کہ اس مخطوطہ کی سند کیا ہے؟ کیا یہ معمر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے؟ اگر نہیں، تو معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور شک وشبہ کا دروازہ کھل جاتا ہے کیونکہ یہ مخطوطہ المصنف کے مرتب عبدالرزاق متوفی ۲۱۱ھ کے ۱۵۳ سال بعد لکھا گیا کیا یہ ممکن ہے کہ کسی ذہین عالم نے مصنف ہی سے اس کتاب الجامع کو نقل کر لیا ہو اور چونکہ تمام روایتیں حضرت معمر سے ہیں اس لئے اس کو جامع معمر لکھ دیا ہو، ایسی مثالیں موجود ہیں، جیسے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں سہل انگار پی ایچ ڈی کرنے والے ہوتے ہیں عرب ممالک میں بھی ایسے سہل انگار دکتورا کرنے والے بھی ہو رہے ہیں انھوں نے مصنف کی کتاب المغازی نقل کر کے اس کا نام مغازی زہری رکھ دیا اور ڈگری حاصل کر لی، اس لئے ایسی دلیل کی ضرورت ہے جس سے ثابت ہو جائے کہ یہ جامع معمر مصنف سے براہِ راست نقل نہیں کی گئی، اسی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب یہ بھی تصریح کر دیتے کہ دوسرے شیوخ حدیث سے جو ۳۵ روایتیں مصنف کی کتاب الجامع میں ہیں وہ اس مخطوطے میں نہیں ہیں اس لئے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ یہ مخطوطہ مصنف سے نہیں نقل کیا گیا ہے، پھر بھی یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ نقل کرنے میں کاتب نے بالقصد ان روایتوں کو چھوڑ دیا اور صرف حضرت معمر ہی کی روایتیں لی ہوں میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ امام عبدالرزاق کی وفات کے تقریباً ۱۶۰ سال گذر جانے پر مصنف کے بہت سے مخطوطے تیار ہو گئے اور

پوری دنیا میں پھیل گئے اور ڈیڑھ صدی بعد یہ مخطوطہ لکھا گیا تو ذہن میں اس خیال کا آنا فطری ہے کہ متداول نسخوں سے کسی نے یہ جامع معمر تیار کر دی ہے اگر اس مخطوطے پر سند ہوتی، سماعات کا اندارج ہوتا اور یہ بتا دیا جاتا کہ معمر کے کس شاگرد کی روایت پر یہ مشتمل ہے اور اس روای سے کاتب تک جتنے واسطے پڑتے ہیں اس کا ترتیب وار اندارج ہوتا تو شک وارتیاب کے دروازے بند ہو جاتے۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا اعظمی کی دوسری دلیل کو کوئی اہمیت نہیں دی جس میں کہا گیا ہے تھا کہ شیخ سنبل اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے کتاب الجامع کو مصنف کا جزء مانا ہے، ڈاکٹر صاحب کی دلیل میں وزن ہے کیونکہ ایسے اہم اور تحقیق طلب مسئلہ میں جب تک تحقیق و تفتیش کا حق ادا نہ کر لیا جائے علمی دنیا میں وہ دعویٰ قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اگر ان محدثین کے سامنے یہ مسئلہ اسی اہمیت کے ساتھ پیش کیا جاتا اور وہ دلائل وشواہد کی روشنی میں فیصلے کرتے تو یقیناً علمی دنیا میں اس رائے کو قدر و منزلت حاصل ہوتی موجودہ صورت میں کسی محقق کے لئے ان علماء کا صرف نام لے لینا کافی نہیں ہے۔

مولانا اعظمی کی تیسری دلیل میں بھی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی وزن نہیں انھوں نے متعدد مثالیں دیکر اپنے موقف کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ اور اپنے دعوے کو مضبوط بنا دیا ہے۔

چوتھی دلیل کے طور پر مولانا اعظمی نے مصر کے نواد سید کے بارے میں لکھا تھا کہ انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے مخطوطے کو دیکھا ہے اور مخطوطے کا سال کتابت بھی بتا دیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس داستان کے اگلے حصہ کو بیان کر کے حیرت زدہ کر دیا اس آخری حصہ کا مولانا اعظمی کو علم نہیں تھا ڈاکٹر صاحب نے انھیں مصر کے سید فواد اور ترکی کے فواد اور سزگین کی تصریحات کو پیش کر کے اس مشاہداتی شہادت کی قدر و منزلت کو ختم کر دیا، جواب اور جواب الجواب کی بعد بھی مسئلہ اپنی جگہ پر رہا اور کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

☆☆☆

قول فیصل

ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل وشواہد پیش کئے تو مولانا اعظمی نے ضرورت محسوس کی کہ اپنی تحقیق کو تفصیلی طور پر اہل علم کے سامنے پیش کردیں اس لئے ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں مدلل واصولی بحث کے بعد آپ نے متنازع فیہ مسئلہ پر تحقیق وتفتیش کی روشنی میں کچھ دوسرے دلائل اور کچھ نئی شہادتیں تحریر فرمائیں۔ آپ نے ایسے مخطوطات کا پتہ چلایا جو جامع عبدالرزاق کے نام سے پائے جاتے ہیں اور ان پر سماع کی تصریح راوی کے نام کی وضاحت بھی ہے مولانا اعظمی نے جس مخطوطے کو دریافت فرمایا ہے اس کے مستند اور قابل اعتماد ہونے کی شہادتیں بھی پیش کی ہیں آپ نے تحریر فرمایا کہ عبدالرزاق سے اس کی روایت کرنے والے الحافظ الحجۃ محمد بن منصور الرمادی ہیں اور یہ نسخہ اہل علم میں معروف ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کا سماع کیا اور اس کو مخطوطہ پر تحریر بھی کردیا ہے اس کے دو حصے مولانا کی نگاہ سے گذرے ہیں اس کے جزء اول کے کاتب الامام الحافظ المفید ابوالفتح نصر بن ابی الفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ ہیں اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"الجزء الاول من کتاب الجامع عن عبدالرزاق بن همام ابی بکر الصنعانی" اور یہ بھی اس مخطوطہ پر تحریر ہے کہ یہ مخطوطہ ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور ابوعلی اسماعیل بن محمد بن صالح الصفار کی عبدالرزاق سے روایت کے مطابق ہے۔ پھر عبدالرزاق کے ان شاگردوں سے جن لوگوں نے روایت کی ہے ان کے نام بھی اس پر درج ہیں اور کاتب نسخہ تک کی سند محفوظ ہے، اس کتاب الجامع کا دوسرا جزء مشہور محدث ابوالمحاسن القرشی کے قلم سے ہے اس کی بھی سند پیش کی ہے، یہ ایک بڑی شہادت ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنے اس مضمون میں پانچ ناقابل تردید دلائل وشواہد پیش کئے ہیں وہ بالترتیب درج ذیل ہیں۔

۱- جامع عبدالرزاق کا نسخہ جو ابوالفتح نصر بن ابی الفرج الحصری متوفی ۶۱۹ء کا مخطوطہ ہے اور پورا ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے ان کے ثقہ وضابط ہونے پر ائمہ رجال کا

تقریباً اتفاق ہے ان کا سماع ابن النقطہ ، ابن النجار ابن الدبیثی اور ذہبی سے ثابت ہے اور خود اپنے قلم سے اپنے سماع کے اندراجات بھی کر دیئے ہیں یہ ساری تفصیل اس مخطوطہ کے سرورق پر موجود ہے اور یہ بھی وضاحت ہے کہ اس کتاب الجامع کا ان کو خزیفہ سے سماع حاصل ہے۔

۲- انھوں نے اس مخطوطہ پر لکھا ہے کہ جامع عبدالرزاق کو جزء اول کو میں نے مشہور امام وحافظ حدیث ابوالمحاسن القرشی کے مخطوطے سے نقل کیا ہے اور ابوالمحاسن کے بارے میں ابن الدبیثی ابن الحصری اور ذہبی کی صراحت ہے کہ وہ ثقہ ہیں، حافظ حدیث ہیں، روایتوں کا سماع اور کتابت ان کا ہر شک وشبہہ سے بالا ہے ائمہ رجال نے یہ بھی غیر مبہم لفظوں میں لکھا ہے کہ وہ صحیح النقل ہیں۔ علامہ ذہبی نے "**الصالح الحافظ محدث بغداد**" کے شاندار لفظوں سے ابوالمحاسن کا تذکرہ کیا ہے، ابوالمحاسن کے مخطوطے پر یہ عبارت ہے۔

"جامع عبدالرزاق کا یہ وہ جزء ہے جس کا سماع پوری ایک جماعت کو حاصل ہے" مولانا اعظمی نے ان مشہور محدثین کے نام شمار کرائے ہیں جن کو اس مخطوطے کا سماع حاصل ہے اور مخطوطہ کے سرورق پر ان کے نام بھی ثبت ہیں ان محدثین میں عبدالوہاب ابن الصابونی متوفی ۵۵۶ھ، عبدالواحد بن حسین بن عبدالواحد البارزی متوفی ۵۶۲ھ، سماع کرنے والی جماعت میں شامل ہیں۔

۳- جامع عبدالرزاق کے اس جزء کی قرأت مشہور محدث ثابت الکیلی نے شیخ حسین بن طلحہ کے سامنے کیا اور ان سے رجب ۴۹۲ھ میں روایت کی اجازت حاصل کی اور اس کو نصر بن ابی الفرج الحصری نے اپنے قلم سے لکھا ہے، مزید توثیق کے لئے نصر الحصری نے مشہور محدث ابن الاخضر کے مخطوطے سے بھی نقل کیا ہے اور ابن الاخضر کے بارے میں ائمہ جرح وتعدیل نے **ثقةً، ثابتاً، ماموناً فی السماع، واسع الروایة،** کے الفاظ کہے ہیں، اور یہ ابن الدبیثی، ابن النجار، ضیاء المقدسی اور برزالی جیسے ائمہ فن کے شیخ اور استاذ ہیں، اس توضیح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشہور

محدثین میں امام نصر بن ابی الفرج، حافظ ابوالمحاسن القرشی، حافظ ثابت الکیلی، امام ابن الاخضر اور مسندۃ العراقی فخر السادشہدۃ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے علی بن طلحہ سے عبدالرزاق کی کاب الجامع کا سماع کیا ہے اور ہر ایک کو پورا یقین ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے اور جامع معمر نہیں ہے۔

۴- اسی طرح ایک اور محدث حافظ الحدیث عمر بن الحاجب متوفی ۶۳۰ھ کو بھی یقین کامل تھا کہ یہ مخطوطہ جس کو نصر بن ابوالفرج نے نقل کیا ہے عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے، جامع معمر بن راشد نہیں، اسی یقین کے ساتھ اس مخطوطہ کو حاصل کیا اور اس کو وقف کیا اور خود اپنے قلم سے اس پر یہ تحریر کیا۔

''میں نے اس کا مقابلہ ابن الانماطی کے مخطوطے سے کیا ہے یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے جو ''باب حب المال'' پر ختم ہوتا ہے اس کا سماع شیخۃ صالحہ شہدۃ بنت ابی الفرج الابری سے مجھے حاصل ہوا۔ شہدۃ نے ابوعبداللہ الحسین بن طلحہ سے سنا انھوں نے اس کا سماع ابوالحسین بن بشران سے کیا، انھوں نے ابواسماعیل الصفار سے انھوں نے ابوبکر الرمادی سے اور رمادی نے امام عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی سے سماع کیا''

مولانا اعظمی نے مخطوطہ کی پوری سند نقل کر کے مخطوطہ کی قدر و قیمت ہی کو واضح نہیں کر دیا بلکہ آپ نے کسی کے لئے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

۵- محدثہ شہدۃ بنت ابوالفرج کے سامنے ابوعبداللہ محمد بن الحسن بن ابی المضاء نے قرأت کی سماع کرنے والوں میں ابوالفتح نصر بن ابی الفرج ابن الحصری۔ ابوالفضائل عبداللہ بن سلامۃ بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزادے ابوالحسن علی اور دوسرے لوگ ہیں یہ قرأت وسماع ۵۷۱ھ میں ہوا اور مخطوطہ پر اس کا اندارج موجود ہے۔ عمر بن الحاجب کا یہ بھی بیان ہے کہ میں نے اس کے علاوہ ایک مخطوطہ محدث دمشق ابوالمواہب کا بھی دیکھا ہے جو یہی عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا ہے۔

مولانا کی اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ الامام الحافظ ابوالمواہب متوفی

۵۸۶ھ محدث دمشق اور الحافظ البارع مفید الشام تقی الدین ابن الانماطی المتوفی ۶۱۹ھ محدث شام اور مسند الدیار المصریہ العلامہ علی بن ہبۃ اللہ المصری المتوفی ۶۴۹ھ اور ان کے والد ابوالفضائل ہبۃ اللہ یہ تمام جلیل القدر علماء ومحدثین کو یقین کامل ہے کہ یہ عبدالرزاق کی کتاب الجامع ہے جو مصنف کے آخر میں ہے جامع معمر نہیں۔

۶- مولانا اعظمی نے مزید شہادت یہ تحریر فرمائی ہے کہ امام نصر بن ابوالفرج کے مخطوطہ پر الامام الحافظ عبدالغنی المقدسی المتوفی ۶۰۰ھ محدِث الاسلام کے ہاتھ کی تحریر ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جامع عبدالرزاق کا جزء اول ہے جو محدثۂ وقت حضرۃ شہدۃ کے سامنے پڑھا گیا، سیدہ شہدہ کو حسین بن طلحہ الفعال سے سماع حاصل ہے انھوں نے امام عبدالرزاق الصنعانی سے سماع کیا ہے اور اجازت حاصل کی ہے ان میں ابوالفتح اور ان کے صاحبزادے اور ابوالفضائل ہبۃ اللہ بن سلامہ بن مسلم المصری اور ان کے صاحبزدے ابوالحسن علی اور ان کے ملازم فرج الحلبی شامل ہیں اور ان کو سماع حاصل ہے اور یہ سماع جمادی الاولیٰ ۵۷۱ھ میں ہوا، ذہبی نے عبدالمغنی مقدسی کو محدث الاسلام لکھا ہے اور وہ کتاب الجامع کو جامع عبدالرزاق سمجھتے اور لکھتے ہیں جامع معمر نہیں۔

۷- اسی جزء کو عبدالقادر الرمادی نے سیدہ شہدۃ کے سامنے پڑھا اور ان سے اجازت حاصل کی یہ ۵۶۶ھ کا واقعہ ہے ان کو بھی اس کے جامع عبدالرزاق ہونے میں کوئی اشتباہ اور شک نہیں ہے۔ مولانا نے مزید تفصیلات دی ہیں جن سے یقین واعتماد میں اضافہ ہوتا ہے آپ نے بتایا کہ نصر بن ابی الفرج کو جامع عبدالرزاق سے غایت شغف تھا اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے دوسروں کو پڑھنے کے لئے دیتے تھے اہل علم بڑے محدثین کے سامنے پڑھ کر ان سے اجازت لیتے تھے اور یہ اہل علم اس مخطوطہ پر اپنے سماعات کو درج بھی کردیتے تھے، یہ مخطوطہ ۵۵۸ھ میں حزیفہ بن سعد کے سامنے پڑھا گیا اور انہوں نے اجازت دی ۵۵۹ھ میں عبدالواحد البارزی کے سامنے پڑھا گیا پھر سیدہ شہدۃ کے سامنے ۵۷۱ھ میں پڑھا گیا یہ تمام سماعات اس مخطوطہ پر موجود

ہیں۔ ابن ابی الفرج اتنے فیاض تھے کہ اپنا نسخہ علماء حدیث کو عاریتاً دیتے اور ان کو اجازت دے دیتے کہ وہ اپنا سماع مخطوطہ پر لکھ سکتے ہیں، ایک زمانے تک یہ مخطوطہ ان کے پاس رہا اور لوگوں کو عاریتاً دیتے رہے یہاں تک کہ حافظ الحدیث عمرو بن الحاجب الامینی کو یہ نسخہ مل گیا انھوں نے اپنی لائبریری میں اس کو داخل کر کے ہمیشہ کے لئے وقف کر دیا لیکن اس مخطوطے کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ کچھ اور آگے جاتی ہے، حافظ الحدیث احمد بن محمود الجوہری المتوفی ۶۴۳ھ اس کو مصر لے جاتے ہیں اور اس کو مشہور عالم علی ہبۃ اللہ المعروف بہ ابن الجمیزی کے گھر لے گئے جوہری نے قرأت کی ۶۲۴ھ کا ان کا سماع اس مخطوطہ پر درج ہے۔

جوہری کے الفاظ ہیں:

”قرأت هذا الجزء الاول من جامع عبدالرزاق على الشيخ على بن هبة الله المعروف بابن الجميزى“.

جوہری نے صرف جزء اول کو پڑھ کر اس کی اجازت لی تھی اب ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس کے بقیہ اجزاء کیسے حاصل ہوں اس کی تفتیش و جستجو میں لگ گئے آخر ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کا دوسرا تیسرا اور چوتھا حصہ بھی حاصل کرلیا، ان کو اپنے ہاتھوں سے نقل کیا اور جزء اول کے ساتھ جوڑ کر کتاب کو مکمل کر دیا، پھر یہ مکمل نسخہ لے کر آپ شام گئے اور مسندۃ الشام کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھ کر ان سے اجازت لی اور اپنے قلم سے نصر ابن ابی الفرج کے نسخہ کے آخری ورق پر اپنے سماع و اجازت کو لکھ دیا ان کے الفاظ ہیں:

قرأت جميع هذا الجزء الاول وما بعده من الاجزاء الاربعة وهو جميع كتاب الجامع لعبدالرزاق بن همام الصنعانى على الحرة الاصلية ام الفضل كريمة ابنة عبدالوهاب میں نے عبدالرزاق کی کتاب الجامع کے چاروں جزوں کو محدثۂ شام سیدہ ام الفضل کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے پڑھا (اس طرح انھوں نے ایک مستند محدثہ وقت سے سماع و اجازت حاصل کی)

اپنے سماع واجازت کی توضیح کے بعد علامہ جوہری نے محدثہ شام ام الفضل حضرۃ کریمہ بنت عبدالوہاب کی سند بھی تحریر کردی کہ ان کو کس محدث سے اجازت حاصل ہے اور ان لوگوں کے بھی اسماء تحریر کردئے کہ ان کو کس محدث سے اجازت حاصل ہے اور ان لوگوں کے بھی اسماء تحریر کردئے جنھوں نے سیدہ کریمہ سے ان چاروں اجزا کو پڑھ کر سند واجازت حاصل کی، یہ ۶۴۰ھ کا واقعہ ہے۔

۸- مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مخطوطہ کا ذکر کیا ہے جو بہت صاف خوشخط لکھا ہوا ہے اس کے لکھنے والے حافظ ابن حجر عسقلانی کے ممتاز شاگرد اور جلیل القدر محدث تقی الدین قلقشندی ہیں آپ نے لکھا ہے کہ میں نے خود اس مخطوطہ کو دیکھا ہے اس مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے۔

"الجزء الاول من كتاب الجامع تاليف الامام عبدالرزاق بن همام الصنعانى"

اس مخطوطہ پر سند بھی لکھی ہوئی ہے، یہ مخطوطہ عبدالرزاق کے دوشاگرد ابوبکر احمد بن منصور الرمادی اور اسماعیل الصفار کی روایت کے مطابق ہے، قلقشندی نے اپنے استاذ حافظ ابن حجر عسقلانی سے پڑھ کر اس مخطوطہ کی اجازت حاصل کی، انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اس مخطوطہ کو دوسرے لوگوں نے بھی پڑھ کر ان سے سند واجازت لی ہے ان لوگوں کے اسماء گرامی مخطوطہ پر ثبت کردیئے ہیں یہ سماع واجازت کا واقعہ ۸۴۳ھ کا ہے۔

۹- مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری شہادت یہ پیش کی ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے مصنف کے آخر میں شائع ہونے والی کتاب الجامع کو عبدالرزاق کی تصنیف مانا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور عالم کتاب فتح الباری ج ۱ ص ۸۹ پر لکھا ہے کہ:

"بخاری نے باب انشاء الاسلام من الاسلام میں حضرت عمار کی ایک موقوف روایت نقل کی ہے۔ معمر نے اپنی کتاب الجامع میں بھی موقوف ہی نقل کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت معمر سے اس روایت کو نقل کیا ہے"

حافظ ابن حجر عسقلانی نے عبدالرزاق کی روایت کے سلسلہ میں مصنف کا نام لیا ہے، اور یہ روایت مصنف کی کتاب الجامع کے آخر میں ہے یعنی ابن حجر نے اس کتاب الجامع کو بھی مصنف ہی کا ایک حصہ مانا ہے ورنہ صرف معمر کی کتاب الجامع کا حوالہ کافی تھا، عبدالرزاق کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

داستان تمام ہوگئی

میں نے اب تک آپ کو وہ روداد سنائی ہے جو مصنف عبدالرزاق میں کتاب الجامع کے شامل ہونے سے متعلق تھی، اس مسئلہ کو ڈاکٹر حمیداللہ صاحب نے اٹھایا تھا، ڈاکٹر صاحب کی علمی عظمت مسلم ہے انکی تحقیق وتفتیش کی قدر و قیمت سے پورا عالم اسلام ہی واقف نہیں ہے بلکہ یورپ کی دانشگاہوں میں بھی ان کا نام ادب واحترام سے لیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب انتہائی مخلص، بے لوث، بے غرض، متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ ان کا مقصد نہ اعتراض کرنا تھا اور نہ اپنی ہمہ دانی کا اظہار مقصود تھا، انھوں نے اپنی تحقیق وتفتیش کی روشنی میں یہ سمجھا کہ یہ مصنف کے آخر میں جو کتاب الجامع شائع ہوگئی وہ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے مصنف عبدالرزاق کا حصہ نہیں ہے ان کا یہ خیال یقین میں اس وقت بدل گیا جب انقرہ اور استانبول میں انھوں نے جامع معمر کے نام سے دو مخطوطے دیکھے، اور مصنف کی کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو دونوں میں بہت کم فرق نظر آیا اس لئے ان کو یقین ہوگیا کہ مولانا اعظمی سے چوک ہوگئی، انھوں نے زیادہ تحقیق نہیں فرمائی اگر انھوں نے مزید تحقیق وجستجو سے کام لیا ہوتا تو مصنف میں اس کو شامل نہ کرتے اور مصنف گیارہ جلدوں کے بجائے ۹½ جلدوں میں تمام ہوجاتی۔

مولانا اعظمی نور اللہ مرقدہ اگر چہ اپنے خام سفالہ پوش مکان کے نیم تاریک خلوت کدہ میں رہتے تھے اور ان کو وہ وسائل میسر نہ تھے جو ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کو حاصل ہیں مگر وہ ایسا دل ودماغ رکھتے تھے جس کو ''جام جہاں نما'' کہا جاسکتا ہے، تحقیق وتفتیش کی کوتاہی کا یہ الزام کچھ ہلکا نہیں تھا، اس سے یہ تأثر پیدا ہوسکتا ہے کہ کام سرسری

کیا گیا ہے اور تحقیق کا حق پورا پورا ادا نہیں کیا گیا ہے، اس لئے آپ نے پہلے تو ایک ہلکا پھلکا مضمون اس شک وشبہہ کے جواب میں قلمبند کر دیا، لیکن جب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے اعتراض اور شک وارتیاب کی وجوہ واسباب کو تفصیل سے بیان کیا اور اس کو رسالے میں شائع کر دیا تب مولانا مرحوم نے ایک مفصل مضمون عربی زبان میں تحریر فرمایا اور اس میں دلائل وبراہین کا انبار لگا دیا جس کی روداد میں نے آپ کو سنائی۔

ڈاکٹر صاحب کا اعتراض صرف دو مخطوطوں کی بنیاد پر تھا جو ان کو اتفاقاً مل گئے تھے انھیں کا ذکر انھوں نے بڑی شدومد سے فرمایا تھا لیکن مخطوطہ چوتھی صدی کا تھا اس لئے اس کی سند کی ضرورت تھی، کاتب کون ہے؟ کس مخطوطے سے نقل کیا گیا؟ معمر بن راشد کے کس شاگرد نے اس مخطوطہ کی روایت کی، کن لوگوں کو مخطوطے کا سماع حاصل ہے اور کس ترتیب سے یہ روایتیں موجودہ مخطوطے کے کاتب تک پہنچیں؟ اور کاتب مخطوطہ سے لے کر معمر بن راشد تک کی سند کیا ہے؟ ان تمام اہم اور ضروری پہلوؤں کو ڈاکٹر صاحب نے نظر انداز کر دیا جب کہ ان مخطوطوں کو بطور دلیل پیش کرنے کے لئے یہ توضیحات ضروری تھیں، ان کے بغیر مخطوطے کی کوئی قدر وقیمت نہیں بنتی ہے، اس کے برخلاف مولانا مرحوم نے اپنے ثبوت میں جتنے مخطوطات کو پیش کیا ہے ہر ایک کی سند عبدالرزاق تک پہنچائی ہے اور ان مستند محدثین کا نام بنام ذکر کیا جن کو مخطوطے کا سماع حاصل تھا، جن لوگوں نے شیخ کے سامنے مخطوطے کی قرأت کی، وہ تلامذہ جو اس قرأت کے وقت موجود تھے جن کو شیخ نے اجازت دی اس کو مفصل بیان کر کے دریافت کردہ مخطوطہ کی قدر وقیمت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا، مولانا کی یہ دلیل قول فیصل اور اس بحث کے لئے حرف آخر بن گئی، اس تفصیلی بیان کے بعد ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پھر دوسرا کوئی مضمون نہیں لکھا یا تو وہ مطمئن ہو گئے یا اس بحث کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھا اور خاموش ہو گئے۔

میرے نزدیک تو یہ بحث بے نتیجہ تھی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو مخطوطے دیکھے بقول ان کے ہو بہو وہی تھے جو مصنف کے آخر میں شائع شدہ کتاب الجامع میں ہے

دوجگہ لکھے جانے سے روایتوں کی صحت وصداقت پرکوئی اثرنہیں پڑتا ان کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے تھا کہ یہ عبدالرزاق کی روایت ہے اس لئے مصنف میں ہونا ہی چاہئے تھا میں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خود عبدالرزاق کا بیان ہے۔

قال عبدالرزاق کتبت عن معمر عشرة الاف حدیث. میں نے حضرت معمر بن راشد کی دس ہزار روایتوں کو قلمبند کیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ا ص ۱۹۰)

کتاب الجامع میں کل ۱۶۱۴ روایتیں ہیں جب کہ پوری مصنف میں ۲۱۰۳۳ روایتیں ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر عبدالرزاق نے معمر کی ساری روایتوں کو مصنف میں لیا ہوگا تو کتاب الجامع کے علاوہ بقیہ جلدوں میں معمر کی ۸۳۸۶ روایتیں ہوں گی اور جس روایت کو جس باب سے متعلق سمجھا وہاں ان کو درج کر دیا اور ڈیڑھ ہزار یہ متفرق روایتیں مصنف کے آخر میں آگئیں تو اس پر اعتراض کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ ساڑھے آٹھ ہزار روایتوں پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟

ہوسکتا ہے کہ مصنف کی ترتیب کے وقت عبدالرزاق نے بھی متفرقات کے طور پر اپنی کتاب الجامع کو مرتب کر کے مصنف میں شامل کر دیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب مصنف کا کوئی ایسا مخطوطہ پیش نہیں کر سکے جو کتاب الجامع سے خالی ہو اس لئے معلوم ہوا کہ عبدالرزاق کے زمانہ سے ہی یہ کتاب الجامع مصنف کا جزء رہی ہے اور وہی ابویعقوب اسحاق ابن ابراہیم الدبری اس کتاب الجامع کے بھی عبدالرزاق سے راوی ہیں جن کی روایت سے پوری مصنف مرتب ہوئی ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کو یہ اعتراض امام عبدالرزاق پر کرنا چاہئے مولانا اعظمی پر نہیں، مولانا کے دلائل وشواہد کی روشنی میں ان کے موقف کو ہر اہل علم ہر محقق صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی عظمت کا راز اسی طرح کے عظیم الشان علمی وتحقیقی کارناموں میں پوشیدہ ہے جن سے عام اہل علم کو واقفیت نہیں، اسی طرح کے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے پوری علمی دنیا مولانا مرحوم کا نام

عظمت واحترام کے ساتھ لینے پر مجبور ہے، ہم تلامذہ کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کے فیوض وبرکات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے، مگر ان کی شفقتوں اور عنایتوں کے قربان جایئے کہ جاتے جاتے بھی ہمارا سر فخر سے اونچا کر گئے اور ہمیں یہ موقعہ دے گئے کہ ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں:

اولئك ابائی فجئنی بمثلهم

إذا جمعتنا يا جرير المجامع

تاریخ طبری سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

اہل علم میں اب تک یہ بات مسلم رہی ہے کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری دونوں کے مصنف ایک ہیں مگر بعض حضرات نے بغیر تحقیق یہ کہہ دیا ہے کہ دونوں کے مصنف دو ہیں۔ اس مضمون میں اسی تاریخی غلطی کی تردید کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کی مشہور شخصیت علامہ ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری علمی دنیا میں زندۂ جاوید اور عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں ایک قرآن پاک کی ضخیم تفسیر جو ''جامع البیان عن تاویل القرآن'' کے نام سے مشہور ہے، دوسرا زندۂ جاوید کارنامہ اسلامی تاریخ کی قدیم ترین اور مبسوط کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' ہے جو ساری علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔ ابن جریر طبری کے فضل وکمال کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے جس کے راوی مشہور مصنف ومؤرخ خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) ہیں، وہ طبری کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں:

ان الطبری قال لاصحابه أتنشطون لتفسیر القرآن قالو اکم یکون قدره؟ قال ثلاثون الف ورقة، فقالوا هذا مما یفنی الاعمار قبل تمامه، فاختصره فی نحو ثلاثة آلاف ورقة، ثم قال أتنشطون لتاریخ العالم من اٰدم الیٰ وقتنا هذا؟ قالو کم یکون قدره؟ فذکر نحوا مما ذکره فی التفسیر فاجابوا مثل ذٰلك، فقال اناللّٰه ماتت الهمم فاختصره فی نحو مما اختصر التفسیر[1] .

طبری نے اپنے تلامذہ سے پوچھا، تفسیر سے دلچسپی رکھتے ہو؟ اس پر لوگوں نے دریافت کیا وہ کتنی ضخیم ہوگی؟ طبری نے کہا ۳۰ ہزار اوراق میں آئیگی لوگوں نے کہا کہ

[1] تاریخ بغداد، خطیب بغدادی جلد ۲ ص ۱۶۳

تفسیر پوری بھی نہیں ہوگی اور ہماری عمریں ختم ہوجائینگی یہ سن کر آپ نے اس کو صرف ۳ ہزار صفحات میں لکھا، پھر فرمایا کہ تاریخ اسلام سے دلچسپی ہے؟ جو آدم سے ہمارے دور تک کی ہو؟ لوگوں نے کہا، کتنے اوراق میں آئے گی اس پر انھوں نے وہی بات کہی جو تفسیر کے بارے میں کہی تھی، لوگوں نے بھی وہی جواب دیا جو پہلے دے چکے تھے، طبری نے کہا انا للہ، ہمتیں پست ہوگئیں، پھر تفسیر کی طرح تاریخ کو بھی مختصر کر دیا۔

علمی دنیا میں یہ دونوں کتابیں قبولیتِ عامہ کے ہاتھوں لی گئی اور شوق وعقیدت کی نگاہوں سے پڑھی گئیں، اکابر علماء امت نے شاندار لفظوں میں دونوں کو خراج تحسین پیش کیا، ان کی تفسیر کے متعلق ابوحامد الاسفرائنی کے یہ الفاظ مشہور ہیں۔

لوسافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر ابن جریر لم یکن ذلك کثیرا[1].

اگر چین جیسے دور دراز ملک کا سفر کوئی صرف ابن جریر کی تفسیر حاصل کرنے کے لئے کرے تو یہ سفر کوئی لمبا سفر نہیں ہے۔

مشہور محدث ابن خزیمہ نے تفسیر طبری کو دیکھ کر فرمایا:

قد نظرت فیه من اوله الیٰ اخره ما اعلم علی ادیم الارض اعلم من محمد بن جریر الطبری[2].

میں نے تفسیر از ابتدا تا انتہا دیکھی میرے علم میں اس وقت محمد ابن جریر طبری سے بڑا کوئی عالم روئے زمین پر نہیں ہے۔

تاریخ کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ تصنیف کے کچھ ہی برسوں بعد مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے، اس کتاب کو شاہی سرپرستی بھی حاصل ہوگئی اور بعد کے مورخین میں تمام مشاہیر اصحاب تاریخ ابن مسکونہ، ابن اثیر، حافظ ابن کثیر وغیرہ نے اپنی کتابوں میں اس سے استفادہ کیا، ان کتابوں کے بار بار ایڈیشن شائع ہوئے، عصر حاضر میں ان کی تفسیر خوبصورت ٹائپ میں ۳۰ جلدوں میں شائع ہوکر ساری دنیا میں

۱۔ مقدمہ ناشر تاریخ الامم والملوک ص ۴۔ ۲۔ مقدمہ ناشر تاریخ الامم والملوک ص ۴۔

پھیل گئی ہے، ان کی تاریخ کا قدیم ایڈیشن لینڈن سے شائع ہوا تھا، ماضی قریب میں مصر سے ۱۳ جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور عام طور سے لائبریریوں میں پائی جاتی ہے، ان کے علاوہ ان کی ۱۵ کتابوں کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔

عصر حاضر میں تاریخ طبری اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں اہم ترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اسلامی دنیا سے گزر کر یورپین مصنّفین اور مستشرقین کی تحقیق اور مطالعہ اور ان کے حوالجات نے اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کردیا ہے، تدوین حدیث کی تاریخ کے سلسلہ میں مستشرقین کے اعتراضات کا سب سے بڑا ماخذ یہی کتاب بنتی ہے اور وہ اسی کے حوالے دیتے ہیں۔

علمی دنیا میں ابن جریر طبری کی تفسیر و تاریخ کی طرف رجوع عام بحث و تمحیص، حوالے اور شہادتیں ان کے وزن اور قدر و منزلت کے اعتراف کی علامت ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب کتاب اور مصنف دونوں سے خوب واقفیت ہو۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ علمی دنیا کو کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس زمانے میں بعض اہل علم نے یہ کہا ہے کہ تفسیر اور تاریخ ایک مصنف کی نہیں، بلکہ دونوں کتابیں دو مصنفوں کی ہیں۔

یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہوئی؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کا سراغ ہمیں علامہ ذہبی کی کتاب سے ابن جریر طبری کے ترجمے میں سلیمانی[1] کی جرح سے ملتا ہے۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

محمد بن جرير بن يزيد الطبری الامام الجليل المفسر ابو جعفر صاحب التصانيف الباهره مات سنة عشر وثلثمائه اقذع احمد بن علی السليمانی الحافظ فقال كان يضع للروافض، هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المتعمدين فلعل

[1] سلیمانی، ابوالفضل احمد بن علی بن عمرو السلیمانی الحافظ البیکندی المتوفی ۴۰۴ھ بیکند، کتاب الانساب للسمعانی ج ۷ ص ۱۹۸۔

السلیمانی رادا الآتی[۱].

محمد ابن جریر بن یزید طبری جلیل القدر امام و مفسر ہیں کنیت ابو جعفر ہے عظیم الشان کتابوں کے مصنف ہیں، جن کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے۔ احمد بن علی سلیمانی نے ان کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ رافضیوں کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے، یہ ان پر غلط اور بے بنیاد الزام ہے ابن جریر تو قابل اعتماد ائمہ اسلام میں سے ہیں، ہوسکتا ہے سلیمانی نے یہ بات اس ابن جریر طبری کے متعلق کہی ہو جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اس کے بعد علامہ ذہبی نے محمد بن جریر بن رستم ابو جعفر الطبری کا ترجمہ لکھا ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے صاف طور پر لکھ دیا ہے۔

رافضی، له تواليف منها كتاب الرواة عن اهل البيت رماه بالرفض عبدالعزيز الكتانی[۲].

رافضی ہے، اس کی کئی کتابیں ہیں، ایک کتاب الرواۃ عن اہل البیت ہے عبدالعزیز کتانی نے اس پر رافضی ہونے کا الزام لگایا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے دونوں طبری کے ترجموں میں علامہ ذہبی کی پوری عبارت نقل کر دی ہے اور اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ان پر رافضیت کا الزام غلطی سے لگایا گیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

انما ضرّة بالاشتراك فی اسمهٖ واسم ابيه ونسبتهٖ وكنيتهٖ ومعاصرته وكثرة تصانيفه[۳].

ان کو نقصان اس رافضی کے، والد کے نام، نسب، کنیت میں اشتراک ہم عصری اور تصانیف کی کثرت کی وجہ سے پہنچا۔

ابن جریر رافضی کے ترجمے میں حافظ ابن حجر نے ابن جریر بن یزید طبری پر

---

۱ میزان الاعتدال جلد۳ ص ۴۹۸۔ ۲ حوالہ مذکور ص ۴۹۹۔
۳ لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰۔

رافضیت کے الزام کی وجہ یہ بتائی کہ یہ بات مشہور کردی گئی کہ وہ وضو میں پاؤں کے مسح کے قائل ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں، حافظ ابن حجر کے الفاظ ہیں۔

لعل ماحکی عن محمد بن جریر الطبری ن الاکتفاء فی الوضوء یمسع الرجلین، انما هو هٰذا للرافضی فانه هو من مذهبهم[1].

شاید یہ بات ہوئی کہ لوگ کہنے لگے کہ وہ وضو میں پاؤں کو دھونے کے بجائے مسح کو کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بات ابن جریر رافضی کی ہے کیونکہ رافضیوں کا یہی مذہب ہے۔

مشہور محدث و مفسر حافظ ابن کثیر نے مزید معلومات فراہم کی ہیں، انھوں نے اپنی تاریخ میں[2] ہمیں تفصیل سے بتایا ہے کہ رافضی طبری کی بعض کتابیں ان کے نام سے مشہور ہوگئیں جس کی وجہ سے ان کی ذات کو نشانہ بنایا گیا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ علامہ طبری کے علم و فضل اور عظمت و شہرت کے سب سے بڑے دشمن ابوبکر محمد بن داؤد ظاہری تھے، وہ علامہ طبری پر نکتہ چینیاں کرتے رہتے تھے اور ان پر رافضیت کا الزام عائد کرتے تھے اور بہت سی بے بنیاد باتیں ان کی جانب منسوب کر کے عوام میں ان کی مقبولیت کو داغدار بتاتے رہتے تھے انھیں کی وجہ سے بغداد کے حنابلہ طبری کے دشمن ہوگئے، اور ان کو عام قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔

ان کی جانب غلط باتوں کے منسوب کئے جانے کے سلسلہ میں انھوں نے لکھا کہ ایک ضخیم کتاب دو جلدوں میں ہے جس میں ''غدیر خم'' کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، ایک اور کتاب ہے جس میں حدیث منطق الطیر کے طرق جمع کئے گئے ہیں یہ دونوں طبری رافضی کی کتابیں ہیں جو ان کے زمانہ میں عوام ان کی جانب منسوب کر کے ان کو متہم کرنے لگے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ایک غلط بات اور ان کی جانب منسوب کی گئی کہ وہ وضو میں پاؤں کے دھونے کے بجائے مسح کے قائل ہیں جو شیعوں کا مذہب ہے، ان تمام تفصیلات کے بعد حافظ ابن کثیر خلاصۂ بحث کے طور پر تحریر فرماتے ہیں۔

فمن العلماء من یزعم ان ابن جریر اثنان احدها شیعی والیه

---

[1] لسان المیزان جلد ۵ ص ۱۰۰۔ [2] البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد ۱۱ ص ۱۴۵، ۱۴۶۔

ینسب ذٰلك وینزھون ابا جعفر ھذا عن ھذہ الصفات[۱]۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ ابن جریر دو ہیں ان میں ایک شیعہ ہے۔ اسی کی جانب یہ سب باتیں منسوب ہیں اور ان کی طرف سے صفائی دیتے ہیں اور ان صفات سے ان کو بری قرار دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ابن جریر طبری کو بدنام کرنے کے لئے رافضی طبری کی کتابیں ان کی جانب منسوب کر کے عوام کو ان کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا، خود ان کی کسی تصنیف کو رافضی طبری کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا گیا، کیونکہ اس سے مخالفین کا کوئی فائدہ نہیں تھا، یہ تو آج کل کی بات ہے کہ ان کی تاریخ کو رافضی طبری کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اسی سازش کے ذیل میں رافضی طبری کی تصانیف کا ذکر بھی آ گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی کتاب، ''کتاب الرواۃ عن اہل البیت'' کا ذکر کیا ہے[۲] اور حافظ ابن کثیر نے اس کی کتاب ''احادیث غدیر خم'' اور حدیث منطق الطیر کے نام لئے ہیں[۳]۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام کتابیں خاص اس کے مسلک سے متعلق تھیں، اس نے کوئی ''تاریخ الامم والملوک'' جیسی کتاب نہیں لکھی ہے، ورنہ متقدمین سے کوئی نہ کوئی اس کا ذکر ضرور کرتا، ہم دیکھتے ہیں کہ ابن جریر طبری کے دور سے لے کر آج تک کسی مصنف نے نہیں لکھا کہ اس کی فن تاریخ میں بھی کوئی کتاب ہے، اس لئے تاریخ طبری کو رافضی طبری کی طرف منسوب کرنا ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اب یہ بات اپنی جگہ ناقابل انکار ہوگئی ہے کہ ابن جریر طبری دو ہیں ایک صحیح العقیدہ دوسرا غالی رافضی ہے، اتفاق سے دونوں صاحب تصانیف ہیں اور تاریخ طبری کا طرزِ تحریر ایسا ہے کہ سرسری مطالعہ کرنے والوں کو اس سے شیعیت کی بو آتی ہے، بس

۱؎ حوالہ مذکور ج ۱۱ ص ۱۴۷۔ ۲؎ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۹۹۔

۳؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۵۔

اسی بات نے ایک خلاف حقیقت اور بے بنیاد دعویٰ کرنے پر مجبور کر دیا، ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس کتاب کا تحقیقی جائزہ لے کر مستند روایات سے موازنہ کر کے رد و قبول، اور جمع و تطبیق سے کام لیا جاتا اور طرز تحریر کی وضاحت کر دی جاتی، سہل الحصول طریقہ یہ سمجھا گیا کہ کتاب ہی کو ابن جریر رافضی کی طرف منسوب کر دیا جائے خس کم جہاں پاک۔

اس کے برعکس ابن جریر ابن یزید الطبری کی تمام کتابوں کی فہرست متعدد کتابوں میں پائی جاتی ہے قدیم وجدید کسی تذکرے میں ادنیٰ سا شبہہ کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ تاریخ الامم والملوک ابن جریر رافضی کی ہے اور تفسیر ابن جریر طبری سنّی کی ہے، اس سلسلہ میں اتنی شہادتیں ہیں کہ کسی کے لئے شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے، چند شہادتیں پیش ہیں۔

۱- علوم وفنون کے تعارف کے مسئلہ میں سب سے قدیم تصنیف ابن ندیم کی "الفہرست" ہے، ابن ندیم ابن جریر طبری سے قریب العہد بھی ہیں کیونکہ طبری کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے اور ابن ندیم کا سال وفات ۳۷۵ھ ہے یعنی طبری سے صرف ۶۵ سال بعد کے ہیں اگر انھوں نے یہ تصنیف اپنے دور شباب میں لکھی ہے تو طبری کے انتقال کو زیادہ سے زیادہ ۳۰، ۴۰ سال کا زمانہ گذرا ہوگا، انھوں نے اپنی کتاب میں ایک مستقل عنوان ہی "الطبری واصحابہ" قائم کیا ہے، ان کے حالات زندگی اور سال وفات کو ابوالفرج المعانی بن زکریا النہروانی کی روایت سے لیا ہے جو بغداد کے قاضی تھے جہاں طبری کی علمی وتصنیفی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا ہے، ان کے بچپن میں جب ان کی عمر ۷ سال کی تھی تو طبری کا اسی بغداد میں انتقال ہوا تھا، ان کو ابن جریر سے وہ عقیدت تھی کہ وہ اپنے کو ان کی طرف منسوب کر کے جریری لکھا کرتے تھے[۱]، انھوں نے طبری کا سال وفات ۳۱۰ھ بتایا ہے جس پر سارے مورخین کا اتفاق ہے۔

اس کے بعد ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خود مجھ سے ابواسحاق ابن محمد ابن اسحاق

---

[۱] تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے الاعلام للزرکلی ج ۷ ص ۲۶۰، البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۲۸۔

نے بتایا کہ مجھ سے ایک ثقہ آدمی نے بتایا جس نے مصر میں طبری سے ملاقات کی تھی اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا تھا کہ میں طبری کے خط کو پہچانتا ہوں اور میں نے ان کے بہت سے مخطوطے اور طبری کے قلم سے لکھی ہوئی بہت سی کتابیں دیکھی ہیں، ان کتابوں کو شمار کراتے ہوئے اس نے تفسیر و تاریخ کی متعلق کہا کہ:

کتاب التایخ ویضاف الیه القطعان وآخر ما املیٰ منه الیٰ سنة ۳۰۲ وههنا قطع وقد اختصر هٰذا الکتاب وحذف اسانیده جماعة، منهم رجل یعرف بمحمد بن سلیمان الهاشمی کتاب التفسیر اختصره جماعت منهم[1].

ان کی تاریخ کی کتاب کے دو حصے بتائے جاتے ہیں، انھوں نے اب تک ۳۰۲ھ تک کے حالات املا کرائے ہیں ہمارے یہاں اس کا ایک حصہ ہے بعض لوگوں نے اس کی تلخیص کی اور اس کی سندوں کو حذف کر دیا ہے، تلخیص کرنے والے محمد بن سلیمان ہاشمی ہیں۔ تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ اس سے بہتر اب تک لکھی نہیں گئی، کچھ لوگوں نے اس کی تلخیص کی ہے۔

ابن ندیم نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ ان کی دوسری پندرہ کتابوں کو بھی شمار کرایا ہے، تفسیر طبری اور تاریخ طبری جو ہمارے ہاتھوں میں ہے ان دونوں کا مصنف اسی صحیح العقیدہ ابن جریر طبری کو بتاتے ہیں جن کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا ہے۔

۲- ابن ندیم کے بعد خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کا زمانہ آتا ہے انھوں نے اپنی مشہور عالم کتاب تاریخ بغداد میں طبری کا سات صفحات میں مفصل ذکر کیا ہے، ان کے علمی مقام و مرتبہ، فضل و کمال، ان کے اسفار و دیگر حالات، وفات، تجہیز و تکفین، جنازہ پڑھنے والوں کے اژدحام تک کو پوری تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کا انتقال اتوار کے دن ۲۸ رشوال ۳۱۰ھ کو نماز مغرب کے وقت ہوا، حنابلہ کے تشدد اور مخالفت کی وجہ سے ان کو عام قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکا بلکہ ان کے گھر

---

[1] الفہرست لابن ندیم ص ۳۲۶، ۳۲۷۔

میں جو ''رُحبہ یعقوب'' میں واقع تھا دفن کیا گیا، پھر خطیب نے بڑے ہی پرشکوہ الفاظ میں ان کے فضل وکمال اوران کی بے مثال تصانیف کوخراج تحسین پیش کیا ہے۔انھوں نے طبری کی کتابوں کا ذکرکرتے ہوئے تاریخ وتفسیر کے بارے میں تحریرفرمایا۔

......وله الكتاب المشهور فى "تاريخ االامم والملوك" وكتاب فى التفسير ولم يصنف احد مثله[1].

انھیں کی مشہورکتاب تاریخ الامم والملوک ہےاورتفسیر میں ایسی کتاب لکھی ہے کہ کسی نے اب تک ویسی کتاب نہیں لکھی ہے۔

ان جملوں سے جہاں دونوں کتابوں کے مصنف ایک ہونے کی شہادت ملتی ہے وہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطیب کے زمانے تک طبری کی تاریخ کی شہرت بامِ عروج پرپہنچ چکی تھی، یہ شہرت خود بتاتی ہے کہ اس کے مصنف کے بارے میں کسی کو کوئی احتمال نہیں تھا۔

۳- انساب کے موضوع پرسب سے ضخیم اورمبسوط کتاب کے مصنف امام ابوسعید عبدالکریم بن محمد بن منصور تمیمی سمعانی (متوفی ۵۶۲ھ) ''طبری'' کے ذیل میں ان کی دونوں کتابوں کا ایک ساتھ ذکرکرتے ہیں،وہ تحریرفرماتے ہیں۔

ابوجعفر محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الطبرى من ساكنى بغداد، استوطنها الىٰ حين وفاته وكان احد ائمة الاسلام يحكم بقوله ويرجع الىٰ رايه لمعرفته وفضله......له الكتاب المشهور فى تاريخ الامم والملوك وكتاب فى التفسير لم يصنف احد مثله ...... توفى عشيته يوم السبت ودفن يوم الاحد بالغداة فى داره لاربع بقين من شوال سنة عشر وثلاث مائة[2].

ابوجعفر بن محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری بغداد کے رہنے والے

---

[1] تاریخ بغداد خطیب بغدادی ج۲ ص۱۶۲ تا ۱۶۸، ۵۸۹۔

[2] کتاب الانساب للسمعانی ج۹ ص۴۱، ۴۲۔

تھے انھوں نے اس کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا، اور تا دم آخر بغداد ہی میں رہے ائمہ اسلام کے ایک فرد فرزند تھے ان کا قول فیصل مانا جاتا تھا اور ان کی رائے کی طرف ان کی معرفت اور علم وفضل کی وجہ سے رجوع کیا جاتا تھا، تاریخ میں ان کی مشہور کتاب ''تاریخ الامم والملوک'' ہے اور تفسیر میں ان کی ایک بے مثال کتاب ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی وفات ۲۶؍شوال المکرّم ۳۱۰ھ میں شنبہ کے دن ہوئی اور دوسرے دن یکشنبہ کی صبح کو اپنے مکان ہی کے ایک حصہ میں دفن کئے گئے۔

۴۔ فن جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کے امام علامہ ذہبی اپنی کتاب کے ۶؍ صفحات میں ابن جریر طبری کے حالات لکھتے ہیں اور ان کے فضل وکمال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اس موقعہ پر وہ خطیب بغدادی کے بیان کو سند مان کر نقل فرماتے ہیں تفسیر وتاریخ کے سلسلہ میں طبری نے ابتداءً جس صفحات کا ذکر کیا تھا اور طلبہ کی کم ہمتی کی وجہ سے دونوں کتابوں کے مختصر کرنے کے واقعہ کو ذہبی نے بھی مفصل لکھا ہے، پھر طبری کے مشہور شاگرد فرغانی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

قال الفرغانی ثم له التفسیر والتاریخ وکتاب القراءٰات وکتاب العدد والتنزیل وکتاب اختلاف العلماء وکتاب تاریخ الرجال وکتاب لطیف القول فی الفقه وکتاب التبصیر فی الاصول کتاب تهذیب الاٰثار[۱]......

فرغانی کہتے ہیں کہ ان کی تفسیر اور تاریخ اور کتاب القراءات اور کتاب العدد والتنزیل، کتاب اختلاف العلماء، کتاب تاریخ الرجال فقہ میں لطیف القول اور اصول میں کتاب التبصیر یہ کتابیں مکمل ہوگئیں اور کتاب تہذیب الآثار نامکمل وغیرہ۔

علامہ ذہبی، ابن ندیم اور خطیب بغدادی نے طبری کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے اس کی تائید کرتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ان کی تفسیر اور تاریخ کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں۔

فی الکتاب الکبیر المشهور فی تاریخ الامم وله کتاب التفسیر

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۷۔

الذی لم یصنف مثلہ[۱] .

ان کی عظیم کتاب تاریخ امم میں مشہور ہے اوران کی تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ اس جیسی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔

۵۔ تاج الدین السبکی (متوفی ۷۷۱ھ) نے اپنی کتاب میں ابن جریر طبری کا مفصل تذکرہ لکھا ہے، ان کی پیدائش، تاریخ وفات تفسیر وتاریخ کی ضخامت کا واقعہ، تصانیف کی فہرست یہ سب کچھ انھوں نے خطیب بغدادی سے ہو بہو لے لیا ہے اور حقیقتِ مسلمہ کے طور پر ان تمام باتوں کو نقل کرتے چلے گئے ہیں، تصانیف طبری کا شمار کراتے ہوئے انھوں نے لکھا۔

ومن تصانیفه کتاب التفسیر والتاریخ[۲] ......

ان کی تصانیف میں کتاب التفسیر اور کتاب التاریخ وغیرہ ہیں۔

۱- حافظ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) نے اپنی تاریخ میں ابن جریر کا نسب نامہ سال پیدائش، حلیہ، وفات اور تصنیفات وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے دوسری بعض حقیقتوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے، وہ اپنی گفتگو کا آغاز یہاں سے کرتے ہیں۔

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الامام ابوجعفر الطبری کان مولده فی سنة اربع وعشرین ومأتین وکان اسمر اللون ملیح الوجه، مدید القامة، فصیح اللسان.

محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب امام ابوجعفر طبری، ان کی پیدائش ۲۲۴ھ میں ہوئی، وہ گندم گوں، ملیح چہرے والے دراز قامت اور فصیح اللسان تھے۔

روی الکثیر عن الجم الغفیر رجل الی الآفاق فی طلب الحدیث وصنف التاریخ الحافل وله التفسیر الکامل الذی لا یوجد له نظیر وغیرهما من المصنفات[۳] .

۱۔ حوالہ سابق۔

۲۔ طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج۲ ص۱۳۵ تا ۱۴۰۔

۳۔ البدایه والنهایه لابن کثیر ج۱۱ ص۱۴۵.

انھوں نے ایک جم غفیر سے روایتیں کی ہیں اور طلب حدیث میں دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے، انھوں نے ایک جامع تاریخ اور ایک مکمل تفسیر لکھی ہے جس کی نظیر نہیں۔ان کے علاوہ بھی ان کی تصنیفات ہیں۔

پھراس کے بعد طبری کی دوسری تصنیفات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، آخر میں ان کا سال وفات تاریخ وقت اور خصوصیت تحریر فرماتے ہیں۔

قد كانت وفاته وقت المغرب عشيه يوم الاحد ليومين بقيا من شوال من سنة عشرو ثلثمائة وقد جاوز الثمانين بخمس سنين او ست سنين وفي شعر راسه ولحيته سواد كثير ودفن في داره[1].

ان کی وفات اتوار کے دن مغرب کے وقت ہوئی، اور تاریخ ۲۸ رشوال ۳۱۰ھ تھی، ان کی عمر پچاسی یا چھیاسی سال ہوگئی تھی ان کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی سے زیادہ سیاہی تھی، اپنے مکان ہی میں دفن کئے گئے۔

اتنی جزئی تفصیلات اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا ذکر کرنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابن کثیر کو ابن جریر طبری کی شخصیت متعین کرنے میں کوئی دھوکا نہیں ہوسکتا تھا، وہ صحیح العقیدہ طبری اور رافضی طبری دونوں کی الگ الگ شخصیتوں کو خوب پہچانتے ہیں اور پھر پوری تفصیل سے ان واقعات کو بیان کرتے ہیں، جو دونوں طبری میں نام اور کنیت میں اشتراک کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے، پھر پورے وثوق کے ساتھ صحیح العقیدہ کی کتابوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

عالما بايام الناس واخبارهم وله الكتاب المشهور في تاريخ الامم والملوك، وكتاب في التفسير لم يصنف احد مثله وكتاب سماه تهذيب الآثار لم ارسواه في معناه الا انه لم يتمه[2]......

ایام الناس اور تاریخ عالم کے خوب جاننے والے تھے، تاریخ میں ان کی مشہور کتاب تاریخ الامم والملوک ہے اور تفسیر کی کتاب تو ایسی ہے کہ کسی نے اس جیسی تفسیر

---

[1] حوالہ مذکور ص ۱۴۶۔ [2] البدايه والنهايه ج ۱۱ ص ۱۴۵.

نہیں لکھی، ایک کتاب تہذیب الآثار کے نام سے لکھنی شروع کی تھی، یہ کتاب اپنے موضوع پر بے مثل ہوتی مگر افسوس کہ وہ مکمل نہ کر سکے۔

۷- طاش کبریٰ زادہ (متوفی ۹۶۲ھ) کی کتاب علوم وفنون کی تاریخ وتعارف میں مشہور ومستند کتاب ہے، انھوں نے بھی اپنی کتاب میں ابن جریر طبری کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور پورے جزم ویقین کے ساتھ لکھتے ہیں:

ومن التواریخ، تاریخ الطبری وھو ابوحعفر محمد بن جریر الطبری وقبل یزید بن کثیر بن غالب صاحب التفسیر الکبیر والتاریخ الشھیر[1]......

فن تاریخ میں طبری کی تاریخ ہے، ان کا پورا نام محمد بن جریر الطبر ی ہے، اوپر کے نسب میں یزید بن کثیر بن غالب ہے، جن کی عظیم الشان تفسیر اور مشہور تاریخ کی کتاب ہے۔

طاش کبریٰ زادہ نے تاریخ طبری کے ذکر کے ساتھ پورا نام ونسب شاید اسی لئے لکھ دیا ہے کہ صرف محمد ابن جریر طبری لکھنے سے طبری رافضی کے نام میں اشتراک کی وجہ سے دھوکا ہوسکتا ہے، اس لئے دادا کا نام بھی لکھ دیا ہے کیونکہ رافضی طبری کے دادا کا نام رستم ہے، اور ان کے دادا کا نام یزید، یہیں سے دونوں میں امتیاز ہوتا ہے، اس لئے شخصیت متعین کرنے کے لئے پورا نسب نامہ بیان کردیا، اور تاریخ وتفسیر دونوں کوانھیں کی جانب منسوب کیا۔

۸- ابن عماد حنبلی (متوفی ۱۰۸۹ھ) جوشذارت الذہب کے مصنف ہیں، یہ کتاب پہلے چھپی تھی مگر کمیاب ہوگئی تھی۔ ماضی قریب میں دارالمسیرہ بیروت سے خوبصورت اور روشن ٹائپ میں چھپ گئی ہے، انھوں نے اس کتاب میں ۳۱۰ھ کے حالات میں لکھا ہے۔

فیھا الحبرالبحر الامام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، صاحب التفسیر والتاریخ والمصنفات الکثیرۃ[2].

---

[1] مفتاح السعادۃ: ج۱ ص۲۵۲، ۲۵۳ "عنوان التواریخ" کے ذیل میں سب سے پہلے تاریخ طبری کا ذکر کرتے ہیں۔
[2] شذرات الذہب ج۲ص۲۶۰۔

اسی سال عظیم المرتبت امام ابوجعفر محمد ابن جریر طبری نے جو تفسیر و تاریخ اور دوسری بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، انتقال فرمایا۔

۹- حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) کی ''کشف الظنون عن اسامی الکتب الفنون'' مشہور و معروف ہے، کتابوں کے نام اور ان کے مصنّفین کے سلسلہ میں علمی حلقوں میں ایک قابل اعتماد اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عام طور سے لائبریریوں میں پائی جاتی ہے، حاجی خلیفہ اپنی کتاب میں تواریخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

تاریخ الطبری هو الامام ابوجعفر محمد بن جریر المتوفی سنة عشر وثلثمائة وهو من التواریخ المشهورة الجامعة لاخبار العالم ابتداءً من اول الخلیفة وانتهیٰ الیٰ سنة تسع وثلثمائة، وسماه تاریخ الامم والملوك[1].

تاریخ طبری اس کے مصنف ابوجعفر محمد ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، وہ تاریخ کی مشہور کتابوں میں سے ہے اور اخبار عالم کی جامع ہے، حضرت آدم سے لیکر ۳۰۹ھ کے حالات پر مشتمل ہے، طبری نے اپنی تاریخ کا نام تاریخ الامم والملوک رکھا ہے۔

یعنی تاریخ طبری اسی ابن جریر طبری کی تصنیف ہے، جس کا سال وفات ۳۱۰ھ ہے، پھر تفسیر کے باب میں وہ رقمطراز ہیں:

''تفسیر ابن جریر'' هو ابوجعفر محمد الطبری المتوفی سنة عشر وثلثمائة وقال السیوطی فی الاتقان وکتابه اجل التفاسیر واعظمها ...... نقله بعض المتاخرین الی الفارسیة لمنصور ابن نوح السامانی[2].

''تفسیر ابن جریر'' اس کے مصنف ابوجعفر محمد طبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، اس تفسیر کے بارے میں سیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے، یہ تفسیروں میں سب سے عظیم اور جلیل القدر تفسیر ہے، متاخرین میں سے کسی نے منصور بن نوح سامانی کے لئے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

---

[1] کشف الظنون (جدید ایڈیشن) ج ا ص ۲۹۷۔ [2] حوالہ مذکور ج ا ص ۴۷۳۔

۱۰- سب سے اہم اور بڑی شہادت کہ تفسیر و تاریخ دونوں کا مصنف ایک ہے، خود تاریخ طبری ہی سے ملتی ہے، مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں القول فی خلق آدم کے تحت لکھا ہے۔

وقیل اقوال کثیرة فی ذالك قد حكینا منها جملا فی كتابنا المسمی جامع البیان عن تاویل ای القرآن فكرهنا اطالة الكتاب بذكر ذالك فی هذا الموضع[1].

اس سلسلہ میں بہت سے اقوال ہیں، ان میں سے بہت سے ہم نے اپنی کتاب جامع البیان عن تاویل ای القرآن میں نقل کر دیئے ہیں، طوالت کے خیال سے ان کا یہاں نقل کرنا ہم نے پسند نہیں کیا ہے۔

مذکورہ بالا قول کی حقیقت و صداقت معلوم کرنے کے لئے میں نے تفسیر طبری دیکھی تو یقین ہو گیا کہ مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں جن اقوال کو اپنی تفسیر میں ذکر کرنے کا حوالہ دیا ہے، حقیقتاً وہ اقوال تفسیر میں موجود ہیں، یہ سارے اقوال قرآن کی آیت **قالوا أتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدماء** کے ذیل میں پورے سات صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں[2]۔

یقین میں مزید اضافہ اس وقت اور بھی ہوا جب میں نے دیکھا کہ تاریخ میں اس موقع پر جو بعض الفاظ استعمال کئے ہیں، ٹھیک وہی الفاظ تفسیر میں بھی موجود ہیں۔

تاریخ میں اس موقع پر ایک جملہ ہے۔ **یقول اعلم مالا تعلمون من الظواء ابلیس علی التكبیر** تفسیر میں اسی لفظ "الظواء" کو اس موقع پر استعمال کرتے ہیں، تفسیر کے الفاظ میں **اظهر لهم من ابلیس ما كان منطویا علیه من الكبر**، "الظواء" کے مستقات کو تفسیر میں کئی بار استعمال کیا ہے شاید واقعہ کی ترجمانی کے لئے وہ اس لفظ کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اس لئے تفسیر و تاریخ دونوں میں اس

---

[1] تاریخ الامم والملوك مطبوعه دار الفكر بیروت ج ا ص ۴۵.

[2] تفسیر جامع البیان مطبوعه مطبع میمنیه مصر ج ا ص ۱۵۴ تا ۱۶۲.

موقعہ پر یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

تاریخ میں ایک عبارت ہے **فخلق اللّٰہ آدم من طین لازب واللازب اللزج الطیب من حمأ مسنون منتن انما کان حمأ مسنونا بعد التراب قال فخلق منه آدم بیده**[1]۔

بالکل یہی عبارت تفسیر میں ہے، ایک حرف کی کمی بیشی نہیں ہے[2]۔

خلق اللّٰہ من طین لازب کے ذیل میں اپنے شیخ ابوکریب کی جس روایت کو اپنی تاریخ میں لکھا ہے[3]، ٹھیک وہی روایت انھیں سے اپنی تفسیر میں بھی لکھی ہے[4]۔ تخلیق آدم کے لئے مٹی لینے کے لئے فرشتوں کو بھیجنے کا ذکر اپنی تاریخ میں اپنے شیخ موسیٰ بن ہارون کی روایت سے بیان کرتے ہیں[5]۔

انھیں کی وہی روایت ان کی تفسیر میں بھی موجود ہے، علم آدم الاسماء کلہا کی تفسیر میں اگر پہلی روایت ان کے شیخ ابوکریب کی ہے اور وہی روایت ہے، پھر ان کے شیخ محمد بن عمرو کی روایت تاریخ میں ہے وہی روایت محمد بن عمرو کی ان کی تفسیر میں بھی ہے، درمیان میں تین چار روایتیں تفسیر میں زیادہ ضرور ہیں لیکن ترتیب قائم ہے۔ پھر تاریخ میں ابن وکیع کی روایت ہے، وہی روایت اسی ترتیب سے تفسیر میں بھی ہے، تاریخ میں پھر ان کے شیخ بشر بن معاذ کی روایت ہے، تفسیر میں بھی وہی روایت ہے، پھر قاسم بن حسن کی جو روایت ہے دونوں کتابوں میں ہے، اس طرح دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر مقابلہ کرنے پر روایتوں کی ترتیب تاریخ میں وہی بنتی ہے جو تفسیر میں ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب طبری نے تاریخ لکھنی شروع کی تو تفسیر سامنے رکھ لی اور جس روایت کو تاریخ کے لئے مناسب سمجھتے ہیں، لے لیتے ہیں اور باقی روایت کو چھوڑتے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر و تاریخ دونوں روایتوں میں ایک مخصوص ترتیب پائی جاتی ہے۔

۱۔ تاریخ الامم والملوک ج۱ ص ۴۵۔
۲۔ جامع البیان ج۱ ص ۱۵۵۔
۳۔ تاریخ الامم والملوک ج۱ ص ۴۵۔
۴۔ جامع البیان ج۱ ص ۱۵۵۔
۵۔ تاریخ، ج۱ ص ۴۵۔

طبری نے اپنی تاریخ میں صرف ''خلق آدمؑ'' کے عنوان کے تحت اپنے شیوخ میں سے ابوکریب، ابن حمید، موسیٰ بن ہارون، احمد بن اسحاق الاہوازی، یعقوب بن ابراہیم، علی بن الحسن، محمد بن عمرو، وکیع، ابن وکیع، حسن بن یحییٰ، بشر بن معاذ، قاسم بن الحسین، یونس عبدالاعلیٰ اور بعض دوسرے شیوخ کی روایتیں درج کتاب کی ہیں، انھیں شیوخ سے وہی روایتیں اسی ترتیب سے وہ اپنی تفسیر میں پہلے لکھ چکے ہیں، گہرائی سے جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کی تفسیر ان کی تاریخ سے یقیناً پہلے لکھی گئی ہے، چونکہ تفسیر کے مقابلہ میں تاریخ میں روایتوں کا اختصار مدنظر تھا اور تفسیر میں روایتوں سے انتخاب کیا ہے، حیرتناک یکسانیت واشتراک یہ ہے کہ تاریخ میں جس ترتیب سے ان مشائخ کی روایتوں کو لکھتے ہیں ٹھیک وہی ترتیب ہے جو تفسیر میں ہے جب کہ بیچ میں کئی کئی صفحے دوسری تفصیلات پیش کرتے جاتے ہیں، مگر تاریخ میں تفسیر سے انتخاب روایات اپنی ترتیب کے ساتھ ہے[1]۔

دو مصنف کی دو کتابوں میں یہ اشتراک، یکسانیت اور ترتیب مضامین کیا ممکن ہے؟ اگر بالفرض ایسی کوئی مثال مل جائے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ اپنی کتاب بعد میں لکھنے اور مرتب کرنے والا شخص مصنف نہیں کچھ اور ہے، اس کا ہاتھ تو نہیں کاٹا جاسکتا، لیکن اس کے قلم کو ذلّت ورسوائی کی سزا ضرور دی جائے گی۔

طبری کی تفسیر وتاریخ میں مضامین، روایتوں اور عبادتوں میں اشتراک ویکسانیت اور ترتیب اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں اپنی تفسیر کا جو اس موقع پر حوالہ دیا ہے وہ اپنے اندر پوری صداقت لئے ہوئے ہے، مصنّفین کی اپنی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں، ہر ایک کے کچھ مخصوص الفاظ، جملے، مضامین اور اپنا مخصوص طرزِ تحریر اور انداز بیان ہوتا ہے، اور وہ ان سے اپنی ہر تصنیف میں کام لیتے ہیں، اگر کوئی مصنف اپنی کتاب کے بعد کوئی دوسری کتاب لکھتا ہے اور اس میں اس کی پہلی کتاب میں درج کسی خاص بحث کا موقع آجاتا ہے تو بالعموم وہی انداز

[1] دیکھئے تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۴۵ تا ۵۲ اور تفسیر جامع البیان (مطبع میمنیہ) ص ۱۵۵ تا ۱۶۴۔

بیان، وہی عبارتیں بلا تکلف زیر تصنیف کتاب میں استعمال کرتا ہے، اور یہ کوئی عیب نہیں ہے، طبری نے بھی پہلے تفسیر لکھی اور جب تاریخ لکھنی شروع کی تو جو باتیں تفسیر میں تفصیل سے لکھ چکے تھے ضرورت پڑنے پر اس کی تلخیص کر کے اس بحث کو اپنی تاریخ میں شامل کرلیا، یہی سب سے بڑا ثبوت ہے کہ تفسیر و تاریخ دونوں ایک ہی مصنف کی کتابیں ہیں۔

میری اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ تفسیر طبری اور تاریخ طبری جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہیں، ان دونوں کے مصنف امام ابوجعفر محمد بن یزید بن جریر بن یزید الطبری متوفی ۳۱۰ھ ہیں، مذکورہ بالا شہادتوں کے بعد یہ گنجائش نہیں رہتی ہے کہ کوئی یہ کہے کہ تفسیر طبری تو ضرور ان کی ہے، لیکن تاریخ طبری رافضی طبری کی ہے۔

میں نے علامہ طبری کے معاصرین سے لے کر گیارہویں صدی تک کے اربابِ تحقیق و تصنیف کی شہادتیں آپ کے سامنے پیش کردی ہیں، ان شہادتوں کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کریں کہ تفسیر طبری اور تاریخ طبری کے بارے میں ایک مصنف کی تصنیف ہونے کا جو دعویٰ کیا گیا ہے، کیا یہ غلط دعویٰ ہوسکتا ہے؟ مجھے کسی تصنیف، کسی تذکرہ میں یہ شائبہ بھی نہیں ملا کہ تفسیر و تاریخ کو کسی دوسری شخصیت کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، یہ تو ضرور ہوا کہ طبری کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانے کی نیت سے رافضی کی بعض ہفوات ان کی جانب منسوب کر کے ان کے خلاف محاذ بنانے کی ان کے زمانے میں کوشش کی گئی، لیکن پوری تاریخ سے معمولی سی شہادت نہیں ملی کہ ان کی کتابوں کو کسی نے رافضی طبری کی طرف منسوب کیا ہو، ان حالات میں یہ دعویٰ کس طرح قابل قبول ہوسکتا ہے کہ تاریخِ طبری، رافضی طبری کی ہے اور تفسیر طبری کی ہے، اس تقسیم کی پوری تاریخ میں کہیں بھی گنجائش نظر نہیں آتی۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس تقسیم سے کیا نقصان ہے؟ بظاہر نقصان کے بجائے فائدہ ہے، اگر تاریخ کو شیعی طبری کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے، تو سیکڑوں وہ روایتیں جو اس کتاب میں ہیں، جن سے صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگی بدمنظر بن جاتی ہے، ان

سے نجات حاصل ہو جائے گی اور کہہ دیا جائے گا کہ یہ تاریخ ہمارے لئے قابل حجت نہیں ہے، کیونکہ اس کا مصنف غالی رافضی ہے، لیکن یہ دعویٰ کچھ آسان نہیں ہے۔

چونکہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہو گا، اس لئے علمی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہو گی، آج دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے، قدیم سے قدیم تر مخطوطے تحقیق و تفتیش کے دیوانے حاصل کر چکے ہیں، اور بظاہر ناممکن الحصول قدیم ترین مخطوطے جن سے اہل علم مایوس ہو چکے تھے برابر دستیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ جن مصنّفین کی تصنیفات کو ناممکن الحصول سمجھ کر ہم مطمئن ہو چکے تھے آج ان کے مخطوطے دریافت ہو گئے ہیں اسی طرح تاریخ طبری کے بہت سے مخطوطے علمی دینا نے حاصل کر کے اس کی تحقیق کی ہے، اور ناقابل شکست دلائل سے اس کتاب کا مصنف اسی شخصیت کو قرار دیا گیا ہے جس کی تصنیف ماننے سے انکار ہے آج بہت سی علمی بحثوں میں طبری کی یہ تاریخ مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، مستشرقین کا ایک پورا گروہ جو اپنی تحقیق دوسعت مطالعہ کی بنا پر طبری کی اس تاریخ کے مقام و مرتبہ سے خوب واقف ہے، وہ آپ کے دعویٰ بلا دلیل کو کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرے گا، اور اگر علمی بنیاد پر آپ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا چاہیں گے اور ثبوت و شہادت کی تلاش میں نکلیں گے تو تلاش و جستجو کے قدم اس خارزار وادی میں لہولہان ہو جائیں گے اور ہر ہر قدم پر آپ کو آپ کے دعویٰ کے خلاف ہی ثبوت اور شہادت ملتی چلی جائے گی۔

اس تقسیم سے سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ یہ کتاب نا قابل اعتبار ہو جائے گی اور اسی کتاب پر بعد میں لکھی جانے والی بہت سی اسلامی تاریخوں کا دار و مدار ہے، اس لئے وہ تمام کتابیں اور تاریخیں بھی نا قابل اعتماد اور نا قابل حجت بن جائیں گی، جن میں تاریخ سے طبری سے استفادہ کیا گیا ہے، اس طرح اسلامی تاریخ کا پورا سرمایہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ہو جائے گا، اس لئے یہ تقسیم کسی بھی حال میں اور کسی بھی حیثیت سے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

رہ گئیں تاریخ طبری کی وہ روایات جن سے صحابہ کرام کی شخصیتوں پر حرف آتا

ہے تو ایسی روایتوں کی علمی بنیاد پر تردید ہونی چاہیئے، ہمارے ہاتھوں میں فن اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کی کسوٹی موجود ہے، اگر تاریخ طبری کی کوئی بھی روایت اس کسوٹی پر کھری ثابت نہیں ہوتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینے کا ہم کو حق حاصل ہے، خود طبری کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ ہم نے روایتوں کی صحت وصداقت کو جانچنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو رطب ویابس روایتیں ہم تک پہنچیں ہم نے ان کو اسی طرح انھیں راویوں کی زبانی نقل کردیا ہے، اب یہ قاری کی ذمہ داری ہے کہ وہ جواہرات کو پرکھ کر الگ کرلے اور خزف ریزوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدے، چونکہ اس بحث کو ہم نے اپنی کتاب ''تاریخ طبری کا ایک تحقیقی جائزہ'' میں مفصل لکھ دیا ہے، اس لئے سلسلۂ کلام یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

ڈی اولیری کی کتاب ''فلسفۂ اسلام'' پر ایک نظر

پاکستان میں چھپی ہوئی ایک کتاب ''فلسفۂ اسلام'' میرے ایک دوست سفر پاکستان سے واپسی میں بطور خاص لائے تھے انھوں نے مجھے مطالعہ کے لئے دی اور اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت کا اظہار کیا، کتاب کا مصنف ایک مستشرق ڈی اولیری لیکچرار رامی وسریانی، برسٹل یونیورسٹی ہے، کتاب کا اردو ترجمہ احسان احمد بی اے (علیگ) نے کیا ہے جو سررشتہ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے رکن تھے، نفیس اکیڈمی کراچی نے اس کو شائع کیا ہے، میرے سامنے اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو نومبر ۱۹۸۰ء کا مطبوعہ ہے، کتاب کے ناشر چودھری محمد اقبال سلیم نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے پیش لفظ لکھا ہے:

> ''یہ حیدرآباد دکن جامعہ عثمانیہ میں داخل نصاب رہی اور علم وتحقیق کی کسوٹی پر بارہا کسی گئی اور کتاب کو ہر اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی علمی وتحقیقاتی مرکز قرار دیا گیا اور یہ امر واقعہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب اُردو یا انگریزی میں ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے، یہ کتاب ایسا علمی خزانہ ہے جس میں

قیمتی معلومات کے جواہر بھرے ہوئے ہیں''۔

اس بلند بانگ دعوے اور شاندار تعارف نے خاص طور پر مطالعہ کے لئے مہمیز کیا اور ان جواہرات کی تلاش میں کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا گیا جو بقول ناشر کتاب میں بھرے ہوئے ہیں، میں انھیں جواہرات سے کچھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ بھی ان جواہر کو ایمان ہی نہیں علم و تحقیق، اسلامی تعلیمات و روایات، قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ کی کسوٹی پر پرکھ کر خود دیکھیں کہ کیا واقعتاً یہ جواہرات ہیں یا خرف ریزے؟ یہ آب حیات ہے یا زہر کا پیالہ؟ یہ سدا بہار پھولوں کا گلدستہ ہے یا کانٹوں کا انبار؟ پوری کتاب پر تبصرہ تو سر دست ممکن نہیں اس لئے مصنف کے کچھ دعووں پر اپنی گفتگو محدود رکھنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ یہی دعوے اس کی پوری کتاب کی روح ہیں، اور اسی سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مصنف کا مقصد کسی علمی تحقیق کو پیش کرنا ہے یا صرف اسلام دشمنی نے اس کو اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا ہے؟ اور وہی انداز فکر اختیار کیا ہے جو عام طور پر مستشرقین کے یہاں پایا جاتا ہے؟ کتاب کے مطالعہ کے بعد میں نے دل کے پورے درد وکرب کے ساتھ سوچا کہ اگر ایسی ہی کتابیں ہماری یونیورسٹیوں میں اسلام کے تعارف کے لئے پڑھائی جاتی رہیں تو پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کے ایمان کا خدا ہی حافظ ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا   کارِ طفلاں تمام خواہد شد

کتاب کا دوسرا باب جہاں سے شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے ''عربی دور'' یہیں سے اس نے خالص اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ''اسلامی دور'' کے بجائے ''عربی دور'' کا لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کسی مذہب کی تشکیل یا اشاعت ہی نہیں تھی، بلکہ اس دور میں عرب کے اندر ایک نئی طاقت اُبھر رہی تھی جس نے حیرہ اور غسان میں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں، اس کامیابی سے عربوں نے سمجھ لیا کہ ایرانی سلطنت اور شاید رومی بھی باوجود اپنی شان وشوکت کے قابل شکست ہیں، اور اگر کوئی

پُرعزم کوشش کی جائے تو دونوں کی دولت آسانی کے ساتھ عربوں کے ہتھے چڑھ سکتی ہے[۱]۔بس اسی جذبے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میدانِ عمل میں آئے تھے، مذہب کی تشکیل کا خیال تو مدینہ جانے کے بعد یہودیوں کی مذہبی زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور مجبوراً ایک مذہب کی داغ بیل ڈالی[۲]، ڈی اولیری اپنی کتاب کے دوسرے باب کا آغاز اس جملہ سے کرتا ہے۔

''اسلام اپنی ابتدائی شکل میں کلیۃً ایک عربی مذہب تھا[۳]''

اس کے بعد مصنف اپنے قارئین کو بتاتا ہے کہ:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تبلیغ کا دنیاوی پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم انھیں حجاز کے قبائل کو برادرانہ اتحاد میں مربوط کرنے کی کوشش کرنے، لوٹ مار کرنے کے دستور کو محدود کرنے، اور ایک منظّم جماعت بنانے میں مصروف پاتے ہیں[۴]''

ڈی اولیری نے چند صفحوں کے بعد بتایا ہے کہ عرب خانہ بدوش قوم تھی، ان کو صرف لوٹ مار سے دلچسپی تھی، اس لئے بدوی قبائل میں کبھی منظّم حکومت نہیں ہوسکتی تھی،محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مدینہ چلے جانے کے بعد بھی مکہ کے لوگ ان کی ماتحتی میں نہیں آنا چاہتے تھے وہ تو انھوں نے مدینہ میں اپنا ایک ''جنگجو دستہ'' بنالیا تھا، اور مکہ پر طاقت کے زور سے قبضہ کرلیا تھا اور مکہ والوں کی طاقت توڑ دی تھی اس لئے مجبوراً وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوگئے تھے وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے[۵]، اس کے بعد بنوامیہ کے بارے میں لکھتا ہے:

''ان خالص دنیادار عربوں کا سرگروہ قبیلہ قریش کے بنواُمیہ تھے، چونکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قریشی تھے اور اسلام کی عظمت سے قریش کی عظمت ہوتی تھی، اس کی وجہ سے وہ ایک قسم کے امراء کا طبقہ بن گئے تھے، اگرچہ اس طرح بنواُمیہ اپنے شخصی غرور کو مطمئن کرسکتے تھے جو ایک نیم متمدن جماعت کی

---

۱ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۶۷۔ ۲ فلسفۂ اسلام ص ۶۹۔
۳ حوالہ مذکور ص ۶۸۔ ۴ حوالہ مذکور ص ۷۹۔
۵ حوالہ مذکور ص ۷۲۔

نفسیات میں ہمیشہ ایک طاقتور عامل ہوتا ہے، اور دوسرے قبائل پر بہت کچھ قابو حاصل کر چکے تھے، لیکن اس نے اسلام کے پہلے کے قبائل کے رشک وحسد ہی کو دوام بخشا، کیونکہ قریش کے تفوق کے باعث ان کے اکثر حریف سخت مخالف تھے، حقیقی عرب جماعت مذہب کی طرف سے زیادہ بے پرواہ تھی اور اب تک ہے[۱]"

مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"بلاشبہ عرب مفتوح عجمیوں کو حلقہ بگوش اسلام ہو جانے پر بھی بھائی تسلیم کرنے پر مائل نہ تھے، ان کے نزدیک بیرونی ممالک کی فتح کے معنی صرف بڑی بڑی جائدادوں، بے شمار دولت، اور غیر محدود قوت حاصل ہونے کے تھے[۲]"

اس سے آگے چل کر لکھتا ہے:

"بنواُمیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے مال گذاری میں کمی واقع ہوتی تھی[۳]"

ڈی اولیری کے نزدیک اسلام کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے، مختلف مذاہب سے مختلف احکام اخذ کر کے اپنا لیا ہے، اسلامی فقہ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ ساری کی ساری رُومن لاء سے لی گئی ہے، عربوں نے اس کی دفعات کو جس طرح سے شام اور مصر میں رائج پایا ان کو قبول کر لیا، جہاں تک قانونی دیوانی کی حقیقی ضروریات کا تعلق ہے اس کا بڑا ماخذ رومی قانون تھا، اور احادیث کا بڑا حصہ ان ضروریات پر مشتمل ہے[۴]، بنوامیہ کے دور میں فقہاء قانون کی کوتاہی کو اپنی رائے سے پورا کر دیتے تھے، جس کے معنی تھے کہ حق وانصاف کا تصفیہ کرتے ہوئے ایسے شخص کی رائے سے کام لیا جا رہا ہے جو رومی قانون کی تربیت پا چکا ہے[۵]۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی غار حرا میں

---

۱ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۷۸، ۷۹۔
۲ حوالہ مذکور ص ۷۹۔
۳ حوالہ مذکور ص ۸۰۔
۴ حوالہ مذکور ص ۸۸۔
۵ حوالہ سابق۔

اس وقت نازل ہوئی جب وہ راہبانہ زندگی گذار رہے تھے، یہ عیسائیوں کی رہبانیت سے اثر پذیری کا ثمرہ تھا[۵]، اسلامی تصوف کے متعلق اس کا خیال ہے کہ یونانی اثرات کا نتیجہ ہے[۶]۔

صرف دعویٰ ہی دعویٰ

میں نے ڈی اولیری کی کتاب ''فلسفۂ اسلام'' سے یہ چند اقتباسات صرف اس لئے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں تا کہ آپ مصنف کے طریقۂ فکر کو سمجھ سکیں اور اس کے دل میں جو چور بیٹھا ہوا ہے اس کی نشاندہی ہو جائے اور اس کے دل میں اسلام کے خلاف جو جذبات کا سمندر موجیں مار رہا ہے، اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

جو شخص یہ تہیہ کر لے کہ حریف کے ہر کام اور اس کی ہر بات کی مذمت کرنی ہے تو وہ تمام حقائق سے صرف نظر کر کے ہر طرح کی رطب و یابس باتیں بلا جھجک کہہ سکتا ہے۔ وہ اپنی کتاب نہایت سادگی کے ساتھ اس طرح لکھتا ہے جیسے وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ سب مسلمہ حقائق ہیں، ان میں اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں، اس کو اپنے بیان کے لئے نہ ثبوت وشہادت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے نہ شواہد ودلائل کی حاجت، نہ کسی مؤرخ کا وہ حوالہ پیش کرتا ہے، نہ اسلامی تعلیمات وروایات اور اسلامی تاریخ سے اپنے دعویٰ کے لئے دلیل فراہم کرتا ہے۔ پوری کتاب میں دو چار مقامات پر اپنے ہم مشرب مستشرقین کے خیالات نقل کرتا ہے بقیہ سارا بیان اس کا یکطرفہ بیان ہے اور بلا دلیل ہے، اس کی حیثیت فرضی الزامات کی ایک فہرست جیسی ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود یونیورسٹیوں کے اہل علم وتحقیق آنکھ بند کر کے ایسی تمام کتابوں کو وحی الٰہی کی طرح صحیح، درست اور ناقابل انکار سمجھتے اور مانتے ہیں جس کا مصنف یورپ کی کسی یونیورسٹی کا اسکالر ہو۔ بس اتنی ہی سند ان کے لئے کافی ہے، لیکن علماء اسلام اور اسلامی علوم کے ماہرین ان مباحث کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ خود اسلام کا ان اتہامات

[۵] حوالہ مذکور ص ۲۰۱۔ [۶] فلسفہ اسلام ڈی اولیری ص ۱۹۶۔

سے کوئی واسطہ ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی تشریحات اس کے بارے میں کیا ہیں؟ اور اسلامی تاریخ کیا کہتی ہے؟ ان باتوں سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے ہم ان الزامات واتہامات پر اسلامی روایات وتعلیمات اور اسلامی تاریخ کی روشنی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ صداقت اور اصل حقیقت واضح اور روشن ہو جائے۔

تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں

اسلام پر اعتراض کرنے کا حق یقیناً ان لوگوں کو حاصل ہے جو حضور اکرم ﷺ کی رسالت اور آپ کی تعلیمات پر ایمان نہیں رکھتے، اتنی شرط ضرور ہے کہ علمی دیانتداری اور ضمیر کی آواز سے صرف نظر کر کے یہ اعتراض نہیں ہونا چاہئے، اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کا پہلا فرض ہے کہ وہ قرآن کا مطالعہ کریں احادیث کے ذخیروں سے واقف ہو جائیں، مسلمان ان دونوں چیزوں پر اس طرح ایمان رکھتا ہے جیسے دوپہر میں چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر اس کے وجود پر یقین رکھا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بلا استثناء دنیا میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے اور آج بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود ہیں ان میں سے کسی کی تعلیمات اتنے قابل اعتماد ذرائع اور مستند رسائل سے موجودہ نسل تک نہیں پہنچیں جتنے قابل وثوق اور مستند ذرائع سے قرآن اور احادیث آج کے زمانہ تک پہنچی ہیں، عہد رسالت کا پورا زمانہ اس طرح دنیا کے سامنے واضح اور روشن ہے جیسے ابھی کل کی بات ہے۔

اسلام کی ان دونوں بنیادی دستور کی کتابوں اور ان کے ایک ایک لفظ کی صداقت کو تاحد امکان بشری ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ سلسلہ سند آج تک موجود ومحفوظ ہے اور اس کے ہر ہر فرد کو ہم اس طرح جانتے پہچانتے ہیں جس طرح ایک آدمی اپنے خاندان کے افراد کو جانتا پہچانتا ہے، ان کی دیانتداری، راستبازی، تقوی و پرہیزگاری، گفتگو کاروبار اور معاملات میں صداقت ودیانت کی ہر طرح جانچ پڑتال کر لینے کے

بعد ہی ان کی روایتوں کو درجہ استناد دیا گیا ہے۔

اس لئے جب اسلام آپ کی آنکھوں کا کانٹا بن جائے تو جھنجلانے کے بجائے علمی تحقیق، دیانتداری اور اپنے ضمیر کی نگرانی میں ان دونوں چیزوں کا مطالعہ کریں اور اسلامی تاریخ سے صورت حال معلوم کرلیں، پھر اعتراض کریں، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی، بڑے سے بڑا مستشرق بلند سے بلندتر دعویٰ کرلیتا ہے لیکن جب اس کی بنیاد تلاش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری عمارت ہوا میں کھڑی کردی گئی ہے اور ان کے نام ونہاد تحقیقی مقالے میں صرف ہوائی قلعے بنائے گئے ہیں، اب تک مغربی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا مطالعہ کرنے والوں نے یہی کیا ہے اور جب اسلامی دانشوروں نے ان کے اعتراضات پر تحلیل وتجزیہ کا عمل جراحی کیا تو معلوم ہوا کہ اسلامیات کے ناقص علم نے ان کو اس بے وزن اعتراض کا راستہ دکھایا ہے، ڈی اولیری کی کتاب میں صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے ثبوت وشہادت کا دور دور تک پتہ نہیں، مگر وہ خوش قسمت ہے کہ یورپ میں پیدا ہوا اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے مسلمان پروفیسر اس کی صداقت پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اور آج بھی اس کی طرف سے صفائی دینے کے لئے تیار ہیں۔

کیا اسلام صرف عرب کے لئے تھا؟

ڈی اولیری نے سب سے پہلا دعویٰ بلا دلیل یہ کیا ہے کہ اسلام صرف عرب کے لئے تھا، اتفاقاً وہ عرب کے باہر پھیل گیا، اگر اس کا یہ الزام صرف اس لئے ہے کہ ابتدا میں مسلمان ہونے والے آپ کے دوست، آپ کی بیوی، آپ کے خاندان اور قبیلے کے لوگ تھے، آپ نے صفا کی چوٹی سے صرف قریش اور مکہ ہی کے لوگوں کو خطاب کیا یا آپ ایک بار طائف تشریف لے گئے اور آخر میں مدینہ میں تبلیغ جاری رکھی پھر اس کے بعد آپ دنیا سے تشریف لے گئے، اور تبلیغ کے سلسلہ میں ایک بار بھی آپ مدینہ سے باہر نہیں گئے، اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عرب میں محدود

سرگرمیوں کو دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپ کے مدنظر صرف عرب تھا تو اس کی کوتاہ نظری اور آپ کی دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں کا مطالعہ گہرا نہیں ہے یہ تو ایک تجرباتی اور مشاہداتی مسئلہ ہے، دنیا میں انقلابات کی تاریخ پر اگر اس کی نگاہ ہوتی تو وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا۔

ہر انقلاب، ہر بڑی تحریک، ہر بڑا منصوبہ آغاز کار میں اپنے گرد وپیش ہی کی آب وہوا میں نشو ونما پاتا ہے اور بتدریج اس کا دائرہ اثر وسعت اختیار کرتا ہے اور ایک عظیم طاقت بن کر عملی اسٹیج پر آتا ہے، اس کی ایک معمولی اور چھوٹی سی دنیاوی سیاست کی مثال کارل مارکس کی ہے، وہ اپنے خیالات کی وجہ سے روس سے جلاوطن کیا جاتا ہے اور لندن کی ایک کوٹھری میں گمنامی کی زندگی بسر کرتا ہے وہیں اپنی مشہور عالم کتاب ''کیپٹل'' لکھتا ہے جس میں اس نے مستقبل کے انقلاب کی تصویر کشی کی ہے پھر اس کو اینگلز کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے، پھر ایک اور جاں نثار لینن پیدا ہوا جو بعد میں عملی سوشلزم کا پیغمبر بنا، اس نے پرجوش نوجوانوں کی تنظیم کی اور مارکس کے نظریہ کی اشاعت کرتا رہا اس طرح کمیونزم پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا چلا گیا اس نے عقیدہ کی پختگی پیدا کر کے نوجوانوں کے سینوں میں جوش عمل کی آتش سیّال بھر دی، جس کے نتیجہ میں جگہ جگہ بغاوتوں کا آغاز ہوا، پھر زار روس کے خلاف بڑے پیمانے پر پیش قدمی کا آغاز کر دیا گیا، سمرقند وبخارا پر کمیونسٹوں کی یلغار کو ''جوشا کیونٹز'' کی کتاب ''ڈان آف سمرقند'' میں پڑھو، دیکھو کہ کس طرح اپنے نظریہ پر پختہ یقین رکھنے والوں نے روس میں انقلاب برپا کر دیا اور اکتوبر ۱۹۱۷ء میں زار روس کے محل پر کمیونسٹوں کا سرخ پرچم لہرانے لگا۔

اس پوری داستان سے تم سمجھ سکتے ہو کہ کسی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے ہر مدبر رہنما اپنے گرد وپیش سے طاقت حاصل کرتا ہے، تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ تو دنیاوی سیاست کے کرشمے ہیں، نبی ورسول کا درجہ ومرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند وبرتر ہے۔ مگر اس اعتراض سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول بھی انسان ہوتا ہے کبھی فرشتوں کو

نبی ورسول بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا گیا، جب نبی اسباب وعلل کی اس دنیا میں آتا ہے تو انھیں وسائل وذرائع سے کام لیتا ہے جو دنیائے انسانیت کے لئے قدرتی طور پر مہیا کئے گئے ہیں، بس فرق یہ ہے کہ صداقت وراستبازی دین حق کے لئے خلوص وللّٰہیت کا خون اس کی حدوجہد کی شریانوں میں دوڑتا ہے، نبی کے وسائل وذرائع بھی نیک وصالح مقدس وپاکیزہ اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی اسباب وعلل کی دنیا میں تشریف لائے تھے، آپ نے دعوت وتبلیغ کا آغاز اپنے گردوپیش ہی سے کیا، پھر بتدریج دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا۔

حضور ﷺ کی رسالت ساری دنیا کے لئے تھی

چونکہ آپ وحی الٰہی کے مطابق دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے، اس لئے وحی الٰہی نے جن حدود میں تبلیغ کا حکم دیا اس دائرے میں اس وقت تک اپنے فرض انجام دیتے رہے جب تک دوسرا حکم نہیں آیا سب سے پہلے حکم الٰہی آیا اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[1]۔ تو آپ نے اپنے عزیز واقارب کو دعوت ایمان دی، پھر خداوندقدوس کی طرف سے وحی آئی، هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ وَمُصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا[2]۔ آپ کے دائرہ کار کو بڑھا کر پورے مکہ اور اطراف مکہ تک وسیع کر دیا گیا، اس کے بعد تیسرا حکم آیا وَلِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَائُهُمْ[3]۔ اب آپ کے دائرہ کار میں پورا عرب شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ ایک طویل عرصہ سے عرب میں کوئی نبی یا رسول نہیں آیا تھا، اس کے بعد وحی الٰہی نے روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری سپرد کی اور کہا گیا وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيْراً وَّنَذِيْراً وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[4]۔ ساری دنیا کے لئے آپ رحمت بنادیئے گئے اور رحمۃ للعالمین کا تاج زرنگار فرق نبوت پر رکھ دیا

۱۔ القران، سورہ شعراء ایت ۲۱۴۔
۲۔ القران، سورہ انعام رکوع ۱۶ ایت ۹۲۔
۳۔ القران، سورہ یٰس ایت ۶۔
۴۔ القران، سورہ اعراف ایت ۱۵۸۔

گیا۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ اور اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا کہ آپ دنیا والوں سے کہہ دیں کہ میں تم سب کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں، وحی الٰہی کے الفاظ ہیں قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا[1] ۔

ان تصریحات قرآنی کے بعد ڈی اولیری کو ایک بے بنیاد دعویٰ کرنے کی جسارت کیسے ہوئی؟ یہ ایک حیرتناک امر ہے مزید ستم یہ کہ اس نے اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں دی۔

قرآن کی ان تصریحات کے بعد پھر کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی کچھ تاریخی شواہد پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ جو لوگ فہم و فراست کے بجائے حقائق کو ہاتھوں سے ٹٹول کر تسلیم کرتے ہیں ان کے لئے بھی گفتگو کی گنجائش نہ رہ جائے۔

صلح حدیبیہ ۶ ھ کے بعد ۴½ سال کی مدت میں آپ نے بڑے وسیع پیمانے پر اپنی دعوت کو عرب کے باہر عام کرنے پر پوری توجہ فرمائی، ایک زمانہ مجبوریوں کا وہ تھا کہ چند اوباش آپ کو نماز میں بھی ستانے سے باز نہیں آتے تھے ایک وقت یہ آیا جب آپ اس دور کی دو بڑی حکومتوں کے سربراہوں قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھ کر اسلام کی دعوت دینے لگے۔

دعوتِ اسلام کے لئے عالمی جدوجہد

قرآن نے بتدریج آپ کے دائرہ کار کی وسعت کا ذکر کیا ہے، حضور اکرم ﷺ کا دائرہ عمل بھی انھیں حکموں کی روشنی میں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور جب ۶ ھ میں مشرکین مکہ سے حدیبیہ کے مقام پر دس سالوں کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوا اس کے بعد اطمینان کی سانس لینے کا موقع ملا، اس صلح نامہ کی ترتیب کے بعد آپ نے اسلام کی دعوت کو عرب سے باہر پھیلانے اور دائرہ کار کو وسیع کرنے پر خصوصی توجہ فرمائی اور عملی سرگرمیوں کا آغاز فرما دیا۔ اسی سال شہنشاہ دو عالم کے لئے سرکاری کاموں کے واسطے بڑے اہتمام سے مہر بنوائی گئی تاکہ دنیا کے بادشاہوں کے پاس شہنشاہ دو عالم کا حکم

[1] القرآن، سورہ اعراف ایت ۱۵۸۔

نامہ سرکاری مہر کے ساتھ روانہ کیا جائے آپ نے سیکڑوں خطوط لکھوائے اور صحابہ کے ذریعہ اندورن عرب اور بیرون عرب کے حکمرانوں، قبائلی سرداروں، علاقے کے چودھریوں، پادریوں اور گورنروں کو پروانے بھیجے، ان خطوط میں نرم لب ولہجہ میں بھی ان کو اوران کے ملک کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی گئی[۱]۔ احادیث کے ذخیرے میں ایسے بہت سے خطوط کا ذکر ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف وجوانب اور عرب کے باہر کے حکمرانوں کو ارسال فرمائے۔

اور بعض خطوط کے مضامین بھی نقل کئے گئے ہیں[۲]۔ اور قاصد کا بھی نام ہے[۳]۔ اور بعض خطوط جب مکتوب الیہ تک پہنچے اوراس کا جو رد عمل ہوا اس کا بھی ذکر ہے، قیصر کا ان لوگوں کا تلاش کرانا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذاتی طور پر واقف ہوں جیسے ابوسفیان سے حضورؐ کے بارے میں قیصر کے سوالات[۴]، اسی طرح شاہ ایران کسریٰ کا مکتوب نبویؐ کو پڑھ کر چاک کرنا[۵] اور حضورؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجنا اور حضورؐ کا اس کے حکم میں بددعا اوراس کے الفاظ بھی روایتوں میں موجود ہیں[۶]، دعوتی خطوط کے ملنے پر کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا حکومت ایران کے گورنر منذر ابن ساریٰ کا ایمان قبول کرنا[۷]، بحرین کے ایک علاقہ ہجر کے متشدد مجوسی حاکم کا جو حکومت ایران کی طرف سے تھا حضرت علاء حضرمی کے ہاتھ مسلمان ہونا، شام کی ایک ریاست کے حاکم فروہ کا ایمان لانا اور نذر عقیدت کے طور پر حضورؐ کی خدمت میں ہدیہ وتحفہ بھیجنا تاریخوں میں مذکور ہے[۸]۔

اگر حضورؐ کے پیش نظر صرف عربوں کی اصلاح ہوتی تو حبش، روم، شام، بحرین،

---

۱ مقوقس کے نام خط میں فان تولیت فعلیك اثم القبط اور قیصر کے نام خط میں ان تولّیت فعلیك اثم الادیسیین کے الفاظ ہیں مشکوٰۃ ص ۳۴۱، بخاری ومسلم دونوں میں یہ روایت ہے۔

۲ حوالہ مذکور۔

۳ بخاری شریف ج ۱ ص ۴، مشکوٰۃ ص ۳۴۱۔

۴ بخاری ج ۱ ص ۴۔

۵ البدایه و النهایه (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۸۔

۶ البدایه و النهایه ج ۴ ص ۲۶۹۔

۷ فتوح البلدان ص ۷۹ الکامل (ابن اثیر) ج ۲ ص ۷۵۔

۸ سیرت ابن ہشام الاسلام فروہ وذکر وفودہ۔

مصر اور ایران کے حکمرانوں اور سربراہوں کو خطوط لکھنے اور دعوت اسلام دینے کی کیا ضرورت تھی، حالانکہ تاریخ ہمارے سامنے تقریباً ڈھائی سو خطوط لکھنے اور ارسال کرنے کی شہادت دیتی ہے جو آپ نے مختلف قبائل شیوخ صوبہ جاتی افسران اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے ہیں اور بعض خطوط سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٦ ھ سے بھی پہلے لکھے گئے ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ حبش اصحم کے نام جو خط ہے اس میں یہ الفاظ ملتے ہیں **قد بعثت الیکم ابن عمی و معه نفر من المسلمین فاذا جائك فاقرهم دو ع التجیر**[۱]. یہ خط اس وقت لکھا گیا جب مظلوم مسلمانوں کا ایک گروہ جعفر ابن ابی طالب کی ہمراہی میں حبشہ ہجرت کر رہا تھا۔

یہ واقعہ صلح حدیبیہ سے بہت پہلے کا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عرب سے باہر دعوت و تبلیغ کا کام آپ شروع کر چکے تھے۔

دعوتی خطوط کی نا قابل انکار شہادتیں

اگر حضورؐ صرف عربوں کے لئے مبعوث ہوئے ہوتے تو یہ خطوط عرب کے باہر کے لوگوں کو کیوں تحریر فرماتے، ظاہر ہے کہ آپ کی بعثت چونکہ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے تھی اس لئے جب حالات نے اجازت دی آپ نے پہلی فرصت میں اسلام کی دعوت کو عرب کے باہر پہنچایا اور سیکڑوں خطوط لکھے، قاصد بھیجے، ان خطوط اور خطوط لے جانے والوں کا ذکر روایتوں میں مذکور ہے، عصر جدید کے محققین نے ان خطوط میں سے کئی ایک کی اصل کو دریافت بھی کیا ہے اور ماہرین اثریات نے اس کی جھلی یا چمڑا جس پر یہ تحریر ہے اور اس کی روشنائی وغیرہ کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ یہ وہی خط ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکتوب الیہ کو بھیجا تھا، یہ خط اصلی ہے، نقل نہیں، اور غیر مسلم محققین نے اعتراف کیا کہ اگر ان خطوط کو عہد رسالت میں لکھے جانے کا مسلمان دعویٰ کرتے ہیں تو وہ تحقیق کی کسوٹی پر صحیح اور نا قابل انکار معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ

[۱] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۸۳ خط کا مضمون ابن کثیر کے علاوہ طبری، ابن القیم اور قسطلانی نے بھی نقل کیا ہے، اس خط پر تفصیلی گفتگو کے لئے دیکھئے ''ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس کی کتاب حضور اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی ص ۱۰۶ تا ۱۰۸''۔

نے جو عرصہ دراز سے فرانس میں علمی کام کرتے ہیں ان دریافت شدہ خطوط کی چھان بین کی ہے اور ان خطوط کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

''میں ۱۹۳۹ء میں آکسفورڈ ''کتبات مدینہ'' کے موضوع پر لیکچر دینے گیا تو مارگیولیث نے بتایا کہ اسکاٹ لینڈ کے مستشرق ڈی، ایم ڈنلاپ ساکن برائڈ (اسکاٹ لینڈ) کا بیان ہے کہ نجاشی کا یہ خط فلطین کے ایک پادری کے پاس سے حال ہی میں خریدا گیا ہے، پھر اسی مستشرق سے میری خط وکتابت ہوئی اور اس نے خط کی فوٹو کاپی مجھے بھجی، یہ خط وہی ہے جسے مشہور مؤرخ طبری، ابن قیم، قسطلانی اور قلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے[۱]۔''

ڈاکٹر حمید اللہ کا بیان ہے کہ ڈی، ایم، ڈنلاپ نے مجھے لکھا ہے کہ یہ خط ایک جھلی پر لکھا ہوا ہے جو کوئی ۱۹، انچ چوڑی اور ۱۳ ½ انچ لمبی ہے، حروف مدور ہیں اور بڑے ہونے کے باعث پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، سیاہی جو استعمال کی گئی ہے وہ خاکی (براؤن) ہے خط کا مضمون ۱۷ سطروں میں ہے جس کے آخر میں ایک گول مُہر کا نشان ہے جس کا قُطر ایک انچ ہے، پھر ڈنلاپ نے اسی ترتیب سے خط نقل کیا ہے جس ترتیب سے مکتوب نبویؐ میں ہے ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے اصلی ہونے پر ناقابل تردید دلائل وشواہد پیش کئے ہیں اور یہ مضمون اور خط پر تحقیق وتبصرہ اُردو ہی نہیں انگریزی اور فرانسیسی زبان کے رسالوں میں شائع ہو چکا ہے جس کی تردید کسی محقق نے نہیں کی[۲]۔

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف عرب کے لئے تھی تو شاہ حبش کو یہ خط لکھنے اور اس کو دعوت ایمان دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ شہادت تو صرف ان لوگوں کے لئے پیش کی جارہی ہے جن کے دلوں کی درستی سلب ہو چکی ہے اور مادی آنکھوں سے دیکھ کر ہی کسی صداقت کو تسلیم کر سکتے ہیں ورنہ یہ خط تو روایتوں اور تاریخ کی کتابوں

---

[۱] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، (ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس) ص ۱۰۸۔
[۲] تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر حمید اللہ کی مذکورہ کتاب۔

میں موجود ہے اور ساری علمی دنیا اس سے واقف ہے، اگر ان خطوط میں سے ایک کا بھی آج وجود نہ ہوتا تب بھی اس صداقت پر حرف نہیں آ سکتا کہ حضورؐ نے اپنی وفات سے کئی سال قبل دعوتی خطوط لکھوا کر بیرون عرب کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دی تھی۔

دوسرا مشاہداتی ثبوت

ایک دوسرا مشاہداتی ثبوت مقوقس کے نام لکھے جانے والے حضورؐ کے مکتوب گرامی کی اصل کی دریافت ہے، مقوقس مصر کا صوبیدار اور صدر پادری تھا، اس مکتوب نبویؐ کی باز یافت فرانسیسی مستشرق موسیواے، ٹی این بارتل می نے کی ہے، اس خط پر ایک مفصل مضمون ''موسیو نے نو'' نے فرانسیسی زبان کے ایک رسالہ میں لکھا تھا، یہ وہ خط ہے جو حضورؐ نے مقوقس کے نام لکھا تھا اس کو فرانسیسی مستشرق نے مصر میں اخمیم کے قریب ایک راہب خانے میں پایا تھا، اس کی حفاظت میں کتنی احتیاط کی گئی تھی اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں، جب پوری احتیاط کے ساتھ وہ جھلی یا کھال جو ایک دوسرے موٹے چمڑے میں چپکائی ہوئی تھی کھولا گیا تو اس میں ٹھیک وہی خط موجود ہے، جو عیسائی حکمرانوں اور خود مقوقس کو لکھا گیا تھا جس کا مضمون روایتوں اور تاریخوں میں موجود ہے، اگر چہ اس کے اصلی ہونے پر بعض یہودیوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کچھ شبہات کا اظہار کیا ہے لیکن وہ صرف قیاسی اور سطحی ہیں اور اس کا مدلل جواب دیا گیا ہے دریافت شدہ خط کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، من محمد عبد اللّٰہ ورسولہٖ الٰی المقوقس عظیم القبط، سلام علٰی من اتبع الھدیٰ، اما بعد، فانی ادعوك بدعایة الاسلام، فاسلم، تسلم، یوتك اللّٰہ اجرك مرتین، فان تولیت، فعلیك اثم القبط، یا اھل الکتاب تعالوا الٰی کلمة سواء بیننا وبینکم الا تعبدوا الا اللّٰہ ولا تشرك به شیئا ولا تتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللّٰہ، فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔[1]

[1] ''رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی'' ڈاکٹر حمید اللہ ص ۱۳۶، ۱۳۷ خط کے آخر میں اسی طرح کی مہر ہے جو بخاری میں مذکور ہے کان نقش الخاتم ثلثة اسطر ج۲ص۸۷۳۔

یہ عبارت فرانسیسی مستشرق نے خود اس دریافت شدہ جعلی کے خط سے نقل کی ہے، ٹھیک یہی عبارت تاریخوں[1] اور روایتوں میں بھی پڑھ لیجئے جو چودہ سو برسوں سے ساری دنیا میں پڑھی جارہی ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

مقوقس کے نام دریافت شدہ مذکورہ خط کا مضمون دو تین خطوں میں اور بھی ملتا ہے بالخصوص قیصر کے نام جو خط ہے اس کے بھی الفاظ یہی ہیں پس فرق یہ ہے کہ مقوقس کے نام خط میں **عليك اثم القبط** ہے اور قیصر کے خط میں **عليك اثم الاريسيين** کا جملہ ہے باقی ابتدا سے انتہاء تک ایک ہی عبارت ہے[2]۔ اتفاق سے دریافت شدہ خطوط میں تحریر بھی ایک ہی کاتب کے قلم سے ہے، جس کی وجہ سے کچھ یہودی مستشرقین کو یہ موقعہ ملا کہ ان خطوط کو جعلی ثابت کریں لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔

ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ عیسائیوں کے سربرآوردہ اور ممتاز افراد کو جو خطوط لکھے گئے چونکہ مخاطبین سب ایک ہی ذہن وفکر کے ہیں، سب کا مذہب بھی ایک ہی ہے، اور سب کو دین عیسوی کو چھوڑ کر اسلام کی دعوت دینی ہے اس لئے قدرتی طور پر ہر ایک مضمون ایک ہی ہونا چاہئے تھا اس لئے اگر عیسائیوں کے نام لکھے گئے خطوط میں ایک ہی مضمون ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے یہ اس کی جعلی ہونے کی دلیل کیسے بن گئی؟ کیونکہ ہر ایک سے وہی بات کہنی تھی جو خط میں مذکور ہے اور یہ بھی شک وشبہ کی بات نہیں کہ تمام خطوں کی تحریر یکساں ہے، ہوسکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے نام متعدد خطوط ایک ہی کاتب سے لکھوائے ہوں، یہ تو روزمرہ کا تجربہ ہے آج بھی تمام دفاتر میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس دور میں نہ کاغذ تھا اور نہ پریس، نہ

---

1. مشکوٰۃ ص ۳۴۰، ۳۴۱، بخاری جلد ۱ ص ۵، مسلم جلد ۲ ص ۹۷۔
2. البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۲۷۲، زرقانی ج ۳ ص ۳۴۷۔

سا ئیکلوسٹائل کا وجود تھا نہ فوٹو اسٹیٹ کی سہولت، اس لئے ایک مضمون دے کر کاتب سے کہہ دیا گیا کہ اس کی اتنی کاپیاں تیار کردو نام کی جگہ چھوڑ دینا، آج ہم سب روزمرہ یہی کرتے ہیں اس لئے اگر کئی خطوں کی تحریر ایک سی ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

دریافت شدہ نجاشی، مقوقس اور منذر بن ساویٰ کے خطوط پر جو مہر ہے وہ ٹھیک وہی ہے جس کی تفصیل حدیثوں میں مذکور ہے۔ بخاری میں جو روایت ہے اس کے الفاظ ہیں **كان نقش الخاتم ثلثة اسطر محمد سطر، ورسول سطر و الله سطر**[۱]۔

یعنی لفظ محمد اس کے اوپر کی سطر میں لفظ رسول اور اس کے اوپر کی سطر میں لفظ اللہ منقوش تھا دریافت شدہ خط پر وہی مہر ہے، اگر خط جعلی ہوتا تو مہر کی قلم سے نقل نہیں ہوسکتی تھی، اس طرح محقق علماء اور ماہرین اثریات نے دلائل سے دریافت شدہ تینوں خطوط کے اصل ہونے کو ثابت کیا ہے۔

سرکار رسالت مآب کا ایک اور خط

تیسرا خط امتداد زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گیا تھا اس کی دریافت ابھی دمشق میں ہوئی ایک فرانسیسی مستشرق نے مسلمانوں کے بھیس میں جا کر کسی گھرانے سے حاصل کیا ہے، یہ خط منذر بن ساویٰ کے نام ہے جو حکومت ایران کی جانب سے بحرین کا گورنر تھا اس خط کے اصل ہونے پر ناقابل تردید دلائل وشواہد پیش کئے گئے ہیں یہ خط بھی جھلی پر لکھا ہوا ہے اور ٹھیک وہی عبارت ہے جو تاریخوں اور روایتوں میں پائی جاتی ہے[۲]، ماہرین اثریات نے جھلی اور روشنائی وغیرہ کی قدامت کو تسلیم کیا ہے۔

ڈھائی سو مکاتیب نبویؐ

اسی طرح عرب سے باہر قیصر روم کے ساتھ ایران کے بادشاہ کسریٰ کے نام بھی

۱؎ مشکوٰۃ ص۳۷۸، کتاب اللباس باب الخاتم، بخاری جلد۲ص۸۷۳۔

۲؎ فتوح البلدان (بلاذری) ایڈیشن ۱۹۸۷ء ص۱۰۸۔

آپ کا خط روایتوں میں بہ تصریح موجود ہے اور خط لے جانے والے صحابی کا نام بھی وہیں مذکور ہے، مغرور کسریٰ نے خط چاک کر کے اس کی بے حرمتی کی تو اس پر آپ نے بددعا فرمائی[۱]۔

کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر باذام کو حکم بھیجا کہ دو مضبوط اور طاقتور آدمیوں کو مدینہ بھیج کر اس شخص کو گرفتار کرو جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور گرفتاری کے بعد میرے پاس بھیج دو، باذام نے دو آدمیوں کو مدینہ بھیجا۔ انھوں نے مدینہ سے واپس جا کر باذام سے صورت حال بیان کی تو اس کے دل نے کہا کہ وہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، خود بھی مسلمان ہو گیا اور ایران کے جتنے لوگ سرکاری دفاتر میں کام یا یمن میں تجارت کرتے تھے سب کے سب مسلمان ہو گئے[۲]۔

اب تک ان خطوط کا ذکر ہوا جن کے مضامین روایتوں میں موجود ہیں، ان کے علاوہ بہت زیادہ خطوط وہ ہیں جن کی تفصیل نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں کہاں بھیجے گئے، مشہور ماہر مخطوطات واثریات ڈاکٹر حمیداللہ نے اپنی تحقیق وتفتیش کے بعد ان کی تخمینی تعداد ڈھائی سو بتائی ہے، یہ تمام خطوط آپ کی وفات سے چار پانچ سال پہلے لکھے گئے ہیں جب کہ ابھی عرب کا بیشتر علاقہ نخل اسلام کی چھاؤں میں نہیں آیا تھا اور جس وقت بیرون عرب خطوط لکھے جا رہے تھے عرب میں مسلمانوں کی تعداد بہت مختصر تھی، کیونکہ ۶ ھ میں جب آپ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور مسلمانوں میں یہ خبر عام ہوئی تو ہر مسلمان حضورؐ کی معیت میں مکہ جا کر عمرہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کے باوجود صرف ۱۴ سو صحابہ کرام آپ کے ساتھ اس سفر میں تھے[۳]۔ اسی سے ۶ ھ میں عرب میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ ابھی بہت بڑے پیمانے پر دعوت وتبلیغ کا کام خود عرب میں باقی تھا اس کے باوجود آپ نے عرب کے باہر تک

۱۔ مشکوٰۃ ص ۳۴۱، بخاری جلد ۲ ص ۶۷۳، کتاب الجہاد باب کتاب النبی الیٰ قیصر وکسریٰ، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۹

۲۔ البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۴ ص ۲۶۹، ۲۷۰۔

۳۔ مشکوٰۃ ص ۲۵۰، کتاب الجہاد باب قسمۃ الغنائم، بعض روایتوں میں ۱۵ سو کی تعداد مذکور ہے۔ دیکھئے ابوداؤد جلد ثانی ص ۳۷۵، کتاب الجہاد باب فی اسہم لہ سہم۔

دعوت و تبلیغ کے دائرے کو وسیع فرما دیا، صرف اس لئے کہ وحی الٰہی نے آپ کو مطلع کر دیا تھا کہ سابقہ انبیاء کے برخلاف آپ سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے نبی بنائے گئے ہیں، خود آپ کا ارشاد ہے۔

کان النبي یبعث الٰی قومه خاصة وبعثت الی الناس کافة[۱].

انبیاء سابقین صرف اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے اور میں سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

عربوں کی اصلاح پر خصوصی توجہ کی وجہ

یہ حقیقت ہے کہ آپ نے پورے جزیرۂ عرب کو اسلام کے دامن میں سمیٹ لینے کی جد و جہد فرمائی تا کہ مستقبل میں اس کو اسلام کا مضبوط مرکز بنایا جاسکے اس لئے سرزمین عرب میں سوائے توحید پرستوں کے کسی کو سکونت کی اجازت نہیں دی، اور آپ نے صحابہ کرام کو وصیت فرمائی **اخرجوا الیهود والنصاریٰ من جزیرة العرب.** یہودیوں اور نصرانیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دینا۔

اسی کے ساتھ مشرکین کو بھی نکال دینے کا حکم فرمایا جو اپنے خبث باطنی کی وجہ سے کسی حال میں ایمان نہیں لا سکتے تھے، ان کے علاوہ عام مشرکین کا حال یہ تھا کہ وہ جس تیزی کے ساتھ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اس سے یہ یقین بڑھتا جا رہا تھا کہ چند برسوں میں پورے عرب میں سوائے توحید پرستوں کے بت پرستوں میں سے کوئی باقی نہیں رہ جائے گا، قرآن میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے **ورأیت الناس یدخلون فی دین الله افواجا.** حجۃ الوداع ۱۰ھ کے موقعہ پر یہ خیال حقیقت بن کر سامنے آ گیا، آپ نے اپنے مشہور خطبہ میں یہ جملہ بھی کہا تھا۔

الا، ان الشیطان قد اَیِسَ ان یعبد فی بلدکم هذا[۲].

۱؎ بخاری شریف جلد اول کتاب الصلوٰۃ باب جعلت لی الارض مسحد او طهورا ص۶۲۔

۲؎ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج۵ ص۱۹۸، ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

سن لو، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے شہر میں اس کی پرستش ہو۔

ان حالات میں یہودیوں اور نصرانیوں کا جو درحقیقت مشرکوں کے حکم میں آچکے تھے باقی رکھنا ایک رسول کے لئے کیسے ممکن تھا جس کی شریعت دوسری تمام شریعتوں کو منسوخ کرنے والی ہے، چونکہ فطرت اور ان کے مخصوص ذہن ومزاج کی وجہ سے ان کا ایمان قبول کرنا ناممکن تھا اس لئے سفرِ آخرت سے پہلے آپ نے صحابہ کرام کو وصیت فرمائی کہ ان دونوں قوموں کو سرزمین توحید سے باہر کردینا تمہارا فرض ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں پورے عرب کا مسلمان ہونا ضروری تھا اس لئے ان پر پوری توانائیاں صرف کی جارہی تھیں، جس اسلام کو مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے آخری کناروں تک پہنچنا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے جوش عمل اور قوت کارکردگی سے بھرپور جماعت کی ضرورت ہے جس پر مستقبل میں اشاعتِ اسلام کی ذمہ داری آنے والی ہے اس لئے آپ نے ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کا مکمل نمونہ اور ایمان کی زندہ، متحرک اور چلتی پھرتی تصویر بن جائیں تاکہ ان کے اخلاق واعمال بلکہ صرف ان کی صورتوں کو دیکھ کر دوسروں کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوجائے۔

تاریخ کی شہادت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں ایسی جماعت پیدا کردی جس نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلا دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کردیا۔ اور فیضان نبوت کو روئے زمین کے کناروں تک پہنچا دیا۔ یہ اسی مقدس وبابرکت جماعت کی مخلصانہ جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ دنیا کا کوئی قابل ذکر ملک ایسا نہیں جہاں **لا الٰہ الا اللّٰہ** کے ساتھ **محمّد رسول اللّٰہ** کی شہادت دینے والے موجود نہ ہوں۔

ایک اور شہادت

میری اس تفصیلی گفتگو سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اپنی عالمی ذمہ داریوں سے ہر دور میں آگاہ تھے اور اسی نقطہ نگاہ سے دعوت وتبلیغ بھی فرمائی، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۲۳ سالہ دور نبوت میں آپ عرب سے باہر کبھی تشریف نہیں لے گئے اور روئے زمین پر بسنے والے سارے انسانوں تک بھی ابھی آپ کا پیغام نہیں پہنچا تھا، البتہ اس کی داغ بیل ڈال دی گئی تھی۔

جس طرح ایک مدبر سیاستداں مستقبل کا خاکہ بناتا ہے، کام کا نقشہ مرتب کرتا ہے، طریقہ کار کی تعیین کرتا ہے اور مخلص وجاں نثار اور قائد کے نظریہ پر مستحکم یقین رکھنے والی جماعت بنا کر اس کو راہ کے نشیب وفراز سمجھاتا ہے اور ہدایات دیتا ہے تا کہ آئندہ اس خاکہ میں اس کی منشاء کے مطابق رنگ بھر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی اصول پر اپنی امت کی ترتیب فرمائی اور پورے جزیرۂ عرب میں اسلامی زندگی کو اتنا مستحکم بنادیا کہ وہ شکست وریخت کا شکار نہ ہوسکے اور اس کو اتنا جوش عمل، عظمت کردار اور قوت کارکردگی سے بھر دیا کہ وہ مستقبل کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لائق ہوگئی، تب آپ نے اپنی تربیت کردہ جماعت کو جمع کر کے ایک عام وصیت فرمائی، جس کی روایتوں اور تاریخوں میں خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے، یہ خطبہ حج کا رکن نہیں تھا، آپ کو معلوم تھا کہ اس کے بعد حج کے اس اجتماع میں میں شریک نہ ہوسکوں گا اس لئے آپ نے پوری امت کو آخری وصیت فرمائی اور ایک لاکھ ۲۴ ہزار کے مجمع کو خطاب فرماتے ہوئے کہا: **لَعَلّی لا اراکم بعد عامی ھذا**[۱] شاید اس سال کے بعد میں تمہیں یہاں نہ دیکھ سکوں، اسی جملہ کی وجہ سے محدثین نے اُسے وصیت عامہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے آپ نے صرف ایک چھوٹے سے جملہ میں ان کے فرض کو بتادیا **فیبلغ الشاھد الغائب** جو لوگ میری باتیں سن رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ میری باتیں میرا پیغام ان لوگوں تک پہنچائیں جو لوگ یہاں موجود نہیں ہیں۔

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۱۸۴، بخاری ج ۱ ص ۲۳۴، کتاب المناسک باب الخطبہ ایام منیٰ، مسلم شریف کتاب الحج باب حجة النبی دلائل النبوة (بیهقی) تاریخ یعقوبی ۲ ص ۱۲۳ المستدرك للحاكم ص ۱۹۳، ابوداؤد كتاب الحج باب صفة حج النبی وغیرہ.

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عرب اپنی جہالت اور وحشت و بربریت کے باوجود انتہائی مغرور تھا اپنی زبان، اپنی نسل، اپنے نسب میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا اور مستقبل میں اشاعت اسلام کی ذمہ داری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سپرد کرنے والے ہیں، اس لئے عربوں کے فخر و غرور کو توڑ کر ان کو اس لائق بنانا ضروری تھا کہ وہ اس فریضہ کو منشاء رسول کے مطابق پورا کرسکیں، نسل و نسب کا انتہا پسندانہ غرور عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور اب ان کو عرب سے باہر اشاعتِ اسلام کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جانا ہے اس لئے اسلامی دستور ان کو ذہن نشین کرادیا گیا، آپ نے فرمایا:

ایها الناس! لا، ان ربکم واحد وان اباکم واحد لا، لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ[1] .

لوگو! خوب غور سے سن لو، تمہارا رب ایک ہے اور بلاشبہ تمہارا باپ ایک ہے غور سے سنو، کسی عربی کو عجمی پر کسی عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

یہ الفاظ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ اسلام صرف عرب ہی کے لئے نہیں ہے یہ حبش کے کالوں میں بھی پہنچے گا اور یورپ کے گوروں میں بھی، مصر کے قبطیوں، افریقہ کے بربروں اور ایشیا اور ترکستان کے سرخ رنگ والوں تک اس کا پہنچنا ضروری ہے جب سوا لاکھ مخلص جاں نثار عربوں کی جماعت کلی طور پر تربیت پا چکی تو آپ نے اس کو حکم دیا **ولیبلغ الشاهد الغائب**[2] . میرا پیغام ان لوگوں کو پہنچانا جو یہاں نہیں ہیں یعنی میرا پیغام ہواؤں میں اڑ کر سمندروں میں تیر کر پہاڑوں کو عبور کر کے دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا اب تمہاری ذمہ داری ہے، تاریخ غیر مبہم لفظوں میں گواہی دیتی ہے

---

[1] تاریخ یعقوبی مطبوعه دارصادر ج۲ ص۱۰۹، مسند احمد بن حنبل.

[2] بخاری ج۱ ص۲۳۴، کتاب المناسك باب الخطبة ایام منیٰ.

کہ صحابہ کرام نے منشاء رسول کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا اور اسلام کے پیغام کو وہاں تک پہنچایا جہاں تک اس دور میں طائر فکر بھی اڑ کر نہیں پہنچتا تھا، ان تمام حقائق کے باوجود ڈی اولیری کا یہ دعویٰ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف عربوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے، کتنا سطحی و کتنا لچر کتنا لغو اور بے بنیاد ہے۔

اسلامی فقہ رومن لا سے ماخوذ ہے

ڈی اولیری نے اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کے مذہب کی انفرادیت وعظمت اس کی امتیازی خصوصیات اور اس کے تقدس وطہارت کو داغدار بنانے کے لئے یہ الزام لگایا ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی فقہ رومن لاء کا چربہ ہے، مسلمانوں کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے، دوسرے ملکوں کو جب فتح کیا تو وہاں کے نافذ العمل دستور، طور طریق اور رسم ورواج کو اپنا لیا بالخصوص شام کی فتح کے بعد عیسائیوں کے دیوانی وفوجداری قوانین کو اپنا کر اس کو اسلامی فقہ کا نام دے دیا ہے، لیکن اپنے اس دعویٰ پر بھی اس نے کوئی دلیل نہیں دی ہے جیسا کہ پوری کتاب میں اس نے کیا ہے۔

یہ الزام واتہام کچھ نیا نہیں ہے، اس سے پہلے مسٹر شیلڈن ایموز (SHELDN AMAS) نے جو لندن یونیورسٹی میں لکچرار تھے اسلام پر یہی الزام لگایا ہے اور اس کو ثابت کرنے پر پورا زورِ قلم صرف کیا ہے[1]، ڈی اولیری کا بیان اسی کی صدائے بازگشت ہے، اس لئے ہمیں اس کو پڑھ کر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

حقیقت کیا ہے؟

انسان سماج کے چوکھٹے سے باہر نہیں جاسکتا، سماج کے مسائل سے دوچار رہونا ناگریز ہے، آغاز تمدن کی تاریخ ہی سماجی مسائل کی پیدائش کی تاریخ ہے، انسانوں کے ذہن ومزاج طبعی جذبات ومیلانات میں اختلاف ہونا ضروری ہے انھیں اسباب کی

[1] شیلڈن ایموز انیسویں صدی کی آخری دہائی ۱۸۹۳ء میں لندن یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں لیکچرار تھے انھوں نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔

وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے رہے ہیں یہ آغاز آفرینش سے ہے ہابیل قابیل کا واقعہ اس کی سب سے بڑی شہادت ہے[1]۔ مسائل جب پیدا ہوئے تو ہر دور میں ان کو حل کرنے کی کوششوں کا بھی سلسلہ جاری رہا، ثالث، حکم، پنچائت، قبائلی دستور، برادرانہ رسم ورواج کئی صورتیں تھی جن کے ذریعہ سماجی معاملات کا فیصلہ کیا جاتا تھا جب تمدن آگے بڑھا، مدنیت ترقی کی راہوں میں گامزن ہوئی تو باقاعدہ ضابطہ وقانون، دستور اور اصول مرتب کئے گئے اس لئے فوجداری اور دیوانی وغیرہ کے قوانین ہمیشہ سے موجود رہے ہیں بس فرق یہ تھا کہ ابتداءً وہ بہت سادہ شکل میں تھے، بعد میں ان کو سائنٹفک اصولوں کے تحت مدون کیا گیا۔

ہمیں اس بات کے تسلیم کرلینے میں کوئی تأمل نہیں کہ عہد رسالت میں روم وایران کا تمدن بڑی حد تک ترقی پذیر تھا، حکومت کے قوانین ایک حد تک نافذ العمل تھے، اگرچہ شہنشاہیت (امپریلزم) ہونے کی وجہ سے بادشاہ کا ہر حکم قانون بن جاتا تھا اس کے علاوہ ان قانونی حکومتوں کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ بادشاہ کی ذات قانون سے بالاتر تصور کی جاتی تھی جسکی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں چوری، ڈکیتی، قتل، آبروریزی، فریب دھوکہ دہی، غصب، خیانت، بددیانتی وغیرہ ہر سماج میں مذموم، قابل سزا جرم تھے۔ ہر سماج اس کا انسداد اور مجرم کو سزا دینے کے اپنے اصول رکھتا تھا اور اس کے مطابق معاملات کا تصفیہ کیا جاتا تھا اور جب تمدن ذرا آگے بڑھا تو ان رواجوں کو قانونی شکل دے دی اور ان کے مطابق دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل کئے جانے لگے۔

جرائم کا وجود ہر دور میں رہا، ان کے انسداد کی کوشش کرنے والے اور مجرم کو سزا دینے والے بھی ہر زمانہ میں رہے اس لئے بہت سے جرموں کی سزا دور دور کے قانون میں اگر ایک ہے تو اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بعد کا قانون پہلے قانون ہی کی وجہ سے وجود میں آیا، اسی طرح انسانی حقوق میں غصب اور حق تلفی سے کمزور

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۱، الآیۃ سورہ مائدہ، آیت ۲۸۔

افراد کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر زمانہ میں دستور بنائے گئے اس لئے اگر دونوں زمانوں میں ایک ہی طرح سے ان مسائل کو حل کیا گیا تو اس کے معنی نہیں کہ پہلا قانون دیکھ کر بعد کا قانون بنایا گیا بلکہ زیادہ تر ایسا ہوا کہ بعد کے قانون سازوں کو پہلے کے قانون کی خبر تک نہیں ہوتی تھی اتفاق سے انہوں نے جو قانون وضع کیا وہ ٹھیک وہی ہے جو پہلے کسی ملک یا حکومت میں نافذ تھا تو اس کو توارد کہا جا سکتا ہے سرقہ سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسلمانوں کے دیوانی اور فوجداری قوانین کا حال ہے، اگر اسلام کے کچھ قوانین رومن لاء کے مطابق ہیں تو اس کی وجہ سے یہ طعنہ نہیں دیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے پاس فقہ کے نام سے قوانین کا جو مجموعہ ہے وہ سب کا سب رومن لاء سے ماخوذ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے متعلق ہزاروں مسائل ہیں جن کا حل اسلامی فقہ میں کیا گیا ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے، اور ہزاروں صفحات میں یہ قوانین پھیلے ہوئے ہیں تو کیا تم یہ کہو گے کہ یہ بھی رومن لاء سے ماخوذ ہیں؟ یہ موشگافیاں، دقیقہ رسی، باریک بینی جو ان قوانین کی تشکیل میں کارفرما ہے کیا اس سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ ہزاروں مذہبی قوانین اتنی دقتِ نظر اور دماغ سوزی سے بنا سکتے ہیں دیوانی اور فوجداری کے قوانین کی تشکیل کے وقت ان کی ذہانت وفطانت ان کی ذکاوت ونکتہ رسی اور دقت نظری ناکام ہو جائے گی؟

اسلامی دستور وقوانین کا ماخذ

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے ماخذ دو ہیں قرآن اور حدیث، ان دونوں سے بے نیاز ہو کر اگر کوئی قانون بنایا جائے گا تو وہ اسلامی عدالت میں قابلِ قبول نہیں ہوگا، جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل ہیں سب کی اصل قرآن اور احادیث سے ثابت ہے بالکل اسی طرح دیوانی اور فوجداری قوانین کے

لئے سب سے پہلے قرآن وحدیث میں اس کی اصل تلاش کرنا ضروری ہے جب اصل دریافت ہو جاتی ہے تو اس کی روشنی میں کوئی قانو وضع کیا جات ہے، خرید وفروخت کاروبار تجارت، وراثت ووصیت، نکاح وطلاق، خلع، ہبہ ونفقہ، حق شفعہ، وکالت اور حق ملکیت، قبضۂ غاصبانہ غرضیکہ انسان کی زندگی میں پیش آنے والے سارے مسائل کے لئے جو اسلامی قوانین ہیں ان کی اصل پہلے قرآن وحدیث میں تلاش کرنے کے بعد اس پر تفریعات کی جاتی ہیں اور اس کی جزئیات مرتب کی جاتی ہیں اگر کوئی بھی تفریع اصول حدیث سے مزاحم ہوتی ہے تو وہ قانون کی شکل اختیار ہی نہیں کرسکتی، اس لئے مسلمانوں نے انسانی سماج کے مسائل کے حل کے لئے کسی دوسرے ملک کے قانون کو کبھی بھی کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ دوسروں کے قوانین سے استفادہ کیا جائے، مجتہدین اور ائمہ فقہ نے انتہائی باریک بینی سے قرآن وحدیث کا مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں بہت سے اصول مرتب کئے، انھیں اصولوں کی روشنی میں قوانین بنائے۔

تیسری بات یہ ہے کہ فقہی اعتبار سے قابل ذکر چار مکتبہ فکر ہیں ان کے امام ابوحنیفہ، امام مالک، احمد بن حنبل اور امام شافعی ہیں جو اسلامی فقہ یا دوسرے لفظوں میں اسلامی قوانین کو مرتب کرنے والے ہیں۔ ان میں سے نہ کسی نے رومن لاء پڑھا، نہ دیکھا نہ اس نیت سے ان علاقوں میں گئے جہاں رومن لاء نافذ تھا اس لئے ان حضرات کی واقفیت رومن لاء سے صفر کے برابر ہے، لیکن اس کے باوجود تنہا امام ابوحنیفہ نے جتنا بڑا ذخیرہ فقہ کا جمع کیا ہے ڈی اولیری اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، انھوں نے جو فقہ اکیڈمی قائم کی اس نے اتنا عظیم الشان مجموعہ قوانین مرتب کیا کہ آج دنیا میں حنفی قوانین کو بالا دستی حاصل ہے اور سب سے زیادہ انھیں کے قوانین پر عمل کرنے والے مسلمان ہیں، ان کی اکیڈمی کا ایک رکن بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی رومن لاء کی کوئی کتاب پڑھی ہو اور نہ عملی طور پر کبھی اس کے نفاذ کا مشاہدہ کیا ہو، استنباط مسائل اور استخراج نتائج میں امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے درمیان

بہت سے مسائل میں اختلاف رائے بھی ہوتا تھا جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس اختلاف کی جب آپ تلاش کریں گے تو اس میں رومن لاء کا تذکرہ کہیں نہیں آئے گا، کسی حدیث یا روایت سے استخراج واستنباط کے سلسلہ میں نقطۂ نگاہ کا فرق نظر آئے گا، ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے، اگر ڈی اولیری ماہر قانون تھا اور اس کا مطالعہ رومن لاء اور اسلامی قانون کا مکمل تھا تو تقابلی مطالعہ اور دونوں میں موازنہ کر کے ثابت کرتا تو اس کا دعویٰ قدرے قابل سماعت ہوتا، پھر بھی یہ امکان باقی رہ جاتا کہ قرآن وحدیث سے جو قانون اخذ کیا گیا اس سے پہلے رومیوں کے یہاں بھی اتفاق سے یہی قانون تھا اس وقت صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ رومن لاء بھی اس مسئلہ خاص میں حدیث وقرآن کے قانون کے مطابق ہے، اور بس۔

اسلامی فقہ کی ترتیب کا زمانہ بھی وہ ہے جب مسلمانوں کا نیر اقبال عروج پر تھا اور اپنی پوری تابانی کے ساتھ دنیا کے سروں پر چمک رہا تھا جس کو دیکھ کر دوسروں کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں، اس لئے مسلمانوں کو اپنی عظمت کا احساس تھا اور یہ احساس برتری جائز طور پر تھا، اس لئے قرآن وحدیث کے سامنے کسی قانون کی عظمت واہمیت کا ان کے دلوں میں خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا غیر مسلموں کے طور طریق، رسم ورواج اور دستور وقانون کو وہ حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس لئے اس سے استفادہ کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔؟

عربوں نے تراجم کے ذریعہ دوسروں کے علوم وفنون کو اپنا لیا

رومن لاء سے اسلامی فقہ ماخوذ ہونے کا دعویٰ کرنے والے ڈی اولیری اور شیلڈن ایموز اور بعض دوسرے مستشرقین اپنے دعویٰ کی دلیل میں کہتے ہیں کہ عہد رسالت اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسلام کے پاس بہت مختصر اور سادہ قوانین تھے جہاں جو دستور دیکھا اس میں تھوڑا بہت تغیر کر کے اس کو اپنا قانون بنالیا، سب

سے زیادہ استفادہ دوسری زبانوں کے علوم کو عربی میں منتقل کر کے مسلمانوں نے کیا ہے، مسلمانوں کی حکومت جب مستحکم ہوگئی تو انھوں نے دوسری قوموں کے علوم وفنون کو عربی میں منتقل کرنے کی ایک مہم چلائی اور سیکڑوں کتابیں یونان، مصر، روم اور شام وغیرہ سے منگا کر ترجمہ کرڈالیں، ان تراجم نے ان کو قانون سازی کا مسالہ بھی فراہم کیا اور اس کی مدد سے اسلامی فقہ کا اتنا بڑا تاج محل کھڑا کر دیا، اس سے پہلے ان قوانین کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔

یہ بہت بڑا فریب اور جھوٹ ہے، علمی خیانت اور تحقیق ومطالعہ میں بددیانتی کا مظاہرہ ہے، تاریخ کا ہر طالب اس دعویٰ کی سچائی سے قطعی انکار کردے گا، دنیا جانتی ہے اور تاریخ کی تمام کتابیں اس کی شاہد عدل ہیں کہ ترجمہ کا کام اور دوسروں کے علوم وفنون کو عربی میں منتقل کرنے کا کام عہد عباسیہ میں ہارون رشید (متوفی ۱۹۳ھ) نے شروع کیا اس نے بیت الحکمۃ کے نام سے ایک دار الترجمہ قائم کیا۔

جس میں طب، علاج معالجہ، جڑی بوٹیوں کی کتابیں، منطق فلسفہ اور مختلف زبانوں کی کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ کرایا، اس کے عہد میں کسی بھی قانون کی کوئی کتاب ترجمہ نہیں کی گئی، ہم ان تمام ترجمہ کرنے والوں سے بھی واقف ہیں اور جتنی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں ان کی نام بنام فہرست بھی ہماری تاریخوں میں موجود ہے۔

ہارون رشید سے بھی بڑے پیمانے پر تراجم کا کام مامون (متوفی ۲۱۸ھ) نے شروع کرایا، اس نے نسطوری، یعقوبی، صابی، مجوسی، رومی اور براہمہ ہر مذہب کے عالموں کو جمع کر کے یونانی، فارسی، سریانی، سنسکرت، نبطی، لاطینی زبانوں کی کتابیں ترجمہ کرائیں اور کوئی شبہہ نہیں کہ مترجم کتابوں کی فہرست سیکڑوں میں ہے، ان تمام کتابوں کی بھی مفصل فہرست ہماری تاریخوں میں محفوظ ہے اس میں فلسفہ، طب، ہندسہ، ہیئت، نجوم، کیمیا، صنعت وحرفت، تاریخ، ناول اور قصے کہانیوں کی کتابیں اور بعض سوانح عمریاں ہیں، لیکن اس دور میں بھی قانون کی کسی کتاب کا بھی عربی میں ترجمہ نہیں کیا گیا، بلکہ ان ترجموں سے برسہا برس پہلے اسلامی فقہ مرتب ہو کر سارے

اسلامی ممالک میں پھیل چکی تھی اور عدالتوں میں اسی کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور جب دارالترجمہ قائم ہوا اس وقت اسلامی فقہ کے مرتبین اپنا کام مکمل کر کے سفر آخرت پر جا چکے تھے امام ابوحنیفہؒ متوفی ۱۵۰ھ، امام مالکؒ متوفی ۱۷۹ھ، امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ، اور امام احمد بن حنبلؒ متوفی ۲۴۱ھ میں سے صرف امام احمد بن حنبل اس دنیا میں تھے اور حکومت کے جیل خانے میں ان پر کوڑے برسائے جارہے تھے، ان کی فقہ دوسری صدی کے آخر میں مرتب ہو چکی تھی، ان تمام حقائق کے باوجود اگر کوئی مدعی قانون کی کسی ایک بھی کتاب کا نام لے سکتا ہے تو اس کو پیش کرنا چاہئے، یقین کر لیجئے کہ وہ کبھی بھی پیش نہیں کر سکے گا، **حتی یلج الجمل فی سم الخیاط.**

قرآن میں بہت تھوڑے قوانین ہیں

ڈی اولیری نے تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے ماخوذ ہے، دلیل کا اس کی کتاب میں دور دور کہیں پتہ نہیں، اس لئے میرا خیال ہے کہ اس نے شیلڈن ایموز کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اس کا اپنا کوئی مطالعہ نہیں ہے، البتہ شیلڈن ایموز ضرور یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے دستور کی کتاب قرآن ہے اور قرآن میں دس بارہ قوانین ہیں اور ان کی فہرست بھی دی ہے۔

اتنا بڑا دعویٰ کہ وہ رومن لاء اور اسلامی قوانین کے تقابلی مطالعہ کے قابلِ فخر منصب پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کو پتہ نہیں کہ قرآن میں کچھ کم وبیش پانچ سو آیات احکام ہیں[۱]، اگر تم کہو کہ ان میں بیشتر عبادات سے متعلق ہیں تب بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ایک سو سے زائد اصولی قوانین قرآن میں موجود ہیں، علماء نے آیاتِ احکام کو علحدہ جمع بھی کر دیا ہے ان میں بیشتر اصول ہیں ان کی تفریعات کی جائیں تو ہزاروں دفعات پر مشتمل ہونگی، رومن لاء سے ہم واقف نہیں، اسلامی قوانین تو ہمارے گھر کی چیز ہے۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے احکام القرآن مصنفہ حجۃ الاسلام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی متوفی ۳۷۰ھ جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

شیلڈن ایموز نے اس موقعہ پر حدیث کا ذکر قصداً چھوڑ دیا ہے جب کہ قرآن کے بعد اسلامی قوانین کا دوسرا بڑا ماخذ احادیث ہیں احادیث کی حیثیت وحی غیر متلو کی ہے احادیث سے جتنے احکام مستنبط ہوتے ہیں وہ منشاء الٰہی کے مطابق اور واجب العمل قوانین ہیں، دنیا جانتی ہے کہ قرآن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا حکم موجود ہے مگر یہ فرائض کس طرح ادا کئے جائیں اس کی تفصیلات احادیث بتاتی ہیں اس لئے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ مسلمانوں کے قوانین کا ماخذ صرف قرآن نہیں حدیث بھی ہے، قرآن اور حدیث دونوں کے مجموعے سے ائمہ مجتہدین کی ذہانت وفطانت اور فطری ذکاوت نے اسلامی فقہ کے ہزاروں قوانین مستنبط کئے باریک بینی سے غور کروگے اور تلاش کروگے تو ہر قانون کی اصل حدیث اور قرآن میں مل جائے گی۔

اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی فقہ کا رومن لاء سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ یہ سارا ذخیرہ حدیث وقرآن کے اصولوں سے مستنبط کیا گیا ہے، جہاں کہیں کسی اصل کی دریافت سے عقل انسانی قاصر رہ گئی وہاں اجماع اور قیاس سے کام لیا گیا کسی دوسرے مجموعہ قوانین سے استفادہ کا نہ کبھی تصور پیدا ہوا اور نہ ائمہ مجتہدین کو اس کی ضرورت تھی اور سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام میں اس کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کچھ ایسے اسلامی قوانین ہیں جو رومن لاء میں پہلے سے موجود تھے اس سے کون انکار کرتا ہے اور نہ انکار کرنے کی کوئی ضرورت ہے، سماج کے مسائل مشترک ہیں، ان مسائل کا حل بھی اگر کہیں کہیں مشترک ہوگیا تو کون سی حیرت کی بات ہے، اس کی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ بعد والا قانون پہلے قانون کا سکنڈ ایڈیشن ہے، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو فہم وفراست کے لحاظ سے مفلوج اور تاریخی حقائق سے نابلد ہے۔

تبلیغ ودعوت اسلام کا بنیادی پہلو

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے تو حکم الٰہی کے مطابق آپ نے

اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا، آغاز نبوت کی ان سرگرمیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈی اولیری کا لب ولہجہ بڑا ہی دلخراش ہے وہ اسلام کے آغاز کو ایک مقدس مذہب کا آغاز نہیں سمجھتا ہے اور نہ کہتا ہے، یہ تو اس کی فطرت کا تقاضا تھا لیکن انسانیت وشرافت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں کہ اپنے مخالف یا دشمن کے بارے میں بھی کچھ کہو تو انسانیت کو ملحوظ رکھو لفظوں کو زہر آلود تیر نہ بناؤ، ناشائستہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ، لیکن ڈی اولیری نے اخلاقیات کا یہ باب شاید نہیں پڑھا ہے اور اس نے ایک عظیم الشان وعظیم المرتبت مذہب کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو جاہ وجلال اور عظمت واحترام سے بھری ہوئی اپنی ایک عظیم الشان تاریخ لکھتا ہے، جس نے یورپ کے ظلمت کدوں کو علم وتہذیب کی روشنی خیرات دی اور اس وقت اس کو تہذیب وتمدن کا سبق پڑھایا جب وہ تہذیب وتمدن کے لفظ سے بھی ناآشنا تھا اور آج اس کے ماننے والوں وراس کو خدا کا مقدس ترین مذہب ماننے والوں کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے، لیکن انسان کی فطرت غیر اختیاری طور پر بھی اس سے وہی بات کہلاتی ہے جو اس کے خمیر میں سمائی ہوئی ہے۔

وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

> ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تبلیغ کا دنیاوی پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم انھیں حجاز کے قبائل کو برادرانہ اتحاد میں مربوط کرنے کی کوشش کرنے، لوٹ مار کے دستور کو محدود کرنے اور ایک منظّم جماعت بنانے میں مصروف پاتے ہیں[1]۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اس کا مقصد خدا پرستی، خدا شناسی، گمراہ انسانیت کو مجدد شرافت کی راہوں پر لانا نہیں تھا، بلکہ دنیاوی پہلوان کی جدوجہد پر غالب تھا، وہ عرب کے قاتل، لٹیرے اور جنگجو بدوؤں کو بھائی بھائی کے نام پر ایک رشتہ میں پرو کر ایک طاقتور اور متحدہ جماعت بنانا چاہتے تھے اور اس کی عنان قیادت اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے، تاکہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں

---

[1] فلسفۂ اسلام (ڈی اولیری) ص ۶۸۔

میں بٹ کر اپنی توانائیوں کو ضائع نہ کریں بلکہ لوٹ مار کا ایک ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا چاہتے تھے، اس لوٹ مار کو بند کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ اس کو محدود کرنا تھا، یعنی نعوذ باللہ لوٹ مار کرنے والے سماج میں خود سپر پاور کی حیثیت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔

بدزبانی کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں اگر ہماری تاریخ ہماری روایات سے اس کی شہادت پیش کر دی جاتی تو ہم اس پر غور کرتے اور جواب دیتے، اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات وسرایا پر طنز کرنا ہے تو اس سے پہلے اس کو آپ کی نبوت کی ۱۳ سالہ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا۔

مکہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین اور دعوت اسلام میں ۱۳ سال گذارے، ہر طرح مصیبتیں جھیلیں لیکن اقدام تو دور کی بات ہے مدافعت کا بھی حکم خدا کی طرف سے نہیں تھا، سروں پر قیامت گذرتی رہی مگر اُف کہنے کی بھی اجازت نہیں تھی، حضرت عمار بن یاسر کی والدہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مسلمان ہونے کی جرم میں روح کو کپکپا دینے والی سزا دیکر بیدردی کے ساتھ قتل کرنا، سارے مسلمانوں کو لرزا دینے والا تھا[1] حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مار مار کر بچھا دینا، تپتے ہوئے ریت پر چت لٹا کر ان کے سینہ پر پتھر کی بھاری سل رکھ دینا[2]، حضرت عثمانؓ کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں زہریلا دھواں دینا، حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پورے بدن کو آگ میں دہکائی ہوئی لوہے کی چھڑوں سے داغ دینا[3]، سیکڑوں مسلمانوں کا روز روز کی اذیتوں سے تنگ آ کر چپکے سے مکہ سے نکل کر حبشہ جانے پر مجبور ہونا، ان سارے کربناک اور دل دہلا دینے والے واقعات کے ساتھ ساتھ خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسے کیسے مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے؟ خانہ کعبہ میں سجدہ کرتے ہوئے ایک اونٹ کی گندی وزنی اوجھ آپ کے اوپر

---

۱ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۹، اس طرح کے سارے واقعات اسلامی تاریخ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں۔

۲ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۷۔ ۳ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۵۹۔

ڈال دی گئی جس کے بوجھ سے آپ اٹھ نہیں سکتے تھے، زخم پر نمک بھی چھڑکا جا رہا تھا، سرداران قریش اس بے بسی کو دیکھ کر ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے، حضرت فاطمہ کا دوڑ کر آنا اور کسی طرح اس وزنی اوجھ کو جسم مبارک سے گرانا بڑا ہی دردناک واقعہ ہے[۱]۔

آخر آخر میں سارے ہم نوا قبائل سے ایک ایک نوجوان کو تلوار لے کر بلانا کہ ایک ساتھ درجنوں تلواریں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر پڑیں اور اس کو بوٹی بوٹی کر دیں تو آپ مکہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور جب مکہ سے باہر نکلے تو آپؐ اور آپؐ کے رفیق سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا انعام ایک سو سرخ اونٹ مقرر ہونے کا اعلان کیا گیا اس انعام کے لالچ میں نیزے لے کر مشرکین دوڑ پڑے، لیکن آپ مدینہ پہنچ گئے۔

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

لیکن انعام کا اعلان اب بھی باقی تھا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاتل آناً فاناً مکہ کا سب سے بڑا رئیس بن جانے والا تھا، صحابہ کرام مدینہ میں باری مقرر کر کے رات بھر آپ کا پہرہ دیتے تھے۔

ان واقعات میں سے ہر واقعہ ایسا تھا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اس سے پورے عرب میں قبائلی جنگ چھڑ سکتی تھی اور مسلمان مغرور قریشیوں کو ان کی شرارتوں کا مزہ چکھا سکتے تھے، مسلمان اور مسلمانوں کا رسول اتنا بے بس نہیں تھا، تم کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب خانہ کعبہ کے متولی اور قریش کے سب سے زیادہ با اثر آدمی تھے، اطراف و جوانب کے قبائل ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اگر ان کے خاندان کا کوئی فرد ان قبائل سے اپنی مظلومیت کا اظہار کرتا تو بہت سے قبائل اختلاف مذہب کے باوجود اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور اس کے پشت پناہ بن جاتے، خود دیکھو ابوبکر صدیقؓ جب مکہ چھوڑ کر ایک بار جا رہے تھے تو

---

[۱] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۴۴۔

ایک قبیلہ کا سردار راستہ میں ملتا ہے تو کہتا ہے کہ آپ جیسا شریف آدمی مکہ چھوڑ دے یہ نہیں ہوسکتا، میں آپ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں کسی کی مجال نہیں کہ آپ پر انگلی اٹھا سکے[1]، اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر کئی قبیلے مشرکین قریش کے ہم نوا تھے تو کچھ قبیلے شرک پر قائم رہتے ہوئے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے حلیف تھے۔

قریش کے غرور کے محل کے کنگرے گرتے جا رہے تھے، اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ قریش کے مقابلے میں کسی قبیلے کا سردار اپنے کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور موقعہ پڑنے پر قریش کے چودھریوں کو ڈانٹ سکتا تھا قبیلہ یمامہ کے سردار ثُمامہ بن اُثال کو مکہ والوں نے چھیڑا تو انھوں نے للکارا کہ اگر تم نے مرے جسم کو ایک انگلی بھی لگا دی تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ گیہوں کے ایک ایک دانے کو ترس جاؤ گے اور بھوکوں مر جاؤ گے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گیہوں لانے کی اجازت نہیں[2] دی، ثمامہ یمامہ کے رہنے والے اور قبیلہ کے سردار تھے، مکہ میں سارا غلہ یمامہ ہی سے آتا تھا۔

اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدافعت پر آمادہ ہوتے تو کامیاب مدافعت کر سکتے تھے لیکن آپ کو قبیلوں کے سرداروں کی حمایت کی ضرورت نہیں تھی، محض طاقت فراہم کر کے غلبہ حاصل کرنا مقصود نہیں تھا، آپ خدا کے فرستادہ نبی تھے جو حکم الٰہی تھا اس کی پابندی کرتے تھے، اور اس وقت تک جہاد کا حکم نہیں آیا تھا، اس لئے یہ ساری قیامتیں سروں سے گذرتی رہیں لیکن سرداران قبائل سے نہ مدد طلب کی اور نہ فوجی طاقت بنائی، نہ تلوار اٹھائی۔

تاریخ کے ان حقائق کے باوجود ڈی اولیری سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن قدس پر دھبہ ڈالنے کی جسارت کرتا ہے کہ وہ لوٹ مار کو محدود کر کے اقتدار اعلیٰ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے تھے ع

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۹۴، ۹۵ پر مفصل واقعہ درج ہے۔

[2] مشکوٰۃ ص ۳۴۴، ۳۴۵ کتاب الجہاد باب حکم الاسراء۔

عرب مسلمان عجمی مسلمان کو بھائی نہیں سمجھتے تھے

ڈی اولیری کا دماغ مسلمانوں پر صرف فرضی اور بے بنیاد الزامات لگانے میں مصروف ہے جیسے مغلوب الغضب آدمی اپنے مخالف کے بارے میں جھوٹے سے جھوٹے الزامات تراشتا ہے، اس کی کتاب میں ہر جگہ یہی انداز تحریر ملتا ہے، کہیں ثبوت وشہادت نہیں دیتا ہے، دو جملوں میں ایک جھوٹا الزام لگا کر آگے بڑھ جاتا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

> ''بلا شبہ عرب مفتوح عجمی کو حلقہ بگوش اسلام ہو جانے پر بھی بھائی تسلیم کرنے پر مائل نہ تھا، اس کے نزدیک بیرون ممالک کی فتح کے معنی صرف بڑی بڑی جائیدادوں، بے شمار دولت اور غیر محدود قوت حاصل ہونے کے تھے، بنوامیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے مال گذاری میں کمی واقع ہوتی تھی[۱]۔

کوئی ثبوت؟ کوئی شہادت؟ مسلمانوں کی کسی جماعت کی طرف سے اس کے عملی اظہار کی مثال؟ ان میں سے کوئی بات نہیں کہتا ہے جیسے مصنف کے پاس الزام واتہام کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اسلام کی پوری تاریخ سونے کے حرفوں سے لکھی گئی ہے کہ وہ دنیا میں اخوت ومساوات کا سب سے بڑا داعی ہے وہ سارے انسانوں کو ایک باپ کی اولاد سمجھتا ہے، اور ساری دنیا کو وہ اسی اخوت ومساوات کی تعلیم دیتا ہے، حجۃ الوداع کا خطبہ تاریخِ اسلام کا مشہور خطبہ ہے جو درحقیقت رسول اکرم ﷺ کی زندگی کی آخری وصیتیں ہیں جن میں آئندہ کوئی ترمیم کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے، آپ نے فرمایا: **کل کم بنی آدم، وادم من تراب** سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں، قرآن وحدیث میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، یہ اسلام کی تعلیم کا بہت روشن باب ہے اور عہد رسالت

۱۔ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری ص ۸۰۔

میں اخوت ومساوات کا ایسا حیرتناک نظارہ دنیا نے دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گئی۔

اسلامی مواخات ومساوات

ہجرت کے بعد مکہ سے آنے والے سارے مہاجرین کو انصار کے ساتھ رشتۂ مواخاۃ میں پرو دیا گیا ہر مہاجر کسی انصاری کا بھائی بنا دیا گیا، یہ صرف رسمی بھائی چارہ نہیں تھا بلکہ ان کا سلوک ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تھا جیسا دو حقیقی بھائیوں میں ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ایک انصاری نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میرے گھر میرے کھیت، اور میرے باغ میں آدھے کے تم مالک ہو اور میرے پاس دو بیویاں ہیں میں ان میں سے ایک کو طلاق دیدیتا ہوں تم اس سے نکاح کرلو[1] یعنی انصاری اور مہاجر بھائی بن کر بالکل ایک سطح پر آجائیں، ایسی مثالیں افراد میں شاید مل جائیں لیکن بحیثیت جماعت کے تم کو کہیں نہیں ملیں گی۔

مکی اور مدنی میں فرق تھا

شاید تم یہ کہو کہ دونوں عربی النسل تھے مرتبہ میں ایک دوسرے کے برابر تھے اگر ایک نے دوسرے کو بھائی بنالیا تو یہ بہت زیادہ حیرتناک بات نہیں ہوئی، شاید تم نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ اعتراض ذہن میں پیدا نہ ہوتا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مکہ بالخصوص قریش کے لوگ مدینہ کے انصار کو اپنا ہم مرتبہ کم ہی سمجھتے تھے، مدینہ کے بعض قبائل میں ان کی رشتہ داریاں ضرور تھیں لیکن عام طور پر انصار کسان تھے اس لئے ان کو قریش کے لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو اپنے سے فروتر اور پست سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ بدر میں ملتا ہے۔

عفرا ایک انصاریہ خاتون ہیں ان کے دونوں لڑکوں نے جنگ بدر میں ابوجہل کو مار کر زمین پر بچھا دیا اور آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری سنادی حضورؐ نے عبداللہ بن

---

[1] سیرۃ المصطفیٰ جلد اول ص ۴۳۹ بحوالہ عیون الاثر ج ا ص ۲۰۱۔

مسعود کو بھیجا کہ دیکھو ابو جہل کا کیا حال ہے؟ ابن مسعود جب پہنچے تو ابھی وہ زندہ تھا اس کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچا اور کہا کہ تو وہی ابو جہل ہے؟ تو اس نے کہا کہ آج مجھ سے بڑا کوئی آدمی تم نے مارا بھی ہے؟ افسوس کہ مجھے ایک کسان کے لڑکے نے مارا ہے۔

قال، فلو غیرا کار قتلنی[۱] کاش مجھے کسانوں کے علاوہ کسی دوسرے نے مارا ہوتا۔

یعنی اپنے سے کمتر درجہ والے کے ہاتھ سے ابو جہل جیسے مغرور کو مرنا بھی پسند نہیں تھا، نسلی غرور کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں اخوت ومساوات کا جذبہ پیدا کر کے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل فرمائی کہ جس میں ماوتو کا امتیاز ختم ہو کر رہ گیا اور دنیا نے وحشت وبربریت کی سنگلاخ زمین پر محبت واخلاص کے ایسے پھول کھلائے جس کی خوشبو بہت دور تک گئی اور یہ خوشبو اسلامی معاشرہ کی فضاؤں میں ہر طرف پھیل گئی۔

عربوں کی نگاہ میں حبشیوں کی کوئی وقعت نہیں تھی کیونکہ وہ حبش کو غلاموں کی منڈی سمجھتے تھے اور مکہ وغیرہ میں بہت سے حبشی غلام غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حضرت بلال حبشیؓ انھیں لوگوں میں سے تھے لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو ایک جلیل القدر صحابی نے کہا کہ آج ہمارا سردار ہم سے جدا ہو گیا، اسی حبش سے نجاشی کا بیٹا جب مدینہ آیا[۲] اور اسلام قبول کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حبشی کی حضرت علیؓ سے مواخاۃ کرائی ایک خاندان بنی ہاشم کا فرد فرید اور ایک حبش کا رہنے والا عربوں کی نگاہ میں حقیر انسان۔

مسلمانوں نے غلاموں کو آقا بنا لیا

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مواخات ومساوات صرف فکری ونظری نہیں بلکہ عملی ہے، ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے، یہ

۱؎ مشکوۃ باب قسمۃ الغنائم ص ۳۵۲ بخاری ومسلم میں بھی یہی الفاظ ہیں۔

۲؎ نجاشی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خط لکھا ہے اس میں اپنے بیٹے اُریحا بن الاصم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجنے کا ذکر کیا ہے دیکھئے، البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۸۴۔

دستور اسلامی تعلیمات کا گل سر سید ہے، جب نسل اور نسب کے فرق کو مٹا کر سب کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا تو مسلمانوں نے عملی طور پر اس کو کر کے دینا کے سامنے اس کی ایسی حیرتناک مثالیں پیش کر دیں کہ جن کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، سماج میں پست سے پست تر سطح پر زندگی گذارنے والوں نے جب اسلام قبول کر کے علم و فضل اور زہد وتقویٰ میں کمال حاصل کر لیا تو نسل ونسب کے لحاظ سے معزز ترین افراد نے بھی ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا۔

عرب میں غلام کی حیثیت جانوروں سے کسی طرح بلند نہیں تھی، ان کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا، اس خرید وفروخت میں اس کی مرضی کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا تھا، غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہوسکتا تھا، اس کو معمولی معمولی غلطیوں پر بڑی سے بڑی سزائیں دی جاتی تھیں اس طرح عربوں کے سماج میں سب سے پست سطح پر غلاموں کی زندگی تھی، لیکن جب یہی غلام اسلامی تعلیمات سے آراستہ پیراستہ ہوکر مسلم سماج میں آئے تو سارے مسلمانوں نے ان کو بھائی سے بھی بڑا رتبہ دیا بلکہ وہ اب غلام کے بجائے آقا، اور خادم کے بجائے مخدوم بن گئے، مسلم سماج کے معزز ترین افراد ان کے آستانوں پر عقید تمندانہ حاضری دینے لگے اور یہ آزاد کردہ غلام (جن کو تاریخوں میں اولیٰ کہا گیا) پورے مسلم معاشرہ پر چھا گئے، ساری عزت وعظمت اور سرفرازی ان کے قدموں کی خاک کو آنکھوں سے لگانے لگی، بنواُمیہ کے عہد خلافت کی تفصیل کرتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے:

> ''کوئی شہر ایسا نہیں تھا جس میں طالبان علم موالی (آزاد کردہ غلام) کی بھاری تعداد موجود نہ ہو اور بعض شہروں میں تو غلام فقہاء کی تعداد عرب فقہاء سے کہیں زیادہ تھی[1]۔

ایک دوسرے مصنف نے اسلامی شہروں میں اہل علم کا ایک جائزہ لے کر جو تفصیل دی ہے وہ ڈی اولیری جیسے لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے جو

[1] الاسلام والحضارۃ الاسلامیہ ج۱ ص۹۴۔

کہتے ہیں کہ مسلمان عجمی مسلمانوں کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے تھے، وہ اپنی مشہور عالم کتاب میں لکھتا ہے کہ:

''زید بن اسلم کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ میں عطاء بن ابی رباح، یمن میں طاؤس بن کیسان، یمامہ میں یحییٰ بن کثیر، بصرہ میں حسن بصری، کوفہ میں ابراہیم نخعی، شام میں مکحول دمشقی اور خراسان میں عطاء الخراسانی فقہ میں مرجع خلائق تھے۔ البتہ مدینہ میں سعید بن المسیب فقہ کے امام کہے جاتے تھے جو قریشی الاصل تھے[۱]۔ (یعنی بقیہ سب غلام تھے)

یہ فہرست تو ان غلاموں کی تھی جو اس وقت ان شہروں میں مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے تھے اور ان کے علم و فضل کی وجہ سے مسلمانوں میں ان کا سب سے بلند مقام تھا، میں تم کو ان غلاموں کی فہرست بھی سنانا چاہتا ہوں جو پوری اسلامی تاریخ پر چھائے ہوئے ہیں اور ساری اسلامی دنیا نے ان غلاموں کے علمی احسانات کا اعتراف کیا ہے۔ حدیث و قرآن کی لافانی خدمات کی وجہ سے ان غلاموں کا مقام و مرتبہ مسلمانوں میں اتنا بلند ہے کہ ان کے ناموں کو زبان پر لاتے ہوئے پورے ادب واحترام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس طویل فہرست میں سے چند نام درج ذیل ہیں اور پوری علمی دنیا ان ناموں سے واقف ہے، صحابہ کرام سے براہ راست علم حاصل کرنے والے غلاموں کے اسماء گرامی یہ ہیں:

عکرمہ، ابورافع، سعید بن جبیر، سلیمان بن یسار، مجاہد بن جُبیر، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، اعمش، ایوب سختیانی، مکحول دمشقی، منصور ابن زاذان، میمون بن مہران، سلمہ بن دینار، عبداللہ بن عون، عمرو بن دینار، سلیمان بن طرخان التیمی، حسن بصری، محمد بن سیرین، ابوالعالیہ الریاحی، عطاء بن یسار، ابوبکر بن عیاش، زید بن اسلم، یزید بن حبیب، ابوالزناد بن ذکوان، ربیعۃ الرای، محمد بن عجلان، محمد بن اسحاق۔

یہ جلیل القدر محدثین احادیث کے راوی اور تابعی ہیں اور سب کے سب موالی

[۱] معجم البلدان ج ۳ ص ۴۱۲۔

یعنی آزاد کردہ غلام ہیں لیکن اسلامی دنیا کے آقا ہیں۔ اب چند نام تبع تابعین کے پیش کرتا ہوں جو مولیٰ یعنی آزاد کرہ غلام تھے اور ان کا شمار مشہور محدثین میں ہے ان میں زیادہ تعداد ان حضرات کی ہے جو امام بخاری کے شیوخ حدیث ہیں۔

عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عُیینہ، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن معین، لیث بن سعد، عبدالرحمٰن بن مہدی، علی بن مسہر، علی بن المدینی، قتیبہ بن سعد الثقفی، شعبہ ابن الحجاج وغیرہ۔

ان تمام تاریخی صداقتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈی اولیری کے اس الزام کو دیکھیں کہ مسلمان نئے مسلمان ہونے والوں کو بھائی کا درجہ نہیں دیتے تھے، اس اعتراض کا کیا وزن رہ جاتا ہے جو قوم اپنے غلاموں کو آقا کا درجہ دے سکتی ہے جو اپنے خادموں، نوکروں چاکروں کو آقائیت ومخدومیت کے پُر وقار منصب پر سرفراز کر سکتی ہے وہ اپنے برابر کے مسلمانوں کو بھائی کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہو گی؟ کتنا بڑا جھوٹا الزام ہے؟ کتنی بے بنیاد بات ہے؟ مصنف نے خاص طور پر خلفاء بنو اُمیہ کو اس سلسلہ میں مورد الزام بنایا ہے اس لئے خاص طور پر بنو اُمیہ ہی کے دور خلافت کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

بنو اُمیہ قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے

ڈی اولیری نے خلفاء بنو اُمیہ پر خاص طور پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ رعایا اسلام نہ قبول کرے اس سے جزیہ میں کمی ہوتی تھی، اور دولت کی آمد رک جاتی تھی۔

ڈی اولیری نے یہ کہہ کر چاند پر دھول اڑا کر روشنی میں مدھم کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، یہ الزام پڑھ کر تو میں حیرت میں ڈوب گیا جیسے مصنف بنو اُمیہ کی ہزراوں صفحات پر پھیلی ہوئی تاریخ کے ایک حرف سے بھی آشنا نہیں ہے اس سلسلہ میں خلافت بنو اُمیہ کی اشاعتِ اسلام کی جدوجہد کا ایک سرسری جائزہ ہی پیش کر سکتا ہوں

کیونکہ یہ موضوع تو مستقل ایک کتاب کا موضوع ہے، بنواُمیہ کے ہاتھوں میں جب عنان خلافت آئی اس وقت اسلامی حکومت کا رقبہ اور مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی بہت سے ممالک فتح ہوئے مگر اس کی آبادی نے اسلام ابھی قبول نہیں کیا تھا۔

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت

بنواُمیہ کے آغاز خلافت ۴۱ھ سے قبل ہندوستان کے ساحلی علاقوں مالا بار کالی کٹ اور سراندیپ میں کچھ عرب مسلمان بغرض تجارت آباد ہو گئے تھے، ان کے معاملات اور اخلاق سے متأثر ہو کر بعض افراد نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن عام طور پر یہاں کے باشندے اسلام کے نام سے نا آشنا اور یہ سرزمین مسلمانوں کے وجود سے محروم تھی ہندوستان میں اسلام کی عام اشاعت کا آغاز بنواُمیہ کے پہلے خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں ۴۴ھ سے ہوتا ہے آپ نے مہلب بن ابی صفرہ کو کچھ فوج دے کر ہندوستان بھیجا اس نے کابل اور ملتان کے درمیانی علاقہ کو فتح کیا، پھر سنان بن سلمہ نے مکران (سندھ) کو فتح کر کے اس کو مسلمانوں کا ایک مرکزی شہر بنایا۔ لیکن نیز اسلام کی شعاعیں ابھی محدود تھیں، سرزمین ہند کی قسمت کا ستارہ اس وقت چمکا اور اس کی تیز کرنوں نے سرزمین ہند کے بہت بڑے خطے میں انوار کی بارش شروع کی جب سترہ سالہ نوجوان محمد بن قاسم نے ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت (از ۸۶ھ تا ۹۶ھ) میں اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور سندھ کے عیاش اور ظالم راجہ داہر کی حکومت کو تہ وبالا کر دیا اور اپنی زاہدانہ زندگی اور اسلامی اخلاق سے یہاں کے باشندوں کے دلوں کو فتح کر لیا، اس نے یہاں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی اور اس کثرت سے یہاں کی قومیں مسلمان ہوئیں کہ یہ احساس ہونے لگا کہ شاید خوف و دہشت کی وجہ سے وہ اسلام قبول کر رہی ہیں، اس لئے محمد بن قاسم کو ایک دن اعلان کرنا پڑا۔

”جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے

ہماری طرف سے کوئی تعرض نہیں ہوگا، لا اکراہ فی الدین، دین میں کوئی زبردستی نہیں‘‘

لیکن اس کے باوجود اتنی کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ آبادی ازخود ایک ساتھ مسلمان ہوگئی اور پھر اس تیزی کے ساتھ اسلام ہندوستان میں پھیلا کہ افغانستان وقندھار سے لے کر بنوں، اہواز، سرحد، قلات، ملتان اور پشاور تک مسلم آبادیاں قائم ہوتی چلی گئیں اور جب ۱۳۲ھ میں بنواُمیہ کی خلافت کا چراغ گل ہوا اس وقت یہ پوری پٹی سرزمین ہند پر اسلامی کہکشاں بن چکی تھی اور آج تک ان تمام علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی جدوجہد کا ثمرہ ہے جس کی بنیاد عہد بنواُمیہ میں پڑی تھی اوران کے نامۂ اعمال میں ہندوستان میں کروڑوں ایمان قبول کرنے والوں کا اجروثواب لکھا گیا، ڈی اولیری کے خاک اڑانے سے صداقت کے سورج کی روشنی مدہم نہیں ہوسکتی۔

افریقہ اور ترکستان میں اسلام

اب ہم رہوارفکر کو افریقہ اور ترکستان کی طرف موڑتے ہیں، افریقہ میں حضرت معاویہؓ ہی کے زمانہ میں اسلامی فوجیں پہنچیں شمالی افریقہ میں ایک جنگجو قوم بربرآبادتھی لیکن زمینی فتح کے ساتھ دلوں کی فتح کا سلسلہ بھی جاری تھا، تمام بربری قوم حلقہ بگوش اسلام ہوگئی بلکہ رومیوں کی بھی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا، کچھ ہی دنوں بعد وہاں شہر قیردان آباد کر کے اس کو مسلمانوں کا مرکز بنادیا گیا اور پورے شمالی افریقہ میں لاکھوں انسانوں نے نخل اسلام کے سایہ میں آکر سکون کی سانس لی، یزید (جو اپنے جرم سے کہیں زیادہ سب وشتم کا مستحق قرار دیا گیا) کے دورِخلافت میں خراسان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی ۶۱ھ میں یزید نے مسلم بن زیاد کو خراسان کا حاکم بنا کر بھیجا اس نے جا کر خوارزم کا محاصرہ کرلیا اور زیر کیا اسی سال سمرقند اور خجند ہ میں اسلامی فوجیں پہنچیں اس طرح جب ۱۳۲ھ میں بنواُمیہ کی خلافت ختم ہوئی ہے اس

وقت تک ترکستان کا بہت بڑا علاقہ اسلام کے حلقہ آغوش میں آچکا تھا اور مسلمانوں کی وہاں ایک مستحکم حکومت قائم ہو چکی تھی موجودہ ارس کی ۱۷ ریاستوں میں سے سات ریاستوں میں مسلمانوں کو زار روس کے دور میں بھاری اکثریت حاصل تھی اس کی بنیاد خلافت بنو اُمیہ ہی کے زمانہ میں پڑی تھی، بخارا، سمرقند، خوارزم، تاشقند، کریمیا، ازبکستان وغیرہ میں تاریخ ساز علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو عالم اسلام میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں، امام بخاری جیسے محدث اسی کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔

اسپین میں اسلام

ولید بن عبدالملک متوفی ۹۶ھ کے عہد خلافت میں مسلمان اسپین تک پہنچ چکے تھے، طارق بن زیاد جو اسلامی تاریخ میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے بنو اُمیہ ہی کے عہد کا اولوالعزم سپہ سالار تھا، جو اندلس کے ساحل پر اپنی صرف چھ ہزار فوجوں کو لے کر اُترا تو اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالیں تا کہ کسی فوجی کے ذہن میں وطن لوٹنے کا خیال بھی نہ آئے، فوجیوں نے کہا اگر خدانخواستہ ہم کامیاب نہ ہوئے تو ان کشتیوں سے اپنے وطن تو واپس جا سکتے تھے، اس کے جواب میں طارق نے تلوار کے دستہ پر ہاتھ رکھ کر کہا وطن؟ وطن کیا چیز ہے؟ دنیا کا ہر ملک ہمارا وطن ہے، ''ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست'' اسلامی فوجوں نے سارے اسپین کو کنگھال ڈالا، پورے ملک پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم کر دیا، اسپین مسلمانوں کے لئے ایک محفوظ ترین علاقہ بن گیا اور ۱۳۲ھ میں خلافت بنو اُمیہ کے خاتمہ پر ایک فرد عبدالرحمٰن اندلس میں اپنی ایک مثالی حکومت قائم کرتا ہے اور یورپ کی ناک کے نیچے آٹھ سو سال تک پورے جاہ وجلال کے ساتھ یہ حکومت قائم رہی ہر طرف اسلامی آبادیاں قائم ہو گئیں اور پورے اسپین میں اسلام کی اشاعت اتنے بلند پیمانے پر ہوئی کہ وہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ بن گیا قلعہ الحمراء اور مسجد قرطبہ کے بلند مینار آج بھی اموی خاندان کے جاہ وجلال اور اشاعتِ اسلام کی ایمان افروز داستان سنانے کے لئے موجود ہیں، بنو اُمیہ کے عہد

خلافت میں اسلام کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا؟ تاریخ یہ پوری داستان سنانے کے لئے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے، ڈی اولیری کا یہ کہنا کہ:

''خلفاء بنو امیہ اسلام قبول کرنے کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی آمدنی میں کمی ہوتی تھی''

کتنا لغو؟ کتنا مہمل؟ اور خلاف حقیقت الزام ہے، میری اس تھوڑی سی تفصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، ان تمام حالات کے لئے عربی میں کئی درجن مستند ترین کتابیں ہیں اگر ان میں سے چند کا بھی مطالعہ کرلیا ہوتا تو اس طرح کے بے بنیاد الزام لگانا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔

بات دراز ہوتی جارہی ہے، مختصر بات یہ ہے کہ ڈی اولیری اور شیلڈن ایموز جیسے نام نہاد محققین اور نقادوں کی اسلامی عقیدوں کی سرزمین میں زہر بونے والی کتابیں اگر اسلامیات کے مطالعہ کے لئے ہماری یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں اور اسلام کے نام پر پڑھائی جارہی ہیں تو میری بڑے ادب سے درخواست ہے کہ خدارا آپ اسلام پر یہ احسان نہ کریں، کیونکہ پودے کی جڑوں میں کھولتا ہوا پانی دے کر پھر پتیوں اور شاخوں پر برف بھی برسا کر ان میں تازگی اور شادابی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ بات اکبرالہ آبادی کے ایک شعر پر ختم کی جاتی ہے ؎

وہ ہم ساری کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

تیسری جلد کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں

اس شمارے میں ایک قابل قدر مضمون ''دعوت کا قرآنی اسلوب'' پیش کیا جارہا ہے، مقالہ عالمانہ ہی نہیں محققانہ بھی ہے، ''خادم رسول اللہؐ'' کے عنوان سے مشہور صحابی رسول حضرت انس بن مالکؓ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلکش انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، شخصیات پر لکھے جانے والے مضامین سے قدرے مختلف انداز کا ہے اس کی

وجہ سے مضمون کی جاذبیت میں اضافہ ہوا ہے، شخصیات کے سلسلے کا ایک دوسرا مضمون عالم اسلام کی مشہور اور لافانی علمی شخصیت حافظ ابن حجر عسقلانی پر ہے ابن حجر اسلامی تاریخ کا اتنا عظیم المرتبت نام ہے کہ اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کا سر اس آستانے پر عقیدت سے خم ہے، ابن حجر ہمالیائی شخصیت کے مالک ہیں، ان کی تصانیف کی فہرست بہت لمبی ہے اور ہر کتاب اپنی مثال آپ ہے ان کی کوئی بھی تصنیف ان کے علمی مقام و مرتبہ سے فروتر نہیں ہے، ابن حجر اور ان کی تصانیف پر ہزاروں صفحات لکھے جائیں تب بھی ان کے علمی کارناموں کا حق ادا نہیں ہوسکتا، ایک مختصر مضمون میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف صرف اشارے ہی کئے جاسکتے ہیں، مقالہ نگار نے اختصار کے باوجود ان کی عظمت وانفرادیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شمارہ میں ایک خصوصی مضمون ایک مستشرق کی اسلامیات پر ایک کتاب ''فلسفۂ اسلام'' پر تنقید وتبصرہ ہے، مصنف نے اپنی کتاب میں اسلام کے خلاف جو زہر پھیلایا ہے اس کے لئے تریاق فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مستشرقین کی تحقیق و تفتیش اور وسعت مطالعہ کا علمی دنیا پر اتنا رعب چھایا ہوا ہے کہ ان کی ہر رطب و یابس تحریروں کو عالمی شہرت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن جب ان کے تحقیقی کارناموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام کے محقق علماء موشگافیوں اور ان کی ذکاوت وفراست اور نکتہ رسی اور باریک بینی کی شاہکار تحریروں کو پورے طور پر سمجھنے کی بھی ان میں صلاحیت نہیں ہے، یا اگر سمجھ جاتے ہیں تو علمی دیانتداروں کا ان کے یہاں قحط پڑ جاتا ہے، زیر نظر مضمون سے بھی اس حقیقت پر کچھ روشنی پڑتی ہے، جوابات اور کتاب کا تجزیاتی جائزہ لینے میں پوری دیانتداری کے ساتھ پوری تحقیق و تفتیش سے کام لیا گیا ہے اور تفصیلی مطالعہ کے بعد جوابات سپرد قلم کئے گئے ہیں، امید ہے کہ علمی حلقوں میں مضمون توجہ سے پڑھا جائے گا۔

عورت اور اسلام

نسوانی فطرت کا ایک شاہکار

''آبزور آف بزنس اینڈ پالٹیکس ویکلی'' شمارہ ۲۷؍جون تا ۳؍جولائی ۱۳۹۹۳ء میں ایک ماڈرن مسلم خاتون کی کتاب ''عورت اور اسلام'' ایک تاریخی اور مذہبی مطالعہ پر تبصرہ شائع ہوا ہے، کتاب کی مصنفہ فاطمہ مرنیسی ہیں جو رباط یونیورسٹی مراکش میں سماجیات کی پروفیسر ہیں، وہی تبصرہ ہمارے ایک کرم فرمانے دہلی سے ہمیں مطالعہ کے لئے بھیجا ہے، تبصرہ سے اندازہ ہوا کہ اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام ایک ''عورت دشمن'' مذہب ہے، مسلمان عورت اور مرد میں مساوات کا جو دعویٰ کرتے ہیں وہ ایک کھوکھلا دعویٰ ہے اور اس کے خلاف قرآن اور احادیث سے متعدد ثبوت پیش کئے گئے جن میں بقول ان کے عورت کا ذکر اہانت سے کیا گیا ہے حتیٰ کہ قرآن میں عورتوں کو مارنے تک کا حکم دیا گیا ہے۔

اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے، تبصرہ نگار نے اپنے علم کے مطابق جن پہلوؤں کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے اہم سمجھا ہے جگہ جگہ سے اس کے اقتباسات دیئے ہیں جن سے مصنفہ کے نقطہ نگاہ کا ایک ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے دل ودماغ میں جو بات جاگزیں ہے اس کا پتہ چلتا ہے، ہم اسی تبصرے کی روشنی میں اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے، ہم تبصرہ نگار سے بھی واقف نہیں اور نہ ہم کو ان کے ذہن ومزاج اور افکار وخیالات کا علم ہے اس لئے اندیشہ یہ بھی ہے کہ تبصرہ نگار نے بات کا بتنگڑ بنایا ہو، چونکہ کتاب اسلام دشمن ہے، ہوسکتا ہے تبصرہ نگار کے دل کے گوشے میں بھی چور بیٹھا ہو تو جو بات مصنفہ نے نہیں کہی ہے وہ باتیں بھی زیب داستاں کے لئے بڑھا سکتا ہے

جیسا کہ ہندو فرقہ پرست اور نام نہاد مسلم دانشوروں کی لابی کا دستور ہو چکا ہے اور ہمارے ملک میں شب و روز یہ کام ہو رہا ہے، تین طلاق اور ایک طلاق کا مسئلہ کچھ نہیں تھا اور اس کو کیا سے کیا بنا دیا گیا، اس لئے کوئی بعید نہیں کہ تبصرہ نگار نے تبصرہ کے پردے میں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہو بہر حال یہ اندیشہ ہے کہ:

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ترقی پسند اور روشن خیال خواتین اور نام نہاد مسلم دانشور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر جس آزاد خیالی اور دونوں صنفوں میں مساوات پر اظہار خیال کر رہے ہیں، مسلم معاشرہ اور اسلامی اصول واحکام کو نشانہ بنا رہے ہیں، اسی فضا کو پیش نظر رکھ کر اسلام میں عورت کی جو حقیقی تصویر ہے ہم اس کو دکھانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ اس کتاب میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات بھی آجائیں گے۔

اسلام میں عورت کا درجہ

آج دنیا میں جتنے مذاہب، جتنی قومیں اور جتنی تہذیبیں پائی جاتی ہیں بلا استثناء ان میں سے جس نے عورت کو سوسائٹی میں جو مقام دیا ہے وہ عورت کے لئے قطعی غیر موزوں ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے، اس غلط بخشی کے بتاہ کن اثرات آج دنیا کے سامنے ہیں، اس کے برعکس اسلام نے عورت کو جس بلند اور پاکیزہ مقام پر پہنچایا ہے ٹھیک اس کی فطرت کے مطابق اور اس کی شایان شان ہے، تمدنی زندگی میں اس سے استحکام پیدا ہوا اور عائلی زندگی میں استواری، خاندانی تعلقات میں تقدس و پاکیزگی، خلوص ومحبت کی جلوہ ارزائی ہوئی، اسلام نے عورت کو اسلامی معاشرہ میں ایک ''ملکہ'' یا ایک شہزادی کا وقار اور عظمت عطا کی ہے، شوہر اس کی عزت وحرمت، اس کی عفت و عصمت کا ایک جان سپار اور جانباز محافظ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اگر کوئی غلط نگاہ اس کی طرف ڈالدے تو وہ اس کی آنکھیں نکال لینے کے درپے ہو جائے، اس کی طرف کوئی گستاخ ہاتھ بڑھے تو اس ہاتھ کو قلم کر دینے کا اس میں

جذبہ بیدار ہوجاتا ہے، غرضیکہ اسلام نے عورت کو جو حقوق واحترام دیئے ہیں ان کے سائے میں اس کی پور زندگی سکون وطمانینت قلبی کا مظہر بن جاتی ہے اور ہر طرح کی جسمانی وذہنی مشقت سے محفوظ ہوجاتی ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق بیوی اپنی رہائش کے لئے تم سے گھر کا مطالبہ کرے گی تم کو اس کا مطالبہ پورا کرنا پڑیگا، وہ تم سے خوراک، پوشاک کا مطالبہ کرے گی اور اس معیار کی خوراک و پوشاک جو اس کی سطح کے افراد کے یہاں مروج ہے اس کی فراہمی شوہر کے ذمہ ہے اگر اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہوئی تو وہ قاضی عدالت کے ذریعہ شوہر سے وصول کرسکتی ہے اور اگر شوہر ایک دم نادہند ہے تو وہ دعویٰ دائر کر کے اپنا نکاح فسخ کراسکتی ہے وہ تمہارے طلاق کی محتاج نہیں رہے گی اگر مرد مالدار ہے اور خود معمولی پہنتا ہے تو اس کی حیثیت کے دوسرے لوگوں کی عورتیں اطلس وکمخواب پہنتی ہیں تو مرد کا فرض ہے کہ عورت کے مطالبہ پر اس کو اطلس وکمخواب ہی فراہم کرے وہ خود جو چاہے پہنے، عورت کہہ سکتی ہے کہ میں کھانا نہیں پکاؤں گی، اپنے کچن کا انتظام تم کرو اور نوکرانی رکھو تو مرد کو اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا، بچہ پیدا ہوجائے تو عورت کہہ سکتی ہے کہ اپنے بچے کے دودھ کا انتظام کرو میں اس کو دودھ پلاکر اپنی صحت برباد نہیں کروں گی تو مرد کا فرض ہوگا کہ وہ دایہ کا انتظام کرے حتیٰ کہ وہ بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہیں جس کو ماڈرن عورتیں صاف لفظوں میں بیان نہیں کرتی ہیں جب کہ ساری ترقی پسندی ساری روشن خیالی اور سارے فتنہ کی جڑ یہی ہے اور وہ ''جنسی بھوک'' کا مسئلہ ہے، اسلام نے اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے، اگر مرد کے اندر عورت کی جنسی بھوک مٹانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے تو عورت کو اسلام اجازت دیتا ہے کہ قاضی کے یہاں دعویٰ کر کے شوہر سے نجات حاصل کرلے، عورت پر معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں، وہ ایک پائی بھی کماکر لانے کی پابند نہیں بلکہ اگر ذاتی طور پر اس کو دولت حاصل ہے تو شوہر کو اس میں سے ایک پائی بھی خرچ کرنے کا اختیار نہیں کیونکہ یہ عورت کی ذاتی ملکیت ہے اور اگر شوہر وفات پاجائے تو جیسے اس کے خون کے رشتہ دار وراثت پانے کے

حقدار ہیں اسی طرح عورت کا بھی اپنے شوہر کے مال سے حصہ ہے، اسی طرح عورت کو اپنے باپ کی جائداد میں بھی حصہ دار بنایا گیا ہے یہ ساری تفصیلات اسلامی قانون میں مذکور ہیں، تمام فقہ کی کتابیں ان مسائل سے بھری پڑی ہیں اس کی روشنی میں آپ تمام مذاہب کی طرف سے عورت کو حاصل ہونے والی سہولتوں کا جائزہ لیجئے اگر آپ کا مطالعہ غیر جانبدارانہ اور ذہنی تحفظ کے بغیر ہے تو یقیناً آپ اسلامی اصولوں اور احکام کی برتری کا اعتراف کریں گے، اسلام نے عورت کی تخلیقی اور فطری خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اس کی زندگی کے لئے جو شاہراہ بنائی ہے اگر وہ اس شاہراہ پر چلتی ہے تو وہ ہر طرح کے ذہنی وفکری جسمانی وروحانی خطرات وحوادثات سے محفوظ ہوگی اور کبھی بھی ذہنی کشمکش کا وہ شکار نہیں ہوگی اور عمر کے کسی بھی حصہ میں کسمپرسی میں گرفتار نہیں ہوگی، کیونکہ یہ ساری سہولتیں قانون فطرت کے مطابق ہیں اور جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ اس کی عزت واحترام کی ضمانت ہے مرد اور عورت کی مساوات کا جو مظاہرہ ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتا ہے وہ عورت کی زندگی کے لئے قطعی غیر فطری اور مصنوعی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج یورپ وامریکہ کے دانشور اپنے معاشرہ کی تباہی وبربادی پر ماتم کناں ہیں اور وہاں کے مدبرین عائلی زندگی میں سکون سے محرومی کا شکوہ کرتے ہیں۔

جانوروں کے ساتھ ساتھ عورت کا ذکر

مصنفہ نے اپنی کتاب میں متعدد احادیث کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں عورت کا ذکر اہانت آمیز طریقے سے کیا گیا ہے، یہ ان کے کچے مطالعہ کا نتیجہ ہے، ان کے اندر احادیث کی تفصیلی بحثوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں، سماجیات کی پروفیسری اور بات ہے، یہ تو ایک پٹری پر چلتی ہوئی گاڑی کی ایک منزل ہے۔

علم حدیث ایک بحر ناپیدا کنار ہے، محدثین نے پوری پوری زندگی اس میں غواصی کی ہے تب کہیں جا کر حقائق ومعارف کے موتی ان کے ہاتھ آئے ہیں۔ اس سمندر میں اُترنے کے لئے سماجیات کی ایک پروفیسر نے بلاوجہ جل پری بننے کی کوشش

کی ہے، انھوں نے مصلی کے سامنے سے بعض جانوروں اور عورت کے گذر جانے سے نماز فاسد ہونے والی حدیث کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ عورکا ذکر انتہائی اہانت آمیز طریقہ سے کیا گیا ہے اگر حدیث سے استدلال کرنے کی جرأت کر ہی لی تھی تو اسی بات میں حضرت عائشہؓ کی روایت بھی پڑھ لی ہوتی تو ان کو اس غلط فہمی پھیلانے کی جرأت نہ ہوتی۔

مسلمان نماز کے بارے میں کیا تصورات رکھتے ہیں اگر پروفیسر صاحب نے یہ بات سمجھ لی ہوتی تو شاید ان کو اس سوال کی جسارت نہ ہوتی اسلامی حکماء نے احکام وقوانین شرعی کے جو اسرار وحکم بیان کئے ہیں اگر ان کا مطالعہ کرلیا ہوتا تو ان کو خود اپنا اعتراض احمقانہ معلوم ہونے لگتا، مسلمان جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میں خدائے ذوالجلال کے دربار میں کھڑا ہوں وہ انتہائی خشوع وخضوع سے اور دل کو ہر طرح کے خیالات وافکار سے خالی کر کے اپنے مالک حقیقی کی حمد وثنا کرتا ہے اپنی مغفرت اور آخرت میں کامیابی کی دعا کرتا ہے وہ اپنی ساری توجہ خدا کی عظمت وجلال کی جانب مرکوز رکھنا چاہتا ہے اس میں کسی دوسری جانب خیال وذہن کا منتقل ہونا نہ خود پسند کرنا ہے اور نہ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اس کی نماز میں جو چیز بھی خلل انداز ہوگی اس سے اس کی روح عبادت مجروح ہو جاتی ہے اور اس کی نماز کا کیف غارت ہو جاتا ہے۔

ذہنی انتشار کا باعث دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں ایک ناگوار خاطر اور ناپسندیدہ مکروہ صورت چیز، دوسری بہت ہی عزیز اور پسندیدہ چیز، اس حدیث میں دونوں طرح کی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، کتنے اور گدھے کا ذکر ناپسندیدگی کی وجہ سے اور عورت کا ذکر جاذب نظر اور محبوب خاطر ہونے کی حیثیت سے کیا گیا ہے، جس طرح نفرت انگیز چیز کے دیکھنے سے ذہن میں تنفر پیدا ہوتا ہے اور ذہنی خلجان ہوتا ہے اسی طرح عمدہ ترین چیزوں پر نظر پڑنے سے ذہنی خلجان پیدا ہوتا ہے دونوں صورتوں میں نماز کے اس خشوع وخضوع میں خلل پڑتا ہے جو نماز میں مطلوب ہے نمازی کا ذہن اور دل خدا کی

طرف سے ہٹ کر ان چیزوں کی جانب ہو جاتا ہے جو نماز جیسی عبادت میں ناپسندیدہ ہے[۱]، اس حدیث سے عورت کے اعزاز وافتخار میں اضافہ ہوتا ہے، توہین کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ جس طرح جانوروں کے خون کی خرید وفرخت شریعت میں حرام ہے اسی طرح انسانی خون کی خرید وفرخت حرام ہے، حرام جانوروں کا دودھ خریدنا اور بیچنا حرام ہے عورت کے دودھ کی بھی خرید وفروخت حرام ہے، حرام جانوروں کی خباثت کی وجہ سے اور انسانی خون یا دودھ انسانیت کے احترام کی وجہ سے، اس میں انسان کی توہین کا پہلو نکالنا سماجیات کی پروفیسر کے یہاں تو ہوسکتا ہے، علم حدیث اور علم شریعت کے ماہرین کے نزدیک اس کا تصور بھی احمقانہ ہے۔

پھر عورت کے سامنے ہونے سے نماز فاسد بھی نہیں ہوتی تمام جمہورین محدثین کی یہی رائے اور تمام فقہاء کا یہی فتویٰ ہے خود ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت میں ان لوگوں پر طنز کیا گیا ہے جو جانوروں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے نمازی کے سامنے ہونے سے نماز فاسد ہونے کی بات کرتے تھے انھوں نے خود اپنا ذاتی واقعہ بیان کیا کہ میں کمرے میں لیٹی رہتی تھی اور حضورؐ وہیں نماز ادا فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ کی سجدہ گاہ تک میرا پاؤں کبھی پہنچ جاتا تو آپؐ سجدہ کرتے ہوئے میرے پاؤں میں ایک انگلی لگا دیتے تو میں فوراً پاؤں سمیٹ لیتی تب آپؐ اس کے بعد پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔

مصنفہ نے اپنے ناقص مطالعہ یا کسی سے سن کر اس حدیث کا ذکر بطور دلیل اپنے دعویٰ میں پیش کر دیا جب کہ حدیث کے مفہوم تک ان کے ذہن کی رسائی بھی نہیں۔

یہودیوں جیسا ایک اعتراض

مصنفہ نے بڑے ہی گستاخانہ لب ولہجہ میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کیا ہے کہ ''یہ کیسا نبی ہے کہ وہ مجمع عام میں جنسی معاملات کا ذکر کرتا ہے'' سنجیدہ علمی گفتگو

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ بحوالہ حاشیہ ابوداؤد ج۱ص۱۰۲، بذل المجہود پہلا ایڈیشن ج۱ص۳۷۲۔

کے بجائے عورتوں کی فطرت کے مطابق جتنا زہریلا طنز انھوں نے کیا ہے وہ کسی غیر تمند مسلمان کے لئے قطعاً ناقابل برداشت ہے مگر ان کو اپنی نادانی کا احساس نہیں ہوا، مصنفہ نے یہودیوں کے اس گروہ کی تقلید کی جس نے صحابہ کرام پر طنز کیا تھا کہ تمہارے نبی کیسے ہیں کہ پیشاب پاخانہ کی تعلیم دیتے ہیں[1]؟ مصنفہ نے انھیں کا لب ولہجہ چرایا ہے۔

جنسی معاملات کا پاکیزہ لب ولہجہ میں اظہار، اس کی حدود کی نشاندہی جنسی انارکی اور صنفی آوارگی کے جملہ اسباب ووداعی پر روشنی ڈالنا اور جنس کے معاملہ میں واضح اور کھلے لفظوں میں ہدایات دینا ہی انسانیت کے شرف ومجد کو باقی رکھنے اور انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند اور باعظمت بنانے کی صحیح کوشش ہے اور اخلاقی اعتبار سے بیمار معاشرہ کا صحیح علاج ہے، ایک ماہر ڈاکٹر مریض کو واضح ہدایات دیتا ہے، پرہیز اور دواؤں کے صحیح اور بروقت استعمال کا طریقہ بتاتا ہے تاکہ مریض کو شفاء کامل حاصل ہو جائے، ضرورت پڑنے پر انجکشن بھی لگاتا ہے اور کھانے کی بھی دوائیں دیتا ہے اگر نازک مقامات کے آپریشن پر مجبور ہوتا ہے تو پردے کے مقامات کا آپریشن بھی کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر مریض کی زندگی نہیں بچائی جاسکتی، جسم کا وہ حصہ جس کا کھلنا کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا وہ ڈاکٹر کے سامنے بے نقاب کرنا پڑتا ہے لیکن آپ نے ڈاکٹر کو کبھی مطعون نہیں کیا کہ وہ انسانیت کو بے آبرو کرتا ہے بلکہ شفاء کے بعد اس کو اپنا محسن مانتے ہیں، اسی طرح میڈیکل کالجوں میں علم تشریح الاجسام پڑھایا جاتا ہے ان کتابوں میں انسانی جسم کے ہر ہر عضو کی مکمل تشریح ہوتی ہے، اس کی شکل وصورت اس کی قدرتی بناوٹ اس کی ضرورت وافادیت اس کے مضر ومفید پہلوؤں کی کلاس میں وضاحت اور نشاندہی کی جاتی ہے ان کی قلمی تصویر بنا کر طلبہ کو سمجھایا جاتا ہے تاکہ ان مخصوص اعضا کے غلط استعمال سے جو نقصانات پہنچتے ہیں اس کے اسباب کو سمجھا جاسکے اور اس کے علاج پر آئندہ طلبہ کو قدرت حاصل ہو، طب کی تعلیم میں کوئی راز راز

---

[1] ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۳ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

نہیں رہتا مگر کوئی بھی عقلمند آدمی ان پر طنز نہیں کرتا کہ وہ ایسی گندی کتابیں پڑھتے ہیں، لیکن ایک عظیم الشان روحانی معالج نے جو بیمار انسانیت کی مسیحائی کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے پاکیزہ لب ولہجہ میں پوری دنیائے انسانیت کی عظمت وشرافت کی حفاظت کے لئے ہدایات دین، جنسی فعل کے جائز وناجائز، حرام اور مباح حدود کی نشاندھی کی تو مصنفہ کو اس عظیم المرتبت رسول اور خدا کے پیغمبر پر اعتراض کی جسارت ہوگئی؟ آج دنیا میں پچاس فیصدی برائیاں انھیں جنسی معاملات میں غلط روی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور آج ترقی یافتہ یورپین ممالک اسی جنسی معاملہ میں بے راہروی کی وجہ سے ذہنی وفکری عذاب میں مبتلا ہیں۔ شاید آپ کو بھی اس کی خبر ہو اور اگر نہیں ہے تو میں پوری تفصیل سے آپ کو یہ داستان سناؤں گا۔

بے خبری اور دعوئ ہمہ دانی

پروفیسر صاحبہ کا اسلام کا مطالعہ سطحی اور بہت محدود ہے ان کے سامنے شاید ان کے ذاتی مسائل ہیں، جن میں ناکامی کے بعد انھوں نے اپنا سارا غصہ اسلام پر اُتارا ہے جیسے شوہر سے لڑائی ہونے پر عورتیں اپنے بچے کو دھن کر رکھ دیتی ہیں، ان کے دل ودماغ پر ترقی پسندی آزاد اور معاشرتی زندگی اور بے لگام جنسی زندگی کا جنون چھایا ہوا ہے اگر انھوں نے ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں کی زندگی پر شائع ہونے والے بے شمار لٹریچر میں سے کچھ بھی مطالعہ کر لیا ہوتا تو ان کا سارا اندیشہ ہرن ہو جاتا اور اسلام پر اعتراض کی جرأت بیجا نہ ہوتی، اسلام نے عورت کو جو عزت دی ہے پاکیزگی وتقدس عطا کیا ہے اس پر ایک ہلکی روشنی پہلے ڈال چکا ہوں میں نے بتایا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت ایک ملکہ اور ایک شہزادی کی ہے اس کے ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کا رنگ کبھی پھیکا نہیں پڑ سکتا، نہ اس کو فیکٹریوں اور کارخانوں میں نوکری کرنے کی ضرورت ہے نہ کسی کی پرائیوٹ سکریٹری بننے کی حاجت نہ کلرکی اس کی شایان شان ہے نہ افسری، اس لئے کہ گلاب کے پھول کے لئے ہر آب وہوا اور ہر فضا راس

نہیں آتی، نہ وہ ہر جگہ محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ بار بار ہاتھ لگنے سے اس کی تازگی وشادابی برقرار رہ سکتی ہے شاہراہ عام پر گلاب کے پودے لگا کر دیکھو جب اس کی شاخوں پر کوئی مسکراتا ہوا پھول نظر آئے گا تو کسی منچلے راہ گیر، کسی شوخ اور طرحدار نوجوان کا ہاتھ اس کی سمت بڑھے گا اور اس کو شاخ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے بستر کی زینت بنادے گا اگر صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے اور وہ تمام قانونی وشرعی سہولتیں عورت کو حاصل ہوجائیں جو اسلام نے نافذ کی ہیں تو خاندانی زندگی جنت ارضی کا نمونہ بن جائے جس میں عورت عزت ووقار کا تاج پہن کر حکمرانی کرتی رہے۔

عورت اور مرد کی مساوات

مصنفہ عورت اور مرد کے درمیان مکمل مساوات کی مدعی ہیں اس لئے وہ اسلام پر اعتراض کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ مسلمان عورت اور مرد میں مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ قرآن اور احادیث ان کے دعوی کی تکذیب کرتے ہیں، معلوم نہیں کس مسلمان سے ان کا سابقہ پڑا جس نے اسلام میں عورت اور مرد کی مکمل مساوات کا ذکر ان سے کیا ہے اور انھوں نے کون سی حدیث اور قرآن پڑھا ہے جس میں اس دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے، کوئی واقف کار مسلمان قطعاً یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ عورت اور مرد میں مکمل مساوات ہے، تہذیب جدید سے مرعوب ہوکر یہ دعویٰ کرنا مزید حماقت ہے، جو لوگ مردوزن میں مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں اور عملی طور پر انھوں نے اس کا نفاذ کردیا ہے وہ لوگ درحقیقت فطرت سے جنگ کرتے ہیں اور فطرت سے جنگ کرکے کبھی انسان کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ آج تک کامیاب ہوا ہے۔

قدرت نے دو جنس بنائی ہے دونوں کے جسموں میں نمایاں تفریق رکھی، ذہن وفکر دونوں کو الگ الگ بنائے، دونوں کی فطری رجحانات ومیلانات اور مزاجی خصوصیات الگ الگ رکھیں، دونوں کے چہرے مہرے، ہاتھ پاؤں جسمانی طاقت وقوت، تحمل وتفکر، دور اندیشی ومآل اندیشی، صبر وضبط، جوش وجذبہ، عزم وحوصلہ،

خطرات میں جرأت وہمت، غرضیکہ ہر ہر جسمانی، ذہنی وفکری جذبات اور قوتوں میں اتنا نمایاں فرق رکھا ہے کہ کوئی بھی شخص جس کے پاس عقل اور فہم وفراست ہے مرد اور عورت میں مکمل مساوات کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا، جو لوگ مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ مصنوعی طور پر عورت کی سطح کو اونچا کر کے اور مرد کو اس کی سطح سے نیچا کر کے کہتے ہیں کہ دیکھو ہم نے مساوات کردی، یورپ وامریکہ میں اور بعض دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں عملی طور پر یہ مصنوعی اور خلاف فطرت مساوات نافذ کردی گئی ہے اس کے نتیجے میں وہاں کے معاشرہ میں جو ابتری پھیلی، عائلی زندگی پر جو تباہی وبربادی آئی اس کا خمیازہ وہ بھگت رہے ہیں، یورپ کا دانشور طبقہ اس صورت حال سے پریشان ہے اور وہاں کی خاندانی زندگی پر جو کاری زخم لگا ہے اس کے درد وکرب سے کراہ رہی ہے۔

مرد وزن میں مکمل مساوات ممکن نہیں

قدرت نے مرد کو مستقیم القامت بنایا ہے اور عورت کو بھی، مرد کو عقل وفہم کی دولت سے نوازا ہے اور عورت کو بھی، ایک دھڑکتا ہوا دل مرد کے سینے میں بھی ہے اور عورت کے بھی، دل ودماغ میں جس طرح افکار وخیالات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں اچھے اور بُرے کی تمیز کرنے کی صلاحیت مرد میں بھی ہے اور عورت میں بھی، یہ انسانیت کا رشتہ ہے جس میں دونوں برابر ہیں، لیکن اسی قدرت نے مرد اور عورت کے جسم میں کچھ ایسی خصوصیات مخفی رکھی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں، ایک نوجوان مرد ایک نوجوان عورت کے کسی بھی حصۂ جسم پر صرف ایک انگلی رکھدے تو دونوں کو ایک شاک لگ جاتا ہے چند لمحوں میں دونوں کے چہروں پر اندرونی جذبات کے تلاطم وتموج سے سرخی اس طرح چھا جائے گی جیسے جسم کا سارا خون چہرے میں اتر آیا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں ایک دوسرے کو قلم دیتے ہوئے ایک دوسرے کی انگلیاں مس ہوجاتی ہیں تو صرف اتنے ہی سے دونوں کے جسموں میں کرنٹ دوڑ جاتا ہے، آخر یہ کیوں ہوتا ہے؟ کیا مصنفہ نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا ہے آگ آگ

میں ڈالئے پانی پانی میں ڈالئے کوئی نئی کیفیت نہیں پیدا ہوتی لیکن دہکتے ہوئے انگارے کو پانی میں ڈالئے یا دہکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالئے کیسی چیخ سنائی دیتی ہے، یہ اختلاف طبیعت ومزاج کا فرق ہے اسی طرح دونوں کے جسم کی خصوصیات دو ہیں جیسے بجلی کے دونوں تار ایک نگیٹیو ایک پازیٹیو، ایک ٹھنڈا اور ایک گرم، دونوں تار جب مل جاتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے، بلب روشن ہو جاتے ہیں پنکھے ہوا دینے لگتے ہیں، آپ کا کولر اور ایر کنڈیشنر سکوں بخش فضا بنانے لگتا ہے، آپ کی فریج آپ کے مشروبات کو برف کی چادر اُڑھا دیتی ہے، اگر بجلی کے ان دونوں تاروں کو علیحدہ کر دیجئے اور ایک ہی طرح کے دس تار اس میں جوڑ دیجئے تو کرنٹ نہیں پیدا ہوگا جبکہ بظاہر دونوں تار بالکل ایک جیسے ہیں ان میں تمیز کرنا مشکل ہے کہ کون تار ٹھنڈا ہے اور کون گرم تار، لیکن دونوں کی خصوصیات الگ الگ ہیں، عورت اور مرد دونوں انسانیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے دو مجسمے ہیں انسانیت دونوں میں قدر مشترک ہے لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو بجلی کے ٹھنڈے اور گرم تار میں فرق ہے۔

عورت اور مرد میں جو لوگ مکمل مساوات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ فریب میں مبتلا ہیں اور قدرت کو اس کی تخلیق کے معاملہ میں چیلنج کرتے ہیں اگر عورت اور مرد میں کچھ چیزیں مشترک ہیں تو کچھ دوسری چیزوں میں ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہے، یہ اختلاف فطری اور تخلیقی طور پر ہے اس لئے عورت اور مرد میں مکمل مساوات کا کوئی سوال ہی نہیں۔

اسلام، عورت دشمن مذہب ہے

پروفیسر صاحبہ کہتی ہیں کہ ''اسلام ایک عورت مخالف مذہب ہے'' بیویوں کو مارنے پیٹنے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بالکل متضاد نظریات رکھتے تھے ایک قرآنی آیت نے جس نے آخری تدبیر کے طور پر مردوں کو بیویوں کو مارنے کا حق عطا کیا، مردوں کے حق میں فائدہ مند ہی ثابت ہوئی۔

ان کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے خدا اور رسول اور عمر سب کو ایک ساتھ نشانہ بنادیا ''تریاہٹ'' کا لفظ ہم بھی سنتے آتے تھے آج ہم نے بچشم خود اس کا مشاہدہ کرلیا، اگر انھوں نے قرآن کی پوری آیت سامنے رکھی ہوتی اور انسانی فطرت کا غائر مطالعہ کیا ہوتا تو شاید ان کو اس اعتراض کی جسارت نہ ہوتی، ان کو تو یہ علم ہوا کہ اسلام بیویوں کی اصلاح کی ساری تدابیر کی ناکامی کے بعد مارنے کی اجازت دیتا ہے اور شاید لاکھوں میں کبھی بات اس مرحلے پر پہنچتی ہے لیکن اکثر اخبارات میں جو یہ خبریں آتی ہیں کہ ایک بیوی نے اپنے آشنا کے ذریعہ اپنے شوہر کو قتل کرادیا یہ خبریں ان کی نگاہ سے نہیں گذریں، مردوں کو صرف اجازت دی گئی تو آپ اتنی برہمی کا اظہار کررہی ہیں چاہے عملاً اس کا وجود نہ ہو اور عورت عملاً قتل کرکے دکھادیتی ہے کہ میری آوارگی کی راہ میں جو حائل ہوگا اس کا یہی انجام ہوگا یہاں آپ کی غیرت کو کیوں نہیں ٹھیس لگتی۔

میاں بیوی کے درمیان جہاں بے مثال محبت ہوتی ہے دونوں میں اختلافات بھی کبھی کبھی ہوجاتا ہے خانگی زندگی کے ناخوشگوار ماحول کو درست کرنے کے لئے قرآن نے تدبیر بتائی ہے تاکہ عائلی زندگی کا شیرازہ نہ ٹوٹے، قرآن کی پوری آیت یہ ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا.

جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو تو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو، پھر اگر کہا مانیں تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی[1]۔

اس آیت میں خاندانی نظام کی اصلاح کے لئے تین مرحلے متعین کئے گئے ہیں اگر عائلی نظام کے اصولوں کی خلاف ورزی پائی جائے تو خیر خواہی کے ساتھ نرم لب و لہجہ میں اپنی بیویوں کو سمجھاؤ اور نشیب و فراز کو بتاؤ اگر بیوی عقلمند ہے تو وہ اسی مرحلہ پر صحیح راہ اختیار کرلے گی اور اگر تمہاری بات کارگر نہیں ہوئی تو اظہار ناراضگی کے لئے بیوی کے کمرے میں سونا چھوڑ دو، دوسرے کمرے میں رات گذارو، اگر اس کے پاس عقل

[1] ترجمہ شیخ الہند ص ۱۰۸۔

وفراست کی کمی ہوگی تب بھی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ جائے گی اور اپنا رویہ بدل دے گی، اگر دوسرے مرحلہ پر بھی بیوی صحیح راہ پر نہیں آئی اور اپنی فطری ''تریاہٹ'' پر اتر آئے تو تم کو مارنے کی اجازت ہے مگر مار ایسی ہو کہ اس کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے[1]۔ یہ اصلاح کا آخری مرحلہ ہے قرآن نے مزید ہدایت دی کہ اگر وہ تمہاری بات مان جائے تو الزام تراشی کے بہانے مت ڈھونڈو۔ عائلی زندگی کے استحکام کی قرآن نے یہ تدبیر بتائی ہے ہر عقلمند آدمی جس کو انسانی نفسیات سے ذرا بھی واقفیت ہے وہ یہی کہے گا کہ خاندان کی درستگی اور اس کے نظام کو صحیح رکھنے کے لئے اس سے بہتر تدبیر نہیں ہوسکتی۔

مصنفہ کو اعتراض کرنے سے پہلے اس لائحہ عمل کو سمجھ لینا چاہئے تھا جو اسلام نے عائلی زندگی کے لئے بنایا ہے اور پورے نظام عمل کے لئے چوکھٹے میں اس صورت حال کی تصویر کو فٹ کر کے دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ تصویر اپنی موزوں جگہ پر ہے یا نہیں؟ اسلام نے عورت پر معاش کی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی ہے، پورے خاندان کا سارا بار مرد کے کندھوں پر ہے، ہر قسم کی جسمانی وذہنی مشقتیں اٹھا کر خاندان کے نظام کو پرسکون ڈھنگ سے چلانے کا ذمہ دار مرد کو بنایا گیا ہے اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو خدا کے یہاں باز پرس ہوگی، اس طرح خاندان میں مرد کو ایک سربراہ کی حیثیت حاصل ہوگئی، ہر ایک کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتا ہے، ماں باپ، بیوی بچوں کے لباس، خوراک دوا علاج، تعلیم غرضیکہ سارے اخراجات کی ذمہ داری اس کے سر ہے اسی طرح وہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ خاندان کے کسی فرد کی طرف سے بے نیازی نہ ہو اور کسی سے ایسا فعل صادر نہ ہونے دے جو خاندان کی شیرازہ بندی کو کمزور کرے اور معاشرتی نظام میں رخنہ اندازی ہو اس کو سمجھائے، تنبیہ کرے، اور ضرورت پڑے تو جسمانی سزا بھی دے سکتا ہے جیسے اس کا دس برس کا لڑکا نماز نہیں پڑھتا ہے تو اس کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے اگر وہ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے یہ کرتا ہے تو

[1] ترجمہ شیخ الہند فوائد عثمانی حاشیہ ۵۔

معیوب کیسے ہوگیا؟ دنیا کا پورا نظام اسی اصول پر چلتا ہے، یہ کون سی عقلمندی کی بات ہے کہ مرد حاکم بھی بنایا جائے اور ساری ذمہ داریاں بھی اس کو دی جائیں اور پھر اس کو اختیارات بھی حاصل نہ ہوں ایسا نظام عمل تو ایک منٹ میں درہم برہم ہوسکتا ہے، قانون فطرت یہی ہے جو اسلام نے بتایا ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی، جو حاکم ہو وہ اپنے اختیارات سے کام لے اور نظام زندگی میں خلل نہ آنے دے اگر یہ اختیارات مرد کو دیئے گئے ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے اس میں عورت کے ساتھ دشمنی، اس کی اہانت اور اس کی تحقیر کا کون سا پہلو ہے، بیٹا چاہے جتنے بڑے منصب پر فائز ہو جائے لیکن باپ کے سامنے اس کی حیثیت خادم ہی کی رہے گی اس سے اس کی عظمت میں کمی نہ ہوگی اور نہ اس میں اس کی توہین کا کوئی پہلو ہے بلکہ دنیا بیٹے کی شرافت اور عظمت کی قائل ہو جائے گی، جرم کی سزا ہر شخص بھگتتا ہے اگر عورت سے جرم کا صدور نہیں ہوا اور اس کو سزا دی گئی تو یقیناً یہ جابرانہ طریقہ ہوسکتا ہے بس اتنی بات پر اور غلط فہمی کی بنیاد پر یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اسلام عورت دشمن مذہب ہے۔

اس اصولی گفتگو کے بعد میں آپ کی ذات سے متعلق ایک بات پوچھتا ہوں اور بہت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر سوچ کر جواب دیں گی، آپ نے مسلسل ایک گھنٹہ کی مشقت کے بعد اپنے آپ کو یونیورسٹی جانے کے لئے تیار کیا اپنے آئینہ کے سامنے سے اُٹھ کر باہر آئیں تو آپ کا چار سالہ بچہ اپنا کھیل چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا اور آپ کی صاف شفاف ساری پکڑ لی اور اس کی پانچوں انگلیوں کی کالک آپ کے کپڑے پر لگ گئی، آپ کی نظر اس پر پڑی تو آپ کا خون کھول گیا اور بچے کے پھول سے رخسار پر ایک طمانچہ آپ نے جڑ دیا کہ کمبخت نے میری ایک گھنٹہ کی محنت اکارت کر دی لڑکا بلک بلک کر رونے لگا، سوال یہ ہے کہ بچے کو مارنے کا اختیار آپ کو کہاں سے حاصل ہوگیا؟ کیا آپ کے دل میں اس کی کوئی محبت نہیں ہے؟ میرے خیال میں ان باتوں کا جواب آپ نفی میں دیں گی، کیونکہ وہ آپ کا اکلوتا بچہ ہے، خوبصورت ہے، اس کی ہر شوخی وشرارت آپ کے دل میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے، اس کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں کو

ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے، وہ آپ کی امیدوں کا چراغ ہے، اس کو ذرا سی حرارت ہوجاتی ہے تو آپ بےچین ہو جاتی ہیں، اس کے لئے رات رات بھر آپ جاگتی ہیں اگر بیمار پڑ جائے تو اپنی ساری تنخواہ اس پر خرچ کر کے بھی اس کو صحت مل جائے تو اس کے خرچ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتیں، ان تمام جذباتی رشتوں کے باوجود آپ نے اس کو مارا، اس کی معصومیت پر آپ کا دل نہیں پسیجا، اس کی نادانستگی میں ہونے والی غلطی کو آپ نے معاف نہیں کیا اس مارنے کی وجہ سے آپ کو جلاد اور چنگیز و ہلاکو کہا جا سکتا ہے؟ کیا آپ کو یہ خطاب پسند آئے گا؟ جب کہ بظاہر آپ کا یہ فعل ظالمانہ نظر آتا ہے، آپ یہی کہیں گی کہ میں نے اس کو دشمنی کی وجہ سے نہیں مارا بلکہ غایت محبت کی وجہ سے مارا ہے، اس کو تہذیب و شائستگی سکھانے اور اس کے مستقبل کو سنوارنے کے خیال سے مارا ہے اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں اس کی حفاظت میں جان لڑا دوں گی، آپ کی یہ توجیہہ دل کو لگتی ہے اور صحیح بھی ہے لیکن جس کو آپ نے سزا دی ہے اس کو ابھی اپنے بھلے بُرے کی تمیز نہیں ہے وہ غلطی کو سمجھ کر نہیں کرتا اس کے برعکس بیوی غلطی کو غلطی سمجھ کر کرتی ہے اور دانستہ کرتی ہے اس میں اپنے برے بھلے کی تمیز کلی طور پر پائی جاتی ہے، بیوی کا جرم بچے کے جرم سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے، جب ایک معصوم بچے کی سزا کو اپنا جائز حق سمجھتی ہیں جس کا جرم بہت ہلکا ہے تو مرد کو اپنی بیوی کو سزا دینے کی جو اجازت ہے جب کہ اس کا جرم بھی بڑا ہے، اس کو آپ کی عقل کیسے ظالمانہ اور جابرانہ تصور کرتی ہے؟ شریعت کی اس اجازت کی آپ کوئی خوبصورت توجیہہ کیوں نہیں تلاش کر لیتیں جو آپ نے اپنے معصوم بچے کو سزا دینے کے لئے تلاش کر لی ہے۔

قرآن کا ہر حکم حکمتوں پر مبنی ہوتا ہے، عورت فطری طور پر زود رنج ہے، ضد اور ہٹ کا مادہ اس میں ہے جو عاقبت بینی اور مآل اندیشی کی راہ میں سنگ گراں کی حیثیت رکھتا ہے پھر ایسی صورت میں آپ سے بے پناہ محبت کرنے والا شوہر آپ کو نصیحت کرتا ہے، اظہار ناراضگی کے لئے آپ کے کمرے میں شب گذاری چھوڑ دیتا ہے تو آپ اگر عقل سے کام لے کر اپنی ضد اور ہٹ کو پیروں سے کچل دیں تو خوبصورتی سے بات ختم ہو سکتی

ہے اور آپ کے گھر میں کیف و مسرت کی فضا پیدا ہو جائے، یہی شریعت کا مقصد ہے۔

آپ کے ہاتھ میں زخم ہو گیا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا، ڈاکٹر کہتا ہے کہ زخم میں زہر پھیل گیا ہے کوئی دوا کوئی انجکشن کام نہیں کر سکتا، اگر ہاتھ نہیں کاٹا گیا تو زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا جس کا انجام موت ہوگی آخری علاج کے طور پر ڈاکٹر نے ہاتھ کاٹ کر مریض کی زندگی کو بچا لیا، کیا آپ ڈاکٹر کو ظالم و جابر کہیں گی؟ الٹے اس کو آپ اپنا محسن تصور کریں گی کیونکہ اس نے جان بچائی ہے اور آخری علاج کے طور پر ہاتھ کاٹا ہے اس کے لئے کوئی علاج نہیں تھا، قرآن نے بھی آخری علاج کے طور پر ایک ہلکی مار تجویز کی ہے جو فطرت انسانی کے پیش نظر ضروری تھا تو پھر آپ کو اسلام کو عورت دشمن مذہب کہنے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ یاد رکھئے کہ اسی قرآن نے عورت کو شوہر کے لئے ایک محبوب ملکہ کی حیثیت اور مقام دیا ہے قرآن کی آیت ہے:

وَمِنْ اٰيَاتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مُوَدَّةً وَّ رَحْمَةً.

پھر اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو اس کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی۔

قدرت عورت کو اپنی تخلیق کا شاہکار کہتی ہے اس کی ذات سے سکون، چین، محبت و مسرت کی خوشبو پھوٹنے کا ذکر کرتی ہے یہ اعزاز عورت کو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیا یہ صرف اسلام کا صدقہ ہے۔

اسلام میں عورت با اختیار ہے

اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو اس بات کے مواقع دیئے گئے ہیں کہ اپنے ہونے والے جوڑے کو سمجھ سکیں اور اپنی مرضی سے انتخاب کریں، اسلام میں عورت کے لئے سخت پردے کا حکم ہے اس کے باوجود اگر آپ نکاح کا عزم رکھتے ہیں تو اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ سکتے ہیں، شریعت اس کی اجازت دیتی ہے اسی طرح

عورت کو حق ہے کہ اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں حقیقت حال معلوم کر کے دل مطمئن کر لے اور آزادانہ انتخاب کرے، اگر ناپسند ہے تو اس کو انکار کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے بغیر عورت کی اجازت کے اور اس کی مرضی معلوم کئے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوسکتا اگر عزیز وا قارب نے بغیر اس کی اجازت و مرضی کے کسی سے نکاج کر دیا تو وہ نکاح نہیں ہوا۔

اس کے مقابلے میں جو قوم یہاں ۸۵ فیصدی کی تعداد میں بستی ہے اس کے یہاں ماں باپ نے جو رشتہ منتخب کرلیا وہ نا قابل تنسیخ ہے لڑکی اس سماج میں اتنی بے وزن اور بے قیمت ہے کہ لڑکی کے باپ کو ہونے والے داماد کو ایک معقول رقم اُلٹے ادا کرنی پڑتی ہے اور شادی ہو جانے کے بعد اگر لڑکی کے لئے شوہر قطعی غیر موزوں اور ناپسندیدہ ہے تو اس سے نجات کے سارے درازے بند ہو جاتے ہیں، شوہر شرابی ہے، جواری ہے، بھوکوں مارتا ہو، صبح وشام زدوکوب کرتا ہو عورت کو اس عذاب میں گھٹ گھٹ کر جینا ہوگا اس سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں نہ ان کا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے نہ ہندو کوڈ بل اس عورت کی مصیبت دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، عورت سسرال میں دی جانے والی ساری اذیتوں کو جھیلے گی، پاس پڑوس کے لوگوں کی آنکھیں اس کی مظلومیت پر بھر آئیں گی مگر عورت کو نجات حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہوگی، ہم روز اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ بہو کو جلا کر مار ڈالا گیا، جہیز میں فرمائش پوری نہ ہونے پر شوہر اور اس کے گھر والوں کی طرف سے اس نئ نویلی دلہن کو ایسی عبرتناک سزا ملے گی کہ انسانیت تڑپ اٹھے غیر متعلق لوگوں کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں لڑکیاں اپنے والدین کو اپنی اذیتناک زندگی کی اطلاعیں دیتی ہیں اور صاف لفظوں میں بتاتی ہیں کہ میری جان کو خطرہ ہے، شوہر کے گھر والے شب و روز زہریلے بچھوؤں کی طرح ڈنک مارتے رہتے ہیں لڑکی اور اس کے ماں باپ کو صلواتیں سناتے ہیں، لڑکی کئی کئی وقت فاقے کرتی ہے ان باتوں کا لڑکی کے والدین کو پورا پورا علم ہوتا ہے مگر وہ اپنی لڑکی کی جان بچانے کے لئے کچھ نہیں کر پاتے کیونکہ

ان کے ہاتھوں اور پیروں میں مذہب اور سماج کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، طلاق کا ان کے دھرم میں وجود نہیں اس لئے پھولوں کے پالنے میں پلی ہوئی لڑکی کو اس عبرتناک زندگی اور عذاب سے نجات نہیں دلا سکتے آخر ایک دن ان کو اطلاع مل جاتی ہے کہ ان کی لڑکی کو شوہر اور ساس نندوں نے مٹی کا تیل ڈال کر جلا دیا یا زہر دے کر مار ڈالا، اور عین جوانی میں جو امنگوں اور تمناؤں کے خواب دیکھنے کا زمانہ تھا عبرتناک موت مر جاتی ہے، ابھی گذشتہ سال سرکاری طور پر رپورٹ دی گئی کہ اس سال چار ہزار دلہنیں جلائی گئیں حالانکہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ایک طرف اسلامی شریعت میں عورت کا مقام و مرتبہ ہے اور حقوق اختیارات اور اسلامی قوانین کی سہولتیں اس کو حاصل ہیں ایسے درندہ صفت شوہروں سے نجات کیلئے راستے ہیں دوسری طرف نجات کے سارے دروازے بند ہیں، کبھی پروفیسر صاحبہ نے دونوں سماج کی عورتوں کا تقابل کر کے جائزہ لیا کہ اسلام کا فیضان کرم عورتوں پر کتنا ہے؟ اگر اب تک نہیں کیا ہے تو اب سے اس پہلو پر ان کو غور کرنا ضروری ہے۔

مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں

یہ تو موجودہ دور کے حالات ہیں جب ہندوؤں میں تعلیم کا اوسط کافی بڑھ گیا ہے اور مذہب سے وابستگی کمزور پڑ گئی ہے ورنہ ان کا مذہبی قانون تو یہ کہتا ہے کہ اگر شوہر مر جائے تو اس کی چتا پر اس کی جوان خوبصورت اور جذبوں اور امنگوں سے بھری ہوئی دلہن کو رکھ کر زندہ جلا دو اور پھونک دو اس کا اب جینے کا حق ختم ہو گیا، وہ چیخے، تڑپے، چلائے اس پر کسی کو رحم کھانے کی ضرورت نہیں عورت کا ''ستی'' ہو جانا ہی اس کا دھرم ہے اگر ہندو قوم اپنے مذہبی اصولوں پر قائم رہتی تو روزانہ ہزاروں عورتیں شوہروں کی چتاؤں پر زندہ جلائی جاتیں یہ رسم تو مسلمانوں نے ان کی عورتوں پر رحم کھا کر اپنے دور حکمرانی میں قوت بازو سے ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دی۔

اس سماج میں عورتوں کے لئے عذاب کی ایک بھٹی اور بھی ہے اگر عورت کا شوہر

مر جائے اور وہ بیوہ ہو جائے تو اس کی عمر کتنی ہی کم کیوں نہ ہو وہ اب تا زندگی دوسری شادی نہیں کرسکتی، اس کو سماج میں انتہائی منحوس اور برا قدم سمجھا جاتا ہے، شادی بیاہ کی تقریبات میں اس کو شریک ہونے سے روک دیا جاتا ہے کہ اس کا منحوس سایہ دلہن بننے والی لڑکی پر نہ پڑ جائے، اگر بیوہ کی عمر اٹھارہ بیس سال ہے تو اس کی جنسی بھوک فطری ہے وہ بھوک کیسے مٹے؟ اس کا کوئی شریفانہ راستہ نہیں تجویز کیا گیا اس بھوک کی وجہ سے اس کو کیسی کیسی اذیتوں سے گذرنا پڑتا ہے اور کس طرح انگاروں پر لوٹ لوٹ کر اس کو راتیں بسر کرنی پڑتی ہیں اس درد و کرب کا اس کے معاشرہ کو کوئی احساس نہیں یا تو عاجز آ کر وہ خودکشی کرنے یا کوئی دوسری راہ اختیار کرلے جس میں سوائے ذلت و رسوائی کے اس کے حصہ میں اور کچھ نہیں ہوگا۔

کیا مصنفہ کو عورت کی اس مظلومیت کی خبر ہے؟ یا صرف ان کو اتنا ہی معلوم ہے کہ حدیث میں عورت کا ذکر اہانت سے کیا گیا ہے سماجیات کی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ مختلف ممالک میں عورتوں کی حیثیت اور ہر طرح کے سماج کا تقابلی مطالعہ کرتیں ہر ایک کے حسن و قبح کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر جو سچائی ان کے سامنے آتی پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتیں، تو ان کی رائے کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوتا، ناقص مطالعہ کے نتیجہ میں چند سطحی باتوں کا سہارا لینا ایک پروفیسر کے لئے قطعی زیبا نہیں یہ صورت حال تو غمازی کرتی ہے کہ ان کا علمی معیار بہت پست ہے ان کا مطالعہ عامیانہ اور سطحی ہے باتوں کی گہرائیوں تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے کیا یہ حیرتناک بات نہیں کہ ہمارے ملک کی ۸۵ فیصدی جس کی تعداد ۵۷ کروڑ سے کم نہیں اتنی بڑی آبادی میں کسی ایک ہندو عورت نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی، کوئی مضمون نہیں لکھا اور اپنے دھرم کی مذمت کرنے کی ہمت نہیں کی اور ایک مسلمان کہی جانے والی عورت اس بات پر کہ عورت کا ذکر اسلام میں اہانت سے ایک جگہ کیا گیا ہے، جو اس کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس نے پورے اسلامی نظام کو سمجھا نہیں اور اسلام کے خلاف ایک زہر آلود کتاب

لکھنے پر آمادہ ہو جائے۔

حضرت عمرؓ پر طعن و تشنیع:

عورتوں پر ظلم و جبر کے سلسلہ میں مصنفہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کئی جگہ لیا ہے اور ہر جگہ ان کو ایک ظالم و جابر انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور نسوانی فطرت کے مطابق سخت اور درشت الفاظ استعمال کئے ہیں اور ان کو آتشیں مزاج بتایا ہے، جب بھی وہ کوئی اپنا نقطہ بیان کرتی ہیں تو فوراً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامیات کا مطالعہ یا تو بالکل نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو بہت ہی عامیانہ، سطحی اور سرسری ہے، اگر انھوں نے صرف حضرت عمرؓ کا وہ خطبہ ہی پڑھ لیا ہوتا جو انھوں نے خلیفہ ہونے کے بعد دیا ہے تو حضرت عمرؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیت کو مورد طعن بنانے کی ان کو جرأت نہ ہوتی اس سے ان کو معلوم ہو جاتا کہ حضرت عمرؓ کی یہ سختی کہاں اور کیوں ہوتی تھی اور کہاں سے وہ فولادی انسان موم سے زیادہ نرم ہو جاتا تھا تو ان کی عظمت کا راز ان پر منکشف ہو جاتا۔

کسی قوم کی اصلاح نہ صرف نرم رویہ سے ہو سکتی ہے اور نہ صرف جبر و زیادتی سے، ہر موقعہ و محل کے لئے ہر مدبر انسان یہ طے کرتا ہے کہ یہاں نرمی کا وقت ہے اور نرم رویہ اختیار کرتا ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہاں سخت اور گرم رویہ کی ضرورت ہے تو اس کا لب و لہجہ گرم ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ کی شخصیت عرب جیسی اجڈ اور سخت مزاج قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں اسی اعتدال کو بروئے کار لانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کی بہت سی رایوں کی تائید وحی الٰہی نے بھی کر دی مثلاً عورتوں کا پردہ کرنا مقام ابراہیم کو مصلّی بنانا، غزوۂ بدر کے قیدیوں کے قتل کی رائے دینا[1] وغیرہ۔

باطل سے وہ کبھی سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے یہ ان کی فطرت اور مزاج کے خلاف تھا۔ وہ غلط کام اور کسی بھی برائی کے مقابلے میں مردِ آہن تھے اور ان کے لب و لہجہ میں

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۸۔

فولاد کی سختی آجاتی تھی، ایک معزز صحابی نے غلطی سے مکہ کے مشرکوں کو مسلمانوں کے کسی اقدام کی خبر دینے کی کوشش کی تھی اس اطلاع میں ان کی اپنی کوئی مصلحت تھی مگر وقت سے پہلے ان کا خط پکڑ لیا گیا جو انھوں نے مشرکین مکہ کو لکھا تھا وہ اپنی صفائی دینے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمرؓ نے گرم ہوکر کہا:

''دعنی یا رسول اللہ اضرب عنق ھذا المنافق[1].''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

یہ سختی کا موقعہ تھا مسلمانوں کی فوجی پیش قدمی کا راز دشمن کو معلوم ہو جائے تو مسلمانوں کی شکست یقینی ہو جائے، دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے بہت بڑا جرم تھا اس لئے حضرت عمرؓ کا یہی لب ولہجہ حالات کے مطابق تھا تاکہ آئندہ کسی کو اس طرح جرأت نہ ہو، لیکن یہی حضرت عمرؓ جب خلیفہ ہوگئے، رات میں مدینہ کی گلیوں میں پہرہ دے رہے ہیں تو سنا کہ ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آرہی ہے آپ نے بلند آواز سے گھر والوں کو متنبہ کیا کہ بچوں کو چپ کراؤ اور آگے بڑھ گئے اور پھر لوٹ کر آئے تو بچے اب بھی رو رہے تھے آپ نے رک کر پوچھا، بچے کیوں رو رہے ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ کئی وقتوں سے بچے بھوکے ہیں وہ بھوک کی شدت سے رو رہے ہیں آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے فوراً بیت المال آئے، آنے کے بعد ہی، کچھ چکنائی، کچھ سالن کا سامان لیا تو آپ کے غلام نے عرض کیا کہ میں پہنچا دوں؟ آپ نے کہا کہ آج تم میرا بوجھ اٹھا لوگے لیکن کل قیامت میں میرا بوجھ کیسے اٹھاؤ گے، سارا سامان میری پیٹھ پر لادو میں خود لے کر جاؤں گا، چنانچہ سارا سامان لے کر خلیفۂ وقت اس گھر پہنچ گئے عورت سے کہا تم آٹا گوندھو اور خود چولھا پھونکنے لگے جب کھانا تیار ہوگیا بچے شکم سیر ہوکر ہنسنے کھیلنے لگے تب آپ وہاں سے واپس آکر خدا سے رو رو کر اپنی کوتاہی اور غلطی کی معافی مانگنے لگے۔

ایک شب حسب معمول گشت پر تھے کہ ایک گلی میں کچھ دور پر ایک سایہ سا نظر

---

[1] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوۃ شریف ج۲ ص ۵۷۷۔

آیا، اپنے ساتھ کے آدمی سے کہا کہ جا کر دیکھو کون کھڑا ہے اور کیوں کھڑا ہے جب انھوں نے جا کر دیکھا تو وہ ایک عورت ہے اس سے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑے تلخ لہجہ میں اور غصہ سے بھری ہوئی آواز میں جواب دیا کہ تمہارے خلیفہ جو وہاں کھڑے ہیں جا کر ان سے پوچھو کہ ان کو کیا حق ہے کہ میرے شوہر کو سال بھر سے محاذ جنگ پر بھیج رکھا ہے، کیا مجھے ان کی ضرورت نہیں، حضرت عمر جیسا جاہ وجلال کا انسان جس کا نام سن کر دنیا کے بادشاہوں کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، انھوں نے گردن جھکا کر بات سنی اور واپس چلے آئے اور دوسرے ہی دن محاذ جنگ پر اطلاع دے کر اس کے شوہر کو مدینہ سے بلالیا[1]، اور کہا کہ تمہارے او پر تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے۔

اسی طرح ایک شب گشت پر تھے ایک گلی میں ایک گھر سے ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی، آپ نے سنا تو کوئی عورت فراق کے درد و کرب سے بیچین ہو کر اشعار پڑھ رہی تھی، دل تھرا گیا، صبح اس کے گھر کے بارے میں تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر بہت دنوں سے جہاد میں گیا ہوا ہے، آپ نے مختلف ذرائع سے تحقیق کرائی اور یہ پتہ چلایا کہ عورت بغیر شوہر کے کتنے دنوں تک رہ سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چھ ماہ ہے، آپ نے تمام عساکر اسلامیہ میں حکمنامہ بھیج دیا کہ کوئی مجاہد چھ ماہ سے زائد جہاد میں نہیں رہ سکتا اس کو اپنے اہل وعیال میں آنا ضروری ہے۔

یہ بے شمار واقعات میں سے صرف تین واقعات میں نے بطور مثال کے آپ کے سامنے پیش کیئے، آپ نے حضرت عمر کی سخت مزاجی کی شکایت کی تھی لیکن ان کی نرم مزاجی کے واقعات آپ کی نگاہوں سے نہیں گذرے یا آپ نے قصداً ان سے چشم پوشی کی؟ حضرت عمرؓ جیسے اولوالعزم اور عظیم المرتبت انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کے جیسا غیور حساس جری مدبر اور سیاست داں اور انسانوں کا مزاج شناس انسان دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گا اس لئے دنیا ان کو یاد کرنے پر مجبور ہے۔

---

[1] کتاب السنن سعید بن منصور متوفی ۲۲۷ھ ج ۲ ص ۱۸۵۔

مصنفہ نے عمرؓ کی سخت دلی کے ثبوت میں کہا تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے ام کلثوم کو نکاح کا پیغام دیا تو ام کلثوم نے جواب میں کہا کہ میں ایسے سخت مزاج انسان سے نکاح نہیں کر سکتی، اس واقعہ سے انھوں نے سمجھ لیا کہ حضرت عمر سخت مزاج تھے، ہر عورت شوہر کے انتخاب میں اپنا ایک خاص تصور رکھتی ہے اس تصور کے خلاف عظیم سے عظیم تر مرد کا پیغام نکاح آئے گا تو اس کو رد کر دے گی اور کوئی ایسا عذر کرے گی جو اس کے راز کی پردہ پوشی بھی کرے اور انکار بھی ہو جائے ام کلثوم نے بھی اگر اسی نقطۂ نگاہ سے انکار کیا ہو تو کیا تعجب ہے، اس واقعہ میں تو آپ کے سوچنے کی یہ بات تھی کہ ایک عورت نے حضرت عمر جیسے جاہ وجلال والے انسان کے پیغام کو نہایت شان بے اعتنائی سے رد کر دیا اور اس نے گردن جھکا کر سن لیا اور سر تسلیم خم کر دیا اس واقعہ سے اسلام میں عورت کی عظمت کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ ایک معمولی عورت ایک عظیم انسان مسلمان خلیفہ کو انکار کا دوٹوک جواب دیتی ہے اور عام مرد نہیں بلکہ اسلامی دنیا کا اور اسلامی تاریخ کی عظیم ترین شخصیت جس کے سامنے ہر کس وناکس کو لب کھولنے کی ہمت نہیں ہوسکتی ہے کیا یہاں آپ کو اسلام میں عورت کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا اور اپنے دعوے کو ٹوٹنے چٹخنے کی کوئی آواز نہیں سنائی دیتی؟ کیا عورت کی اسلام میں یہی اہانت ہے، اسلام آپ کو عورت دشمن مذہب نظر آتا ہے؟ مسلم معاشرہ کے اس واقعہ سے کیا آپ کی آنکھیں کھل سکتی ہیں؟ حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ جب آپ نے پڑھ لیا تو آپ کو یقین کر لینا چاہئے تھا کہ میرا دعویٰ غلط تھا اور میری کم علمی کا نتیجہ تھا، تیز وتند جملے استعمال کرنا بہت آسان ہے، حقائق ومعارف کی تلاش میں کوہ کنی بڑا صبر آزما کام ہے اور اسی کی آپ میں کمی ہے۔

پردے کا حکم عورت پر اسلام کا احسان ہے

اسلام میں عورت کے لئے پردے کا حکم دیا گیا ہے، ترقی پسند روشن خیال اور جدید تعلیم یافتہ خواتین اور نام نہاد مسلم دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو جدید تعلیم

سے آراستہ ہیں ان تمام کو سب سے زیادہ غصہ اسلام کے اسی حکم پر ہے، اسلام کو ایک دقیانوسی، فرسودہ اور زمانہ جہالت کا نمائندہ مذہب تصور کرتے ہیں حالانکہ تجربات ومشاہدات روزمرہ کے واقعات وحقائق ان کے خیالات کی تردید کے لئے صف بہ صف کھڑے ہیں، ترقی یافتہ یورپین ملکوں سے لے کر ایشیاء کے ترقی پذیر ممالک تک میں شائع ہونے والی جرائم کی رپورٹوں کو اگر انھوں نے سنجیدگی سے پڑھا ہوتا تو وہ تھک ہار کر اسلام میں پردے کا حکم کو عورت کی عظمت وشرافت، عفت وعصمت کی حفاظت وبقا کے لئے ایک نعمت تصور کرتے اور ان کو نسوانی دنیا پر اسلام کا ایک عظیم احسان تسلیم کرنا پڑتا، کیونکہ ان رپورٹوں میں جرائم کی جو تفصیل ملتی ہے ان میں پچاس فیصدی جرائم جنسیات سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

زر، زن، زمین کو فساد کی جڑ کہا گیا ہے، لیکن تجربات ومشاہدات کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جرائم صرف ''زن'' سے تعلق رکھتے ہیں، یہ تناسب وہاں کم ہوجاتا ہے جہاں عورت پردے کی پابند ہے، جس طرح ہر جانور اپنے موسم میں جنسی اعتبار سے پاگل ہوجاتا ہے انسان میں بھی یہ حیوانی جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے، عمر کے ایک مخصوص دور میں یہ جذبہ دیوانگی کی سرحدوں کو چھولیتا ہے اور جب اس جذبے کا تناؤ بڑھ جاتا ہے تو انسان بھی کچھ دیر کے لئے جنسی درندہ بن جاتا ہے اور وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو ننگ انسانیت ہے۔

آپ خود اپنے ملک میں دیکھ لیں کہ گرلس اسکولوں اور گرلس کالجوں کے باہر انتظامیہ کو پولیس متعین کرنی پڑتی ہے کہ جنسی بھیڑیوں سے لڑکیوں کی حفاظت کی جائے اور وہ محفوظ طور پر اپنے گھروں کو پہنچ جائیں لیکن اس کے باوجود کچھ واقعات ہو ہی جاتے ہیں، لڑکیوں میں بے حجابی کے ساتھ ساتھ ان کے چست اور نیم عریاں لباس نے اور قیامت مچا رکھی ہے، دوپٹہ ان سے کب کا رخصت ہو چکا اگر کہیں کہیں ہے تو گردن میں ٹائی بن کر رہ گیا ہے، ان کا لباس جسم کا تھرمامیٹر بن کر رہ گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ جسم کا درجہ حرارت کیا ہے؟ یہ بے حجابی اور نیم عریانیت آوارہ مزاج

نوجوانوں کو چیلنج کرتی ہے کہ ''آ بیل مجھے مار''

اغوا، قتل، زنا بالجبر جیسے جرائم کی کثرت میں سب سے بڑا دخل عورت کی بے حجابی کا ہے، بجلی کا ٹھنڈا اور گرم تار ہر جگہ ایک ساتھ رہتا ہے کارخانوں میں، فیکٹریوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، ریلوں میں، بسوں میں، کھیل تماشوں میں عورت اور مرد مخلوط رہتے ہیں، دونوں جسموں میں ہر لمحہ کرنٹ دوڑتا رہتا ہے، شاک لگتا رہتا ہے، جب تاب ضبط جواب دیدیتی ہے تو دونوں تار مل جاتے ہیں، بجلی پیدا ہوتی ہے اور پورا نظام عفت و عصمت جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

اسلام نے عورت اور مرد کے اختلاط کو حرام قرار دیا ہے حتیٰ کہ عورتوں کے زیب و زینت کا نظر آنا بھی جرم ہے اسی لئے ان کو حکم دیا گیا۔

قرن فی بیوتکن. تم اپنے گھروں میں رہو۔

لیکن کنیز و خادمہ بن کر نہیں بلکہ گھر کی ملکہ اور شاہزادی کی حیثیت سے، البتہ اس کے حدود حکومت متعین کر دیئے گئے ہیں اس کو اپنی حکومت کی سرحدوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں کیونکہ خطرات راہ میں اس کا انتظار کر رہے ہیں، اسلام ان کو ان خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہے۔

مسلمانوں کا ترقی پسند اور تہذیب جدید کا پرستار طبقہ عفت و عصمت کے اس قلعہ پر حملہ آور ہے اور اس کو ڈائنامیٹ کرنا چاہتا ہے اور اس حصار کو توڑ دینا چاہتا ہے جس میں عورت کی عزت و شرافت محفوظ ہے اور جنسی درندوں کی رسائی جہاں تک نہیں ہوسکتی، ان کے الفاظ و بیانات کتنے ہی دانشورانہ نظر آئیں لیکن حقیقت صرف یہی ہے کہ ان پر ''جنس'' سوار ہے بقول ڈاکٹر اقبال شاعروں کے اعصاب پر عورت سوار تھی لیکن یہ دانشور تو شاعروں کی سطح سے بھی نیچے نظر آتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد میں مساوات ہونی چاہئے لیکن مساوات کا معنی ان کے نزدیک وہ نہیں ہے جو لغت میں ہے بلکہ اس کا مفہوم وہ ہے جو ان کے ''جنس زدہ'' دماغ میں ہے کیونکہ جب وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم تھے تو ان کے

والدین نے اپنے ہی دیار کے گاؤں میں کسی لڑکی سے شادی کر دی تھی لیکن جب وہ تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی میں ریڈر اور پروفیسر ہوگئے تو گاؤں کی فضا میں پلی ہوئی عفت مآب اور پاکدامن بیوی ''اولڈ فیشن'' ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہوں سے گرگئی، انھوں نے یونیورسٹی کے پارکوں میں رنگین پروں کی تتلی تلاش کرلی جو ان کے پہلو بہ پہلو شاہراہ عام پر چل سکے اور ہر فنکشن اور ہر تقریب میں اپنے تام جھام کے ساتھ ساتھ دے سکے، بس اسی کو وہ مساوات کہتے ہیں، کیا گاؤں کی وہ مظلوم لڑکی عورت نہیں تھی؟ آخر وہاں مساوات کا مفہوم کیوں نہیں سمجھ میں آیا؟ وہ اپنے گاؤں میں درد و کرب کی زندگی گذار رہی ہے یا طلاق پا کر سماج میں بے قیمت ہو چکی ہے ظاہر ہے کہ اسلام اس مساوات سے انکار کرتا ہے اور قطعی انکار کرتا ہے۔

طلاق کا حق

مصنفہ جیسی روشن خیال خواتین اور ترقی پسند تعلیم یافتہ طبقہ جو مرد و زن میں مساوات کا مدعی ہے یہ سبھی طلاق کے مسئلہ کو نشانہ بناتے ہیں، ہندوستان میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اس مسئلہ کو خوب اُچھالتا ہے وہ کہتا ہے کہ طلاق عورت پر ظلم ہے یہ مردوں کی جابریت اور حاکمانہ برتری کا اظہار ہے جو سراسر ظالمانہ ہے، طلاق کے بعد عورت کی زندگی تباہیوں اور بربادیوں کا مرقع بن جاتی ہے، ان کا وہ طبقہ جو اخباروں سے وابستہ ہے یا ذرائع ابلاغ میں عمل دخل رکھتا ہے مسلمان عورت کی مظلومیت پر مگر مچھ کے آنسو بہاتا ہے، یاد رکھئے یہ آنسو مسلمان عورت کی مظلومیت پر نہیں بلکہ وہ اپنے سماج میں عورتوں پر ہونے والے بے پناہ مظالم کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے، مسلمان عورت طلاق کے بعد عدت گذرنے پر دوسری شادی کر لیتی ہے اور مطمئن زندگی گذارتی ہے اور سماج میں اس کی عزت وآبرو اپنی جگہ باقی رہتی ہے، ہندو سماج میں طلاق کا کوئی قانون ہی نہیں اس لئے کسی حال میں زوجین میں تفریق ممکن نہیں گویا جس طرح جانوروں کو فروخت کر دیا جاتا ہے شادی بھی اسی طرح کا ایک سودا ہے

آگ کے سات پھیروں کے بعد سودا تمام ہوجاتا ہے اور ایسی گرہ پڑ جاتی ہے کہ اس کا کھلنا ناممکن ہوجاتا ہے اب شوہر اور ساس ونند اس کے اوپر پیٹرول چھڑک کر پھونکدیں یا زہر دیکر مار ڈالیں لیکن لڑکی کے لئے اپنے ظالم وجابر شوہر سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے شوہر مر جائے تو اس کی بیوی کو شوہر کی چتا پر بٹھا کر آگ لگادو تاکہ تڑپ تڑپ کر اور پھڑک پھڑک کر مر جائے اور آگ میں نہ جھونک سکو تو اس کو زندگی بھر شادی مت کرنے دو چاہے گندگی وغلاظت کی جس خندق میں گر جائے، جن لوگوں کے سماج میں عورتوں کے بارے میں یہ خیالات ہوں وہ مسلمان مطلقہ عورت کی مظلومیت پر آنسو بہائیں اور اسلام اور مسلمانوں پر طنز وتعریض کریں؟ ہمارے گاؤں میں ایک مثل مشہور ہے ''سوپ تو سوپ چھلنی بھی ہنسے جس میں بہتر چھید'' شاید اسی موقعہ کے لئے ہے۔

طلاق کا حق مردوں کو ہے

مجبوری کی حالت میں اسلام نے رشتۂ ازدواج کو ختم کرنے کی گنجائش رکھی ہے یہ حق تہذیب وتمدن کے ساتھ جڑا ہوا ہے انسانیت جن جذبات کے ساتھ وجود پذیر ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ قانون نکاح میں یہ دفعہ بھی شامل کی جائے، باہمی توافق ناپید ہوجائے اختلاف مزاج وطبعیت مختلف نوع کے ذہنی رجحانات ومیلانات ایک دوسرے سے دوری پیدا کردیں اور تجربے کے بعد نباہ کی کوئی شکل باقی نہ رہے، ازدواجی زندگی دونوں کے لئے مصیبت بن جائے تو اسلام اجازت دیتا ہے کہ زوجین خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں پھر بھی یہ اجازت ناپسندیدگی کے ساتھ ہے کیونکہ اسلام رشتۂ ازدواج میں استحکام چاہتا ہے اسی لئے جب ہر طرح کی افہام وتفہیم کی کوشش کے بعد بھی یہ رشتہ کمزور ہی ہوتا چلا جائے تو مرد کو حق طلاق حاصل ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ابغض المباحات عندی الطلاق.

مباح چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ مجھے طلاق ہے۔

یعنی ہر کوشش جو رشتۂ نکاح کو باقی رکھنے کے لئے کی جائے وہ شریعت میں پسندیدہ ہے۔

طلاق کا حق صرف مردوں کو حاصل ہے عورتوں کو نہیں، یہی انسانیت کی صحیح مزاج شناسی ہے اگر اس کے برعکس کر دیا جائے یا دونوں کو یہ حق برابر دیدیا جائے تو یہ شیرازۂ تہذیب وتمدّن تار عنکبوت سے کہیں زیادہ کمزور ہوجائے گا ہر گھر ہر خاندان ہمہ وقت بنتا بگڑتا رہے گا، رشتۂ ازدواج میں استحکام آ ہی نہیں سکتا، اس لئے اسلام نے عورتوں کو حق طلاق نہیں دیا ہے کیونکہ فطری طور پر عورت میں انفعالی کیفیت زیادہ ہے ایک چھوٹی سی بات کا بہت بڑا اثر لیتی ہے وہ جلد مایوسیوں کا شکار ہوجاتی ہے اس میں زود رنجی کے علاوہ مآل اندیشی اور عاقبت بینی کی بھی بڑی حد تک مردوں کے مقابلہ میں کمی ہے اور پہلے ہی مرحلہ میں آخری قدم اٹھا لیتی ہے آپ اخبارات میں برابر پڑھتے ہیں کہ عورت گھریلو معاملات میں اختلاف کی وجہ سے دریا میں چھلانگ لگا کر کنویں میں ڈوب کر، ٹرین سے کٹ کر مرگئی جب کہ مردان حالات میں کبھی خودکشی نہیں کرتا، یہ عورت کی عجلت پسند اور زود رنجی اور اس سے تاثر کا نتیجہ ہے صرف ہندوستان میں آپ جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مردوں کے مقابلہ میں خودکشی کرنے والوں میں عورتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے بلکہ ۷۵ فیصدی عورتیں ہوتی ہیں۔

اس سچائی کے بعد اگر اس کو طلاق کا حق دیدیا جاتا ہے تو کوئی رشتۂ ازدواج پائیدار نہیں ہوسکتا مرد میں تحمل اور ضبط کا مادہ عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتا ہے وہ بہت سی ناخوشگوار باتوں کو جھیل لے جاتا ہے اور جب انتہائی مجبور ہوتا ہے تبھی وہ اپنا حق استعمال کرتا ہے۔

یورپین ممالک میں مرد وزن میں مساوات کے جوش میں عورتوں کی طلاق کا حق دے کر وہاں کے معاشرہ اور عائلی زندگی جو عدم استحکام آیا ہے آج وہ ایک لا علاج مرض بن چکا ہے، اسلام نے دونوں صنفوں کے اس فطری اختلاف کو مدنظر رکھا ہے اور

وہ صرف مرد کو طلاق کا حق دیتا ہے، پھر عورتوں کے لئے بھی علیحدگی کا راستہ بند نہیں رکھا گیا ہے، عورت اگر علحدگی کے لئے مجبور ہے تو اس کو خلع کا حق دیا گیا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی ہے اور شوہر کے مظالم سے نجات حاصل کر سکتی ہے، پھر بہت سے امور ایسے ہیں کہ عورت قاضی شرع کی عدالت میں دعویٰ کر کے نکاح فسخ کرا سکتی ہے، قاضی زوجین میں تفریق کرا دے گا اور بیوی کو شوہر سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

غرضیکہ طلاق اور خلع کا قانون فطرت انسانی کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں طلاق کی بہت ہی کم نوبت آتی ہے اسی لئے طلاق شدہ عورتوں کا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا بخلاف یورپ اور امریکہ کے جہاں عورتوں کو طلاق کا حق حاصل ہے وہاں بہت سی عدالتیں صرف طلاق کے مقدمات کی سماعت کرتی ہیں کیونکہ طلاق کے مقدمات دیوانی اور فوجداری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عدالتوں میں آتے ہیں، اس میں عورتوں کی طرف سے دائرہ کردہ مقدمات ۷۵ فیصدی ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں طلاق

پروفیسر صاحبہ جن ترقی یافتہ ممالک کی زرق برق عورتوں کی ظاہری زندگی کو دیکھ کر رشک کر رہی ہیں اور انھیں جیسی بن جانے کا جذبہ ان کے سینے میں کروٹیں لے رہا ہے کیونکہ وہاں عورت اور مرد کی مساوات کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے میں انھیں ترقی یافتہ ممالک کی خاندانی تصویر دکھانا چاہتا ہوں کہ وہاں کی عورتوں نے اپنے حق طلاق سے معاشرتی زندگی میں کیسی تباہی و بربادی پھیلائی ہے، اسلام نے ناخوشگوار ازدواجی تعلقات کو ختم کرنے کا جو راستہ تجویز کیا ہے وہ کتنا فطری، کتنا مناسب، کتنا متوازن ہے اور ترقی یافتہ ملکوں نے اسلام کے خلاف جو طریقہ کار اختیار کیا تو ان کا معاشرہ کتنا ابتر، کتنا غیر متوازن اور کتنا ذہنی سکون سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔

آج کل یورپ اور امریکا میں عورتوں کو طلاق حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ثابت کرتا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو پھیکے لگتے ہیں، یہ کتنا آسان

دعویٰ ہے اس کے لئے ثبوت وشہادت کی بھی چنداں ضرورت نہیں صرف عورت کا بیان ہی سب سے بڑا ثبوت ہے وہاں کی عورتیں تنوع پسند ہوگئی ہیں ایک ہی کھانا کھاتے کھاتے طبیعت اُوب جاتی ہے ایسی عورت آسانی کے ساتھ عدالت کو باور کرادیتی ہے کہ شوہر اس کی جنسی بھوک کو حسب خواہش نہیں مٹا پاتا ہے، عدالت عورت کے حق میں فیصلہ کردیتی ہے، مارک ٹوپ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جون کے مہینے میں پادریوں کی خوب چلتی ہے، وہ خوب شادیاں کراتے ہیں باقی گیارہ مہینے وکیلوں کی چلتی ہے طلاق کے مقدمہ میں[1]۔''

امریکہ کے ماہر سماجیات ڈاکٹر گوڈ نے امریکہ میں طلاق کے واقعات اور عدالتوں میں دائر طلاق کے مقدمات کا گہرا مطالعہ کرنے کی سات سال کی تحقیق وتفتیش کے بعد ۱۹۵۵ء میں اپنی کتاب شائع کی جس کے اہم نتائج حسب ذیل تھے۔

۱- امریکہ کے ہر چھ افراد میں ایک طلاق کے چکر میں الجھا ہوا ہے، پورے ملک میں تقریباً ایک کروڑ افراد طلاق کے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔

۲- طلاق کی صورت میں ختم ہونے والی یہ تمام شادیاں جلد بازی کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ ۷۰ فیصدی شادیاں ایسی تھیں جن میں دونوں فریق ایک دوسرے کو شادی کے ایک سال قبل سے ہر طرح جانچے اور پرکھے ہوئے تھے[2]۔

واشنگٹن کے محکمہ مردم شماری کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ:

۱۹۵۵ء میں امریکہ میں مطلقہ عورتوں کی تعداد ۱۱½ ساڑھے گیارہ لاکھ ہے ان میں سے دولاکھ ۲۶ ہزار ایسی ہیں جن کی شادیاں ایک سے زائد بار ہوچکی ہیں ان میں سے ¼ کی شادی دوبارہ ہوچکی ہے[3]۔

---

۱ آتم ہتیا اور داسنا کے اپرادھ'' مصنف پری پورنانند ص ۱۷۷، بحوالہ فریب تمدن۔

۲ انگریزی اخبار پانیر ۲۸/ جنوری ۱۹۵۶ء بحوالہ فریب تمدن۔

۳ فریب تمدن مرتبہ اکرام اللہ ایم اے لکھنؤ ص ۳۷۵ (نوٹ) ہم نے سارے حوالے اس کتاب میں فریب تمدن سے لئے ہیں جن کو اکرام اللہ ایم اے نے اردو نگریزی اخبارات اور سرکاری رپورٹوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ہر جگہ انھوں نے مکمل حوالہ دیئے ہیں اس لئے کتاب قابل اعتماد ہے۔ اسیر ادروی

یہ تو باضابطہ عدالتوں سے طلاق حاصل کرنے والوں کی تعداد ہے ۱۱ $\frac{1}{4}$ لاکھ عورتوں کے علاوہ بے شمار عورتیں ایسی ہیں جنھوں نے باضابطہ طلاق تو حاصل نہیں کیا ہے لیکن وہ شوہروں سے الگ آزادانہ زندگی گذار رہی ہیں ایک مصنف لکھتا ہے۔

> یہ تو باقاعدہ طلاق حاصل کرنے والی عورتوں کے اعداد وشمار ہیں ان کے علاوہ امریکہ میں کسی نہ کسی سبب سے سات لاکھ ۴۶ ہزار شادی شدہ مرد اور ۱۴ لاکھ عورتیں اپنے شوہروں سے الگ رہتی ہیں اور ۹ لاکھ ۴۳ ہزار مردوں کی داشتائیں الگ رہتی ہیں[۱]۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے معاشرتی امور کے ڈایریکٹر ہڈسن نے اپریل ۱۹۵۶ء میں امریکہ کے دو ہزار طلبہ اوران کے خاندانوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی ہے اس میں انھوں نے بتایا کہ:

> امریکی گھروں میں طلاق ایک عادت بنتی جارہی ہے، امریکہ میں طلاق کی شرح دنیا کے دوسروں ملکوں سے کہیں زیادہ ہے[۲]۔

ایک امریکی ماہر نفسیات نے اس بات پر اپنی تشویش ظاہر کی ہے کہ امریکہ میں طلاق کا شوق سن رسیدہ میاں بیوی میں بھی آگیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

> امریکہ میں ہر سال ۴۰ ہزار شادی شدہ جوڑے ایک نئے رفیقِ زندگی کے شوق میں طلاق لے لیتے ہیں، ان میں سے اکثر دادا، دادی ہوتے ہیں، امریکہ میں اب یہ رجحان عام پیدا ہوگیا ہے کہ ایک شوہر ایک ہی بیوی کے ساتھ ساری عمر کیوں گذارے یہ حد درجہ تنوع پسندی کا نتیجہ ہے[۳]۔

امریکہ کی اونس کاون سن یونیورسٹی میں شوشیالاجی کے ایک پروفیسر نے امریکہ میں طلاقوں کی بھرمار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> کیلوفورنیا اور نیویارک میں فسخ نکاح ایک روزمرہ کا معمول بن گیا ہے اور جب

۱۔ آتم ہتیا اور داسنا کے اپرادھ (پری پورنا نند) ص ۱۴۵، فریب تمدن ۳۷۶۔
۲۔ ہندوستان ٹائمس ۲۵/ اکتوبر ۱۹۶۰ء، فریب تمدن ص ۳۷۶۔
۳۔ ’’صدق‘‘، لکھنؤ مدیر ماجد دریا آبادی ۲۱/ ستمبر ۱۹۶۲ء بحوالہ مذکور۔

عورتیں بے تکلف آپس میں مل بیٹھتی ہیں تو ہر ایک کی زبان پر یہی سوال دوسری سے ہوتا ہے، کہو کب اپنے خصم سے نجات حاصل کروگی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ امریکہ میں ہر پانچ دولہنوں میں ایک دُلہن سُہاگ رات میں حاملہ ملتی ہے اور ہر ۴ اولادتوں میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک ولادت ناجائز ہوتی ہے[1]۔

انگلینڈ کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے جو امریکہ میں ہے وہاں مستند ذرائع سے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اس میں بتایا گیا ہے کہ:

۱۹۶۰ء میں سالانہ طلاقوں کا تناسب ۴۰ ہزار سے زیادہ ہے یعنی ہر سال اتنی عورتیں اپنے شوہروں سے طلاق حاصل کرلیتی ہیں، لندن پارلیمنٹ نے ایک رائل کمیشن طلاق کے سلسلہ میں مقرر کیا تھا اس کی تقرری کے وقت سرکاری طور پر کمیشن کو یہ معلومات فراہم کردی گئیں کہ برطانیہ کی نابالغ آبادی میں ہر دس منٹ پر ایک شادی ٹوٹتی ہے اور پچھلے سال ۳۰ ہزار طلاقیں واقع ہوئیں اور ۲۰ ہزار احکام تفریق زوجین کے جاری ہوئے[2]۔

ان بڑے ملکوں میں معاشرتی زندگی جتنی غیر مستحکم اور حق طلاق عورت کو حاصل ہونے سے جو صنفی آوارگی پھیلی ہوئی ہے اس کا ایک نظارہ آپ نے دیکھ لیا اب اسی سلسلہ میں یورپ کے بعض دوسرے نسبتاً چھوٹے ترقی یافتہ ملکوں کا بھی ایک منظر دیکھ لیں کہ طلاق کا حق پاکر عورتیں کتنے گھروں اور خاندانوں کا چین اور سکون لوٹ رہی ہیں اور گھریلو زندگی کتنی تباہیوں کا شکار ہے، انھیں ملکوں کی خواتین کی طرح ایشائی ملکوں کی جدید تعلیم یافتہ روشن خیال عورتیں زندگی بسر کرنے کا خواب سوتے جاگتے دیکھتی رہتی ہیں کیا یہ بھی وہی سب کچھ کرنا چاہتی ہیں جو تہذیب جدید کے نام پر یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے؟ یورپ کی کچھ ریاستوں میں طلاق کی جو صورت حال ہے وہ مختصر طور پر آپ کے سامنے پیش ہے۔

۱؎ ''صدق''، لکھنؤ ۱۵ر ستمبر ۱۹۶۷ء بحوالہ فریب تمدن ص ۳۳۸۔

۲؎ صدق لکھنؤ ۲۶ر فروری ۱۹۵۴ء فریب تمدن ص ۳۳۸۔

''بلغاریہ کے اخبار (RAB TNICES KESKEDELO) نے لکھا ہے کہ بلغاریہ کی ۸۰ لاکھ آبادی میں طلاقوں کا سالانہ اوسط ۱۶ ہزار ہے سب سے زیادہ طلاقیں تقریباً بدکاری کے سبب سے حاصل کی جاتی ہیں اور سب سے زیادہ طلاقیں شادی کے بعد ایک یا دو سال کے اندر ہوتی ہیں[1]۔

زیکوسلاویہ یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے وہاں ۱۹۶۵ء میں طلاقوں کا سالانہ اوسط ۱۸ ہزار سات سو دو ہے، خاص طور پر شہروں میں ہر تیسری شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے[2]۔

ہنگری میں ۱۹۶۵ء کے اعداد وشمار کے مطابق وہاں طلاقوں کا سالانہ اوسط بیس ہزار پانچ سو اٹھارہ ہے[3]۔

مغربی جرمنی میں طلاقوں کی کثرت اور ان کی طرف سے ایک لاکھ بیس ہزار طلاق کے واقعات کا تجربہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ نوجوانوں میں طلاق بہت زیادہ اور جلد ہونے لگی ہے ہر سال کم از کم سو شادی شدہ جوڑے شادی کے بعد فوراً ہی طلاق کے وکیل کے پاس جاتے ہیں ۱۰ فیصدی نوجوان تو اپنی شادی کا ایک سال بھی پورا نہیں کرتے ۴۰ فیصدی سے زیادہ شادیاں چھ سال کے اندر ٹوٹ جاتی ہیں[4]۔

ہنور کی ریاستی حکومت کی رپورٹ ہے کہ ۷۰ فیصدی سے زیادہ طلاقیں عورتیں حاصل کرتی ہیں بڑی حیرت کی بات ہے کہ ۲۰ سال سے کم عمر کی لڑکیاں کتنی جلدی شادی رشتہ ازدواج کو ختم کر دیتی ہیں[5]۔

یہ ان ترقی یافتہ اور تہذیب جدید سے آراستہ وپیراستہ ممالک کی رپورٹیں ہیں جہاں مرد اور عورت کی مساوات کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے اس لئے مردوں کے ساتھ

---

[1] نادرن انڈیا پتریکا ۳۰؍جولائی ۱۹۶۶ء۔

[2] ''ریڈینس''، ۷؍اگست ۱۹۶۶ء۔

[3] ''اخبار'' پانیر، ۷؍جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ فریب تمدن۔

[4] اسلام اور جنسیات مصنف بدر شکیب ص ۴۷ بحوالہ فریب تمدن۔

[5] فریب تمدن ص ۳۸۷۔

عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا گیا ہے اس غلط بخشی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں عدالتوں کے پاس طلاق کے اتنے مقدمات ہوگئے ہیں کہ اس کے لئے مستقل عدالتیں ہیں جو صرف طلاق کے مقدمات کی سماعت کرتی ہیں، حکومت کو کمیشن اور تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کرنی پڑتی ہیں ملک کے دوسرے اقتصادی معاشی اور انتظامی اور سیاسی اہم مسائل کے ساتھ خود طلاق بھی اس ملک کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے، ہر حکومت اس کو معیوب سمجھتی ہے اس کی تعداد کم کرنے کی تدبیریں سوچتی ہے لیکن جب تیر کمان سے نکل چکا مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی طلاق کا حق قانون نے دے دیا تو اب یہ ایسا عقدۂ لاینحل بن چکا ہے کہ کوئی ناخن گرہ کشا کام نہیں کرتا، اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات سے انکار کیا اور صرف مردوں کو طلاق کا حق دے کر یہ بتادیا کہ یہی انسانی فطرت کے مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں اکادکا کہیں طلاقیں ہوتی ہیں، یورپ نے عورت کو وہی حق دے کر عائلی زندگی کی تباہی کو خود دعوت دی ہے۔

طائرِ فکر کی پرواز کہاں تک ہے؟

اب تک مصنفہ کے جواب میں اصولی باتیں کہی گئی ہیں، ان کی پوری گفتگو صرف منفی پہلو لئے ہوئے ہے جو ان کے تخریبی ذہن کی غمازی کرتی ہے اور عورت کی فطرت کے مطابق صرف جلی کٹی سنانے تک محدود ہے، سنجیدہ علمی گفتگو اور تحقیقی مطالعہ کرنے والے ہمیشہ مثبت پہلو کی تلاش کرتے ہیں اعتراض تو بڑے سے بڑے اہل علم پر جاہل سے جاہل تر آدمی بھی کر لیتا ہے، علم و مطالعہ، تحقیق و جستجو کی معراج کمال یہ ہے کہ بات کے مثبت پہلو کو تلاش کر کے اس کے محاسن کو شمار کرایا جائے اور دلائل سے اس کی عظمت واہمیت اور تفوق و برتری کو ثابت کیا جائے، تبصرے کی روشنی میں میں نے یہی سمجھا ہے کہ پوری کتاب صرف اسلام اور اس کے قوانین اور اس کے مسلمات پر اعتراضات کی نیت سے لکھی گئی ہے اور کہیں بھی اس معاشرہ کی طرف اشارہ نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ جس میں عورت کو وہ اعزاز وافتخار حاصل ہے جس کی مصنفہ متمنی ہیں یا جس کا وہ خواب دیکھتی ہیں، دنیا میں ہر طرح کے معاشرے ہیں، ہر طرح کی تہذیبیں ہیں ان میں سے بہت سے معاشرے ایسے ہیں جس کا ہر فرد جدید تعلیم سے آراستہ ہے تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے ایک بڑے حلقہ کے لئے مثالی معاشرہ ہے جیسے انگلستان، امریکہ اور فرانس جہاں تہذیب جدید کا سورج نصف النہار پر ہے، وہاں سو فیصدی تعلیم ہے سائنسی علوم میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، چاند اور مریخ پر وہ کمنڈیں ڈال چکے ہیں فضاؤں پر بھی حکمرانی قائم ہو چکی ہے ان کے خلائی اسٹیشنوں پر فتح وظفر مندی اور ان کی سر بلندی کا پرچم لہرا رہا ہے، میڈیکل سائنس کے وہ امام کہے جاتے ہیں، انسانی جسم کی تخلیقی خصوصیات پر ان سے زیادہ واقف روئے زمین پر کوئی ملک نہیں ہے، وہاں عورت اور مرد کو سماج میں برابری کا درجہ دیا جا چکا ہے اور مکمل مساوات کا قانون نافذ ہے، وہاں کی سو فیصدی تعلیم یافتہ عورتوں میں سے کسی ایک کو بھی پروفیسر صاحبہ کی طرح اپنے معاشرتی قوانین سے کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ ان کے تصور سے کہیں زیادہ بلند ان کو مقام دیدیا گیا ہے ایشیائی ممالک کے لوگ جب یورپ وامریکہ اور فرانس میں تعلیم یا سیاحت کی غرض سے جاتے ہیں تو وہاں تہذیب جدید کی چمک دمک، آب وتاب اور زرق برق زندگی کی تابانیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، اور خود احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حسن وجمال، صحت وجوانی، تعلیم وشائستگی نے وہاں کی ہر عورت کو ''ملکہ نور جہاں'' بنا دیا ہے کہ اب اس سے زیادہ تفوق وبرتری کا خیال بھی ان کے ذہن وفکر میں نہیں آتا ہے ہندوستان پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والی خواتین ان کی زندگی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں، مجھے یقین ہے کہ کتاب کی مصنفہ پروفیسر فاطمہ مرنیسی بھی انھیں عورتوں میں شامل ہیں جو یورپین جیسی زندگی کا سنہرا خواب دیکھتی ہیں، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ وہاں کے معاشرتی زندگی کی پوری اور اصل تصویر ان کے سامنے پیش کردوں تا کہ

پوری بصیرت کے ساتھ وہ فیصلہ کرسکیں کہ ان ممالک کا معاشرہ عورت کے لئے نعمت وراحت، اعزار وافتخار، عزت وشرافت کا ذریعہ ہے یا ذلت خواری، بے عزتی و بے آبروئی اور پستی وحقارت کی خندق، وہاں کی عورت اپنے کردار کی روشنی میں فخر آدمیت ہے یا ننگ انسانیت؟

ترقی یافتہ ممالک کے معاشرہ کی جنت ارضی کی سیر کرنے سے پہلے حقائق کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے تبھی اس کی قدر وقیمت کا آپ کو صحیح اندازہ ہوسکے گا، ان ملکوں میں زنا معیوب نہیں، اس لئے کہ کسی لڑکی کا باعصمت اور پاکدامن رہنا مشکل ہوگیا ہے، عفت وعصمت جو عورت کی شخصیت کی سب سے بیش قیمت چیز اور سب سے قیمتی موتی ہوتا ہے ان ملکوں میں اس کی قدر وقیمت خزف ریزوں سے بھی کم ہے، لیکن ترقی یافتہ اور نام نہاد تہذیب یافتہ ان ملکوں کے طرز عمل سے انسانیت کے اس جوہر شرافت کی قیمت کم نہیں ہوسکتی کیونکہ جنسی انارکی اور صنفی آوارگی انسانیت کی بلند سطح سے اتار کر انسان کو حیوانیت کی پست ترین سطح پر پہنچا دیتی ہے ایک انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اب مصنفہ کو اس سمندر میں اتر کر دیکھنا چاہیئے کہ انکے ہاتھوں میں انکی تمناؤں کے مطابق موتی ہاتھ آتا ہے یا وہ خود لقمۂ نہنگ بن جاتی ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں عورت

جدید تعلیم یافتہ روشن خیال اور ترقی پسند خواتین کی نگاہوں میں انھیں ترقی یافتہ ملکوں کی خواتین کی زندگی ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور ان کے لئے قابل رشک ہے اور یہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ نیم عریاں لباس پہن کر شعر وشباب کا چھلکتا ہوا جام بن کر دعوت نظارہ دینا چاہتی ہیں وہ شب وروز یہی خواب دیکھتی رہتی ہیں اور خود مصنفہ کے دماغ میں بھی یہی خواتین ان کی آئیڈیل خواتین ہیں اس لئے میں ان کی زندگی پر پڑی ہوئی نقاب اٹھا کر ان کی اصلی صورت دکھانا چاہتا ہوں تاکہ ظاہری آب وتاب کو دیکھ کر جو ان کی نگاہیں الجھ کر رہ گئی ہیں وہ اندر کا بھی منظر اچھی طرح دیکھ

لیں اور پھر اس کے بعد فیصلہ کریں کہ ان کو کون سی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔

سب سے پہلے ہم امریکہ چلتے ہیں کیونکہ آج دنیا میں یہی واحد ملک سپر پاور بنا ہوا ہے اور تہذیب جدید کا سورج وہاں پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے، امریکہ کی ڈنور کی عدالت جرائم اطفال کے صدر جج بن لنڈ سے اپنی کتاب (REVOLTOFMODERNUOUIH) میں لکھتے ہیں:

''امریکہ میں ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فیصدی لڑکیاں اسکول چھوڑنے سے قبل خراب ہو چکی ہوتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے کہیں زیادہ ہے، لڑکیاں خود اس چیز کے لئے ان لڑکوں سے اصرار کرتی ہیں جن کے ساتھ وہ تفریحی مشاغل کے لئے جاتی ہیں، اور اس قسم کے ہیجانات کی طلب میں ان کی جسارت و بیباکی لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتی، اگرچہ زنانہ فطرت ان اقدامات پر فریب کاری کے پردے ڈال دیتی ہے، ہائی اسکول کا لڑکا بمقابلہ ہائی اسکول کی لڑکی کے اظہار جذبات کی شدت میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے، عموماً لڑکی ہی کسی طرح پیش قدمی کرتی ہے اور لڑکا اس کے اشاروں پر ناچتا ہے[۱]۔''

ایک دوسری رپورٹ امریکہ کے طلبہ کی کالج اور یونیورسٹی کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے، ان کی اخلاقی حالت کا عالم یہ ہے:

''ہر اتوار کو بالخصوص طالب علموں کو کسی غیر لڑکی کے ساتھ گذارنا طبیعت کی فرحت اور پڑھائی کی تکان کو کم کرنے کا بہترین ذریعہ اور عمدہ نسخہ سمجھا جاتا ہے، اسے یہاں (DATING) کہتے ہیں کسی بھی لڑکی کو ذرا بھی واقفیت کے ڈیٹنگ کے لئے مدعو کیا جا سکتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ ہفتہ کے ختم پر کسی لڑکی کو دعوت دیجاتی ہے جس میں ایک کھانا اس کے ساتھ کسی ہوٹل میں ایک پکچر کسی سنیما میں اور پھر موٹر میں پہلو بہ پہلو تفریح، بے غیرتی اس حد تک کہ سڑکوں پر چھیڑ چھاڑ بلکہ بوسہ بازی تک کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے[۲]۔''

---

۱ بحوالہ فریب تمدن (اکرام اللہ) ایم اے ص ۱۵۸

۲ ''صدق جدید'' لکھنؤ (ماجد دریا آبادی) ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء فریب تمدن ص ۱۶۰۔

پروفیسر سارنس اپنی کتاب LOVE 8 MARRIAGE میں غیر مبہم الفاظ میں اپنے قارئین کو بتاتے ہیں:

''جنسی آزادی'' نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کر دیا ہے شادی سے قبل کسی لڑکی کا باکرہ رہنا اب ممکن ہی نہیں، سوسائٹی میں خود اس چیز کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی، ورنہ پچھلے زمانہ میں ازدواج کے قبل کسی لڑکی کا بگڑنا ذلت وخواری کے مرادف تھا، لیکن آج کل دو چیزوں کی وجہ سے یعنی مانع حمل تدابیر کے پہنچنے میں سہولت حاصل ہونے اور سوسائٹی میں باکرہ پن کی اہمیت باقی نہ رہنے کی وجہ سے لڑکیوں کی بڑی اکثریت کے لئے اپنی مرضی اور سہولت کے لحاظ سے جنسی تجربات سے گذرنے کے مواقع حاصل ہو گئے اور آج سوسائٹی کے ہر طبقہ میں شادی کے قبل لڑکیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں جنسی مہم کی ماہر ہوتی جا رہی ہیں[1]۔''

ایک دوسرے مصنف جارج رائیلی اسکاٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''تاریخ عالم کے کسی دور میں آج سے پہلے معزز گھرانوں کی لڑکیوں کی اتنی کثیر تعداد جنسی خواہشات کی تسکین میں کبھی اتنی پیش پیش نہ تھی یہ صورت حال یورپ اور امریکہ کے ہر شہر میں موجود ہے جہاں لڑکیاں بہر وجوہ مردوں سے ازدواج کے بغیر اختلاط پیدا کرتی ہیں، یہ تمدن جدید کی دراصل فلاسفہ ہیں آج کل لڑکیاں اس وقت تک شادی کا خیال بھی نہیں کرتیں جب تک گلچھرے اڑا کر تھک نہیں جاتیں، پہلے زمانہ میں مرد اس مرض میں مبتلا تھے لیکن آج کل ہر لڑکی کی زبان پر اس کا چرچا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ پیدائش اولاد کے کام سے پہلوتہی کر کے تفنن طبع کی خاطر جنسی بے راہروی اختیار کی جائے، دوشیزگی یا بکارت کے قائم رکھنے کو فرسودہ خیالی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جدید لڑکی کا نظریہ تو یہ ہے کہ جب تک جوانی ہے عیش پرستی میں زندگی بسر کی جائے، اسی کی خاطر

---

[1] اسلام اور جنسیات (بدر شکیب) ص ۸۸، فریب تمدن ص ۱۵۲۔

رقص و سرور کی محفلوں، شب خانوں، رسٹورانوں اور شراب خانوں کی تفریح کی جاتی ہے، بہ الفاظ دیگر جدید عورت اپنے آپ کو ایسے حالات اور ماحول میں پیش کرتی ہے جہاں جنسی میلانات کے اُبھرنے کے مواقع ملتے ہیں اور اس کا ناگریز نتیجہ اختلاط جنسی کی صورت اور اس کی چاٹ میں ظہور پذیر ہوتا ہے[۱]۔''

ایک دوسرے مغربی مورخ ایگن فریڈل اپنی معرکتہ الآرا تاریخی تصنیف (CULRURALFHISRARY QF MODRFN AGE) میں رقمطراز ہیں:

''شوہر یا بیوی کا ایک دوسرے سے وفادار رہنا ایک مضحکہ خیز چیز تصور کی جاتی ہے، جس عورت کے عاشق نہ ہو اس کو نیک چلن نہیں بلکہ گنوار غیر دلچسپ اور بدوضع سمجھا جاتا ہے کہ اس کو اب تک کوئی چاہنے والا نہیں ملا[۲]۔''

اب انگلینڈ کے بارے میں کچھ باتیں، لندن تہذیب جدید کا آئینہ ہے اس آئینہ میں پورے انگلینڈ میں تہذیب جدید نے جو گل کاریاں کی ہیں ان سب کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے اس لئے میں صرف لندن کے بارے میں ایک دو رپورٹوں کا ذکر کروں گا، انگلستان کی ایک مشہور مصنفہ مس مارگانتا لاسکی نے بن بیاہی ماؤں اور ان کے بچوں کی نویں کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''انگلستان میں تقریباً ۷۰ فیصدی لڑکیاں شادی سے قبل ہی اپنے دوستوں سے جنسی تعلقات قائم کرلیتی ہیں، انگلستان میں ۳۳ فیصدی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی حاملہ ہو جاتی ہیں[۳]۔''

لندن کے ایک سوشل ورکر نے اپنی مطالعاتی رپورٹ میں صنفی آوارگی اور جنسی انارکی کا ذکر کرتے ہوئے انکشاف کیا:

''اسکول میں آج کل چودہ برس کے لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر مانع حمل اشیاء اپنے اپنے بیگ میں لئے پھرتے ہیں، نہ جانے کب کہاں ضرورت پڑ جائے

---

۱ اسلام اور جنسیات (بدر شکیب) ص ۸۹، فریب تمدن ص ۱۵۳۔
۲ حوالہ مذکور۔
۳ صدق جدید لکھنؤ ۱۶ ردسمبر ۱۹۶۰ء بحوالہ فریب وتمدن ص ۱۸۷۔

اس معاملہ میں وہ اپنے ماں باپ سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں[1]۔"

ایک سیاح نے لندن میں کچھ دن گذارے اور وہاں کے مشہور ہائڈ پارک میں جو حیا سوز نظارے دیکھے اس کی تصویر کشی کرتا ہے:

"یہاں جوانی سڑ گل رہی ہے، ہائڈ پارک میں درختوں کے نیچے لڑکے اور لڑکیاں ہمیشہ بوس و کنار اور دیگر جنسی حرکتیں کرتے نظر آتے ہیں فحش حرکتیں کرتے رہتے ہیں ٹرینوں اور بسوں اور سینما ہالوں میں سبھوں کے سامنے فحش حرکتیں کرتے رہتے ہیں یورپ میں کسی اور جگہ برسر عام ایسی فحاشی نظر نہیں آتی حتی کہ پیرس میں بھی نہیں[2]۔"

فرانس کے مشہور شہر پیرس کو اپنی خصوصیات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے، وہاں کے بہار آفریں ماحول وہاں کی سوسائٹی جاذب قلب و نظر، تہذیب و شائستگی کے لئے ضرب المثل بن چکا ہے میں فرانس میں صنفی آوارگی سے متعلق صرف ایک مصنف کی تحریر پیش کر رہا ہوں جو وہاں کی عورتوں کی زندگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، فرانس کے مشہور و معروف ماہر عمرانیات بال بیورو اپنی کتاب TOWARDS MOAL BANKRUPTCY میں اپنے ملک میں پھیلے ہوئے اخلاقی انحطاط کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

"نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ فرانس کے قصبات و دیہات تک میں اب نوجوان مرد اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب ہم پاکدامن نہیں ہیں تو ہمیں اپنی بیویوں سے بھی عفت و پاکدامنی کا مطالبہ کرنے اور یہ چاہنے کا کہ وہ ہمیں کنواری ملے کوئی حق نہیں ہے، برگنڈی، بون اور دوسرے علاقوں میں اب یہ عام بات ہے کہ ایک لڑکی شادی سے پہلے کئی دوستیاں کر چکی ہوتی ہے اور شادی کے وقت اسے اپنے منگیتر سے اپنی گذشتہ زندگی کے حالات چھپانے کی

---

[1] صدق جدید لکھنؤ (ماجد دریا آبادی) ۶ رجنوری ۱۹۵۶ء بحوالہ فریب تمدن ص ۱۸۲۔

[2] صدق جدید لکھنؤ ۲۴ رنومبر ۱۹۶۱ء بحوالہ فریب تمدن ص ۱۸۹۔

کوئی ضرورت نہیں ہوتی لڑکی کے قریب ترین رشتہ داروں میں بھی اس کی بد چلنی پر کسی قسم کی ناپسندیدگی نہیں پائی جاتی وہ اس کی دوستیوں کا ذکر آپس میں اس طرح بے تکلفی سے کرتے ہیں گویا کسی کھیل یا روزگار کا ذکر ہے اور شادی کے وقت دولہا صاحب جو اپنی دلہن کی سابقہ زندگی سے ہی نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور چاہنے والوں تک سے واقف ہوتے ہیں جواب تک اس کے جسم سے لُطف اٹھاتے رہے ہیں اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا شبہ تک نہ ہو جائے کہ انھیں اپنی دولہن کے ان مشاغل پر کسی درجہ میں بھی کوئی اعتراض ہے۔

سیکڑوں رپورٹوں، یادداشتوں، اخباری خبروں، سروے ومطالعاتی وتحقیقاتی بیانات میں سے میں نے یہ چند سچائیاں آپ کے سامنے رکھی ہیں، ورنہ اس موضوع پر تو انگریزی اردو میں ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

حیرتناک بات یہ ہے

یورپ وامریکہ وغیرہ میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات قائم کردی گئی ہے اس کا نتیجہ وہی ہے جس کے کچھ مناظر ابھی آپ نے دیکھے ہیں، اسی مساوات کے نتیجے میں عورتوں کو جو آزادی ملی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے انسان کو انسانیت کی باوقار سطح سے اتار کر حیوانیت کی ذلیل ترین سطح پر بٹھا دیا ہے بھلائی برائی کی تمیز اٹھائی جا چکی، ذلت وشرافت کے معنی بدل دیئے ہیں، عفت وعصمت، پاکدامنی اور بدکاری وفحاشی کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، رسوائی بے عزتی اور بے آبروئی کے الفاظ لغت سے کھرچ کر پھینک دیئے ہیں عزت وشرافت کا مفہوم تبدیل کردیا گیا ہے اب اس کے نتائج اتنے ہولناک ہو چکے ہیں کہ وہاں کے مدبرین صورت حال کو بدلنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی کچھ بعید نہیں کہ کچھ دنوں بعد ان ممالک میں مزدک کے نظریہ اباحیت مطلقہ کا نفاذ ہو جائے ہر عورت ہر مرد کے لئے، عورت بازار کا سودا بن کر رہ گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہ حیرتناک بات ہے کہ وہاں کی تہذیب وہاں کے تمدن وہاں کی خواتین کی آزادانہ زندگی کو ہمارے ملک کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والی خواتین اور لڑکیاں پانے کے لئے پاگل ہوئی جارہی ہیں، اور وہاں کی خواتین پر رشک کرتی ہیں، اور اس زندگی کو اپنانے کے سنہرے خواب دیکھتی رہتی ہیں، اس سلسلہ میں اپنے خاندان سے بغاوت کرتی ہیں اپنے معاشرے کو ٹھوکر مارتی ہیں اور جب کامیاب نہیں ہوتیں تو سارا غصہ مسلمانوں کے مذہبی قوانین پر اتارتی ہیں، حدیث وقرآن میں کیڑے نکالتی ہیں، خدا ورسول کے بارے میں گستاخانہ کلمات استعمال کرنے کی جرأت وجسارت کرتی ہیں، ایسی ہی خواتین کے لئے میں نے یہ آئینہ ان کے سامنے رکھ دیا ہے تاکہ اس آئینہ میں تہذیب جدید کی اصل تصویر دیکھ سکیں اور خود موازنہ کرلیں کہ اسلام نے عورت کو جو مقام ومرتبہ، اعزاز وافتخار دیا ہے، جو پاکیزہ معاشرہ بنایا ہے اس میں زندگی بہتر ہے یا اس ماحول میں جینا پسند کرتی ہیں جہاں ان کی چادر عفت وعصمت کو چاک کرنے کے لئے جنسی درندے پنجہ کھولے ہوئے ہیں، جس گندگی میں ہاتھ ڈالنا مرے ذہن ومزاج اور افتاد طبع کے خلاف تھا بہکی ہوئی خواتین کو صحیح راہ دکھانے کے لئے اس ساری گندگی کو دل پر جبر کرکے مجھے کریدنا پڑا۔

مصنفہ سے ایک سوال

اب ''عورت اور اسلام'' کی مصنفہ فاطمہ مرنیسی سے میرا سوال ہے کہ میں نے ہندوستان سے لے کر انگلینڈ، فرانس اور امریکہ تک کے معاشرہ کے مناظر آپ کو دکھا دیئے آپ ان میں سے کون سا معاشرہ پسند کرتی ہیں اور کس معاشرہ میں ایک عورت ہوتے ہوئے سکون وراحت، عزت وشرافت اور اعزاز وافتخار کی آپ کو اُمید ہے اور اس کو پسند کرتی ہیں؟ ہندوستان پاکستان اور اسلامی ممالک کے معاشرے میں عورت کو جو عظمت واحترام اور عزت حاصل ہے وہ آپ کے دل کو پسند نہیں تو کیا آپ یورپ وامریکہ کی ان خواتین کی صفوں میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں؟ جن کی پوری

تصویر ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے تو پھر آپ کو اختیار ہے قد تبیّن الرشد من الغی ، رشد و ہدایت اور ضلالت و گمراہی دونوں کی راہیں الگ الگ اور صاف صاف واضح ہوگئی ہے۔

اور اگر نہیں تو آخر روئے زمین پر کوئی ملک، کوئی بھی قوم تو ایسی ہوگی جس کا معاشرہ آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوگا اور آپ اس خطہ ارضی کی خواتین کی زندگی کو اپنے لئے پسند کرتی ہوں گی میں نے ہندوستان سے لے کر یورپ و امریکہ تک کے مہذب ترین ملکوں کی خواتین کی پس پردہ زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے اگر آپ تقابلی مطالعہ کی صلاحیت رکھتی ہیں تو اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرہ میں عورت کو جو مقام دیا گیا ہے آپ کو ان میں سے کسی نہ کسی کو منتخب کرنا ہوگا، مگر انسانی مجد و شرف، عزت و حرمت، شرافت و عزت نفس، غیرت و خودداری، سماجی عزت و احترام، نفاست و پاکیزگی اخلاقی اقدار کو پیش نظر رکھ کر انتخاب کرنا ہوگا۔

اور اگر دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں عورت کو صحیح مقام دیا گیا ہو اور ابھی دنیا میں وہ معاشرہ ہی وجود میں نہیں آیا اور اس کے لئے آپ جدو جہد کر رہی ہیں تو یہ دیوانے کا خواب ہے، شیخ چلی کی کہانی ہے، چراغ علاء الدین آپ کو کہیں سے نہیں مل سکتا، کھل جا سم سم بند ہو جا سم سم کا جادو آپ کے خواب کو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں کرے گا، یہ دنیا حقائق اور تجربات و مشاہدات کے تسلسل کا نام ہے لیکن جو سچائی ہے وہ ہمیشہ سچائی بن کر رہی، اسلام چودہ سو برسوں سے ساری علمی دنیا کے سامنے چیلنج بنا ہوا موجود ہے، اس کے اصول و قوانین اور حقائق قرآنی کے خلاف بار بار مورچہ بندی کی گئی، لیکن ہر بار مخالف طاقتوں کو شکست سے دو چار ہونا پڑا اور اس کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ ہمیشہ چمکتا رہا، تہذیب جدید کی بالا دستی نے سو سال سے اسلام کے اصول و قوانین کے خلاف حصار بندی کر رکھی تھی لیکن اس قلعہ کی بھی دیواریں جگہ جگہ سے شکستہ ہو رہی ہیں اور ان کو اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ ہم نے عورت کے معاملہ میں بھی ٹھوکر کھائی، مرد اور عورت کی مساوات ایک بھیانک غلطی تھی جس کا خمیازہ ہم کو

بھٹکنا پڑ رہا ہے، میری آپ سے بھی نہایت ادب سے گذارش ہے کہ آپ اسلامی اصول وقوانین اور اس کے بنائے ہوئے پاکیزہ معاشرہ پر صدق دل سے غور کریں، صداقت آپ کے سامنے آ کر رہے گی۔

یورپین ممالک میں عورتوں کی جس زندگی کو آپ رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں یہ فریب نظر ہے وہاں کی خواتین جنسی انارکی کی دلدل میں گردن تک ڈوب چکی ہیں اس لئے وہ ننگ انسانیت بن چکی ہیں۔ ان کا ظاہر جتنا صاف وشفاف نظر آتا ہے ان کا باطن اتنا ہی گندا، گھناؤنا اور قابل نفرت ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں عورت اس ذلت بھری اور بے آبروئی کی زندگی میں کبھی گرفتار نہیں ہوئی، عورت کی عفت وعصمت ایک گوہر بے بہا ہے اس کو لُٹا کر عورت نے نہ کبھی عزت پائی ہے اور نہ پا سکتی ہے۔

آپ عورت اور مرد کی مساوات کی بات کرتی ہیں اور الزام لگاتی ہیں کہ اسلام کا دامن اس بیش قیمت اصول سے خالی ہے، یہ مطالعہ کی خامی کا نتیجہ ہے اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ ایک بالکل فطری ہے، اسلام میں دونوں صنفوں کی مزاجی وتخلیقی خصوصیات، طبعی میلانات فطری رجحانات کو پیش نظر رکھ کر ایک خاص طرح کی مساوات قائم کی گئی ہے جو دونوں صنفوں کی شایان شان ہے، دونوں کے حقوق، دونوں کے فرائض، دونوں کے اختیارات وامتیازات کے متعلق قرآن میں بہت واضح احکام ہیں حسن معاشرت کے سلسلہ میں احادیث کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے بس سنجیدگی اور صدق دلی کے ساتھ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

''عورت اور مرد'' کے مسئلہ خاص پر گفتگو کرتے ہوئے مذہب کو نظر انداز کرنا سب سے بڑی غلطی ہے، مذہب انسانی معاشرہ کی پاکیزگی وطہارت میں سب سے اہم رول ادا کرتا ہے اس لئے اس مسئلہ پر بحث کرنے والے کو مذہب کی افادیت وضرورت پر پہلے ایمان رکھنا ضروری ہے۔

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم اور بے حجابی ساری بیماریوں کی جڑ ہے، عورتوں اور مردوں کے مخلوط اجتماعات بے حجابانہ ایک

دوسرے سے ملنا، اسکولوں میں کالجوں میں، دفتروں میں، ٹرینوں اور بسوں میں، کارخانوں اور فیکٹریوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھنا، بجلی کے ایک ایسے تار کو چھونا ہے جس میں ہمہ وقت کرنٹ دوڑتا رہتا ہے اب ترقی یافتہ ممالک بھی تھک ہار کر اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں جسکی اسلام نے ہمیشہ دعوت دی ہے۔

میں آخر میں ایک ایسی ہی رپورٹ پیش کر کے اپنا سلسلۂ کلام ختم کردوں گا جس میں یورپ کی جنسی انارکی اور صنفی آوارگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور غائر تحقیق ومطالعہ اور تجربات ومشاہدات کی روشنی میں اس کے اسباب ووجوہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور حیرتناک بات یہ ہے کہ جس خدا کو یورپ نے دیس نکالا دیا تھا وہ یاد آرہا ہے اور مذہب سے بے تعلقی پر ماتم کیا گیا ہے ع

جب ستایا ہے بتوں نے تو خدا یاد آیا

لندن سے ایک مکتوب نگار نے اپنے اخبار کو لکھا کہ:

''اس ملک میں کم وبیش ہر نوجوان خاتون خوش وقتی کی قائل ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق اس ملک میں ہر آٹھ میں سے ایک دولہن شادی سے پہلے حاملہ ہوتی ہے اور ہر آٹھویں سے ایک بچہ اپنے ماں باپ کی شادی سے پہلے پیدا ہوتا ہے باپ کا صرف اتنا قصور ہوتا ہے کہ اس غریب نے عین وقت پر پھنس کر شادی کرلی، ۲۱ سال سے کم عمر کی دولہنوں میں حاملہ دولہنوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے ان کے مقابلے میں ہر پانچ میں سے ایک شادی سے پہلے حاملہ ہوتی ہے، طلاق کی بھرمار اور شادی شدہ زندگی میں بے راہ روی کے اسباب بظاہر یہ نظر آتے ہیں۔

۱- عورتوں اور مردوں میں غلط قسم کی مساوات۔

۲- مالی لحاظ سے عورتوں کی مردوں کی غلامی سے نجات۔

۳- دفاتر فیکٹریوں کارخانوں، اسٹوروں، ریلوں، بسوں میں مرد اور عورت کا مخلوط کام۔

۴- مذہب سے بتدریج دوری اور بیگانگی (فریب تمدن ص۳۸۲، صدق لکھنؤ ۱۳ / جون ۱۹۵۸ء) میں نے اپنی اور اپنے مذہب اسلام کی بات بتادی یورپ کے دانشوروں کے اعتراف شکست کا اعلان آپ کے سامنے پیش کردیا، کیا یہ حقائق آپ کو صرط مستقیم دکھانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔''

فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ.

مسلمانوں کا مسیحا

سرسید ۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کے قلعہ کا ایک ایک کنگرہ گرتا جارہا تھا، قلعہ کی فصیلیں اپنی جگہ سے سرک رہی تھیں اور ایک اجنبی طاقت کی مسلسل یلغاروں سے ٹوٹتی جارہی تھیں پورا ہندوستان ایسٹ ایڈیا کمپنی کے عقابوں کے آہنی پنجوں میں سہمے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا، اس کی قوت پرواز اس سے سلب کی جاچکی تھی، اس کے جسم کا لہو بوند بوند کر کے چوسا جارہا تھا، بس ابھی تک اس کی گردن مروڑی نہیں گئی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفید فام سپاہیوں نے ۱۷۹۶ء میں میسور کے سلطان ٹیپو کو جس دن شکست دی اسی دن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی ایک مضبوط بنیاد پڑگئی، انھوں نے اپنی سوداگری کے زمانہ میں یہ تجربہ کیا تھا کہ ہندوستان میں عام اشیاء کی طرح انسانوں کا ضمیر اور ایمان بھی بکتا ہے اور خریدا جاسکتا ہے، انھوں نے اس کا تجربہ میسور اور بنگال میں کیا اور کامیاب ثابت ہوئے۔

میسور میں میر صادق، میر قاسم، میر غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین اور پورنیا مل گئے جنھوں نے حکومت میں ذمہ دارانہ عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی مادر وطن اور اپنے مثالی حکمراں سلطان ٹیپو سے غداری کی، اپنا ایمان اپنا ضمیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں کے ہاتھوں میں بیچ دیا، دوسری طرف بنگال میں ایک بدنام زمانہ غدار میر جعفر دریافت

ہوا اور اس کو آلۂ کار بنا کر سراج الدولہ کے سینہ میں خنجر بھونک دیا، اس طرح کی غداری اور انگریزوں سے بے لچک وفاداری کو غیرت مند مسلمان کس نگاہ سے دیکھ رہا تھے، اس کی ترجمانی ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں کردی، جو آج ضرب المثل ہے ؎

جعفر از بنگال وصادق از دکن ❁ ننگِ ایماں، ننگِ دیں، ننگِ وطن

جنوب میں سب سے مضبوط بلکہ آہنی شخصیت نواب حیدر علی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی تھی۔ سلطان ٹیپو نے مسلسل خونریز جنگوں میں انگریزوں کو شکست فاش دی اور ایک بار تو اس نے ساحل سمندر تک ان کو کھدیڑ دیا تھا ان کے افسران نے جہازوں میں پناہ لی تھی، ان کے مشہور جرنلوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا تھا، ان کی طاقت کو جنوب میں اس نے تہس نہس اور پارہ پارہ کر دیا تھا، ان کی فوجوں پر مایوسی طاری تھی۔

جب انگریزوں نے دیکھا کہ سلطان ٹیپو کو میدانِ جنگ میں شکست دینا ممکن نہیں تو انھوں نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھایا کہ ہندوستان میں انسانوں کا ایمان اور ضمیر بھی خریدا جا سکتا ہے اور پھر انھوں نے اسی پہلو پر سرگرمی سے کام شروع کر دیا، میر صادق جو سلطان ٹیپو کا وزیر اعظم تھا اس سے انگریزوں نے سازباز کی، پھر اس کے بہت سے فوجی افسران کو اپنے آقا سے غداری پر آمادہ کرلیا اور پھر میدان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں رہا اور مئی ۱۷۹۹ء میں غداروں کی سازش سے خاص دارالسلطنت میں سلطان ٹیپو بے یار و مددگار رہ گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیڑیوں نے اس کو بیدردی سے قلعہ کے اندر ذبح کر دیا۔

فتوحات کا سیلاب

سلطان ٹیپو پر فتح حاصل کر کے انگریزوں نے اس آہنی پھاٹک کو توڑ دیا جو ہندوستان پر قبضہ کرنے کی راہ میں حائل تھا جیسا کہ کمپنی کے مقبوضات کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔

میسور کی فتح کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں مضافات میسور میں کڑپہ، کرنول، بلاری، اننت پور، تنجاور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، دوسرے سال ۱۸۰۱ء میں کرناٹک کے نواب کو جس نے انگریزوں کی مدد سے حکومت پائی تھی نکال کر مدراس بھیج دیا اور خود کرناٹک پر قبضہ کرلیا، اسی سال صوبجات اودھ کمپنی کے قبضہ واختیار میں آگئے، دوسرے ہی سال ۱۸۰۲ء میں مرہٹی سلطنت جواب تک نا قابل تسخیر مانی جارہی تھی اس کا انگریزوں نے خاتمہ کردیا، دربار پونا میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا تھا، اسی سال بڑودہ اور گجرات کو بھی انگریزوں نے اپنے شکنجہ میں لے لیا اور اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں حیدرآباد ایک بے بس کبوتر کی طرح انگریزی باز کے چنگلوں میں پھڑ پھڑانے لگا، نواب حیدرآباد انگریزوں کا باجگذار بن گیا، اسی سال ناگپور پر قبضہ کرکے کمپنی نے انگریز مشیر کار وہاں مسلط کردیا، یہ سال کمپنی کی فتوحات کا سنہرا سال بن گیا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سال بندیل کھنڈ، آگرہ، دہلی، جے پور، جودھپور اور گوالیار پر انگریز حکمران ہوگئے، ۱۸۱۳ء میں مراشش پر قبضہ ہوا اور اسی سال نیپال کو اپنے اختیار میں لے کر وہاں ریزیڈنٹ مقرر کردیا گیا ۱۸۱۷ء میں پہاڑی ریاستوں میں شملہ، مسوری، نینی تال، لنڈھوری بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگئیں، اسی سال ناگپور سے ریزیڈنٹ کو واپس بلالیا گیا اور براہ راست اس کو اپنے اختیار میں لے لیا گیا، اب انگریزوں کی طاقت نا قابل شکست بن چکی تھی، سمجھوتہ کی پالیسی ترک کرکے اپنی قوت کا بھرپور مظاہر کیا جانے لگا اور جہاں بھی ضرورت سمجھی گئی وہاں کے ریزیڈنٹ کو بلالیا گیا اور براہ راست اس کو اپنی حکومت کے ماتحت کرلیا ۱۸۱۸ء میں بھی یہی کیا گیا، پونا کے پیشوا کو معزول کرکے ملک پر قبضہ کرلیا گیا اور ۱۸۱۹ء میں حدود ہند کے آخری کنارے پر آسام اور برما پر بھی فتح حاصل کرکے ان مقامات پر اپنے ریزیڈنٹ مقرر کردیئے گئے اس طرح انگریز باری باری کرکے پورے ملک پر قابض ہوگئے، صرف دہلی کے لال قلعہ میں مغلیہ سلطنت کا آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر بے دست و پا تخت حکومت پر تھا، لال قلعہ میں کئی انگریز

مشیر کار مقرر تھے جن کی مرضی کے بغیر بادشاہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سر سید پردۂ عدم سے عالم وجود میں آئے، ہر انسان کی نشو ونما کا جو ماحول ہوتا ہے، اس کے گردو پیش جو حالات ہوتے ہیں ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، اس کا ذہن ومزاج اسی طرح افکار وخیالات کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے جو اس کے گردو پیش اور ماحول کا تقاضا ہوتا ہے، اس انقلاب نے ہندوستانی معاشرے کو تہ وبالا کردیا تھا ہر شخص کو بالخصوص مسلمانوں کے متوسط طبقہ کے ہر فرد کو اپنا مستقبل سخت تاریک نظر آرہا تھا، سر سید بھی انھیں لوگوں میں سے تھے اس لئے وہ اس سے کیسے مستثنیٰ رہ سکتے تھے۔

بجھتا ہوا چراغ اور دَمکتا ہوا سُورج

سر سیّد کے والد کو لال قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی اس لئے یہ خاندان رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد قلعہ کی تنخواہ بند ہوگئی، تھوڑی سی رقم وظیفہ کے نام سے ملتی تھی، اب سر سید کی عمر ۲۲ سال کی ہوچکی تھی، اس لئے ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی، انھوں نے سلطنت مغلیہ کے جھلملاتے ہوئے چراغ کی سمت ایک نظر ڈالی جس کا تیل ختم ہوچکا تھا، صرف بتی جل رہی تھی، کوئی بھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی تھا، انھوں نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ سحر کی طرف سے بے نیازی کے ساتھ رُخ پھیر لیا کہ جو چراغ لال قلعہ کی فصیلوں تک کو روشن نہیں کرسکتا وہ مرے گھر کو کیا اُجالا دے سکتا ہے، اس کے بالمقابل ان کے سامنے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقبال کا دمکتا ہوا سورج تھا جس کی تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کررہی تھی اس لئے انھوں نے اسی سورج سے کچھ کرنیں لے کر اپنے گھر کو بقعہ نور بنانے کا فیصلہ کرلیا، اسی دن زندگی کے آخری لمحہ تک ان کا قبلہ مقصود ایک ہی رہا، ان کی جبین نیاز کے لئے ایک ہی سنگ در اور کعبۂ مراد متعین ہوگیا اور پھر پوری زندگی میں کوئی بھی ایسا لمحہ نہیں آیا کہ انھوں نے دائیں بائیں دیکھا ہو جو سر جس چوکھٹ پر جھک گیا اس سے پوری

زندگی نہیں اٹھایا۔

سرسید کے خالو خلیل اللہ خان دہلی میں صدر امین تھے، ان کے توسط سے سر رابرٹ ہملٹن سے تعارف ہوا اور انھیں کی توجہ سے فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں ان کو نائب منشی بنا دیا گیا، ان کی صلاحیت اور انگریزی حکومت سے بے لچک وفاداری کا تجربہ کرنے کے بعد ان کے لئے مسٹر ہملٹن نے عہدۂ منصفی کی سفارش کردی اور وہ منظور ہوگئی وہ اسی عہدے پر فتحپور سیکری، مین پوری آگرہ وغیرہ میں فائز رہے پھر آپ کا بجنور تبادلہ ہوگیا، وہاں دو سال سے زائد رہے اور یہیں سے ان کی زندگی کے اصل کارنامے ظہور میں آئے۔

قیام بجنور ہی کے زمانہ میں غدر ۱۸۵۷ء کا تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، انگریزی حکومت نے اُسے غدر کے مکروہ نام سے ذکر کیا، وطن پرستوں نے اس کو تحریک آزادی کے آغاز اور جہاد حریت کے جوش آفریں لفظوں سے تعبیر کیا، یہ واقعہ ایک دہکتی ہوئی بھٹی ثابت ہوا، جس میں ہندوستان کے باشندوں کو تپا کر یہ جانچا گیا کہ کون کھرا سونا ہے اور کون کھوٹا؟ کیونکہ یہی تاریخ ہندوستان میں ہندوستانیوں یا مسلمانوں کی حکومت کی آخری تاریخ تھی، انگریزی حکومت جو ایک صدی سے ہندوستانیوں کی غلامی کی دستاویز لکھ رہی تھی مئی ۱۸۵۷ء میں اس دستاویز پر آخری مہر لگائی جارہی تھی، اسی واقعہ نے لوگوں کے درمیان حد فاصل کھینچ دی کہ کون وطن دوست ہے اور کون وطن دشمن؟

بہادر شاہ ظفر کا آخری انجام

اب تک لال قلعہ میں تخت حکومت پر بہادر شاہ ظفر متمکن تھے، اگرچہ بادشاہت صرف نام کی تھی اختیارات مسلوب تھے، لیکن اب بھی یہ احساس باقی تھا کہ ہندوستان کی بادشاہت ایک مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اس ہنگامہ میں حالات کے دباؤ سے مجبور ہوکر بہادر شاہ ظفر اپنے شاہزادوں کے ساتھ مقبرہ ہمایوں میں پناہ لیتا ہے، لیکن اب انگریز مسلمانوں کی حکومت کے نام ونشان کو یکسر مٹا دینے کا تہیہ کرچکا تھا، اس

لئے جنرل ہڈسن اپنے گھوڑ سوار دستے کے ساتھ مقبرہ ہمایوں پہنچا، بہادر شاہ ظفر اور شاہزادوں کو گرفتار کر کے لاتا ہے اور خونی گیٹ پر پہنچ کر شاہزادوں کی گردنیں قلم کرنے کا حکم دیتا ہے، اِدھر شہزادوں کے سروں کو خونی دروازے پر لٹکایا جا رہا ہے اُدھر جنرل ہڈسن دور کھڑا اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ لگا رہا ہے، بہادر شاہ ظفر کو شہر بدر کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

انگریز کلکٹر کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت سر سیّد اپنے ساتھ پولیس کا ایک مسلح دستہ لے کر بجنور کے انگریز کلکٹر کے بنگلے کا پہرہ دے رہے تھے کہ مسلمان اور ہندو جو آمادۂ بغاوت ہیں حملہ آور نہ ہو جائیں اور ایک انگریز کی جان چلی جائے۔ حالی لکھتے ہیں:

''بجنور کے کلکٹر مسٹر شکسپیر اور مسز شکسپیر سے سر سیّد کی بہت رسم وراہ تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شکسپیر بہت گھبرائے، سر سیّد کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے، جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش آپ کی کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے میں مضائقہ نہیں[۱]۔''

چند سطروں کے بعد حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سر سیّد عملی آدمی تھے جو کہا، اپنے عمل سے سچ کر دکھایا، ان کے الفاظ ہیں:

''وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں بچوں کو ڈھارس بندھواتے تھے، ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی[۲]۔''

۱ـ　حیات جاوید از حالی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۶، ۷۷۔

۲ـ　حوالہ مذکور ص ۷۷۔

مسلمانوں کا قتل عام

انگریزوں نے جب دہلی کے باغیوں پر قابو پا لیا تو انھوں نے دہلی کی چاندنی چوک میں معزز مسلمانوں رؤسا، اُمراء، جاگیردار، علماء شعراء اور مشائخ کو گرفتار کر کے بلا امتیاز اور بلا ثبوت جرم پھانسیوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع کر دیا، سر ایڈرووڈ ٹامسن نے اپنی کتاب ''دی آدر سائڈ آف دی ماڈل'' میں درجنوں رونگٹے کھڑا کر دینے والے واقعات لکھے ہیں، وہ معزز مسلمانوں کو عام دستور کے مطابق گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی دیتے تھے اور کبھی کبھی سزا کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے، مذکورہ بالا انگریز نے دل دہلا دینے والے طریقوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، سزا دینے کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ کسی درخت کی شاخ میں رسی کا پھندا باندھ دیا، مسلمان مجرم کو ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے جا کر اس کی گردن میں پھندا ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، مجرم اسی پھندے میں جھول جاتا، زبان منہ سے نکل کر باہر آجاتی، جان کنی کا وہ دردناک منظر ہوتا کہ وہ مرغ بسمل کی طرح ناچتا اور سکڑ کر انگریزی کا 8 بن جاتا تھا، دوسرا طریقہ خاص خاص اور ممتاز مسلمانوں کو سزا دینے کا یہ اختیار کیا تھا کہ اس مسلمان کو توپ کے منہ پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پھر توپ چلا دی جاتی، اس مسلمان کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں اڑ جاتا اور اس کا خون فضا سے زمین پر اس طرح گرتا جیسے خون کی بارش ہو رہی ہے، یہ ڈرامہ ہزاروں انگریزوں، عورتوں اور بچوں کے سامنے کھیلا جاتا تھا، سزا کے ان ہیبتناک طریقوں کو دیکھ کر اور سن کر پورا ہندوستان ڈرے ہوئے بچے کی طرح سہما ہوا تھا، انگریز اس وقت خون آشام بھیڑیا بن گیا تھا، ان کی درندگی و بہیمیت اور ان کی وحشت و بربریت کا کیا عالم تھا؟ اس کی سیکڑوں مثالوں میں سے صرف ایک مثال آپ کے سامنے پیش ہے۔

''انگریزوں نے کوچہ چیلان دہلی سے چودہ سو مسلمانوں کو گرفتار کیا جس میں مولانا امام بخش صہبائی بھی تھے جو دہلی کے ایک مشہور اور جید عالم اور مشہور

ترین شخصیتوں میں سے ایک تھے مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے ساتھیوں مین سے تھے مولانا موصوف کے دونو جوان صاجزادے بھی گرفتاروں میں تھے، ان تمام بے قصور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کر کے بھیڑ بکری کی طرح ہانک کر جمنا پارک لے گئے اور ایک قطار میں کھڑا کر کے سب کو گولی ماردی اور لاشوں کو جمنا پارک میں پھینک دیا[1]۔''

انگریزوں کی حفاظت

ٹھیک اسی وقت بجنور میں جہاں سرسیّد تعینات تھے آٹھ دس انگریزوں اوران کے بیوی بچوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے، حالؔی ہمیں سرسیّد کے لچک وفاداری کی یہ داستان سناتے ہیں:

''وہ رات جب کہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر حفاظت کے لئے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں بگڑ گئیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لئے مراد آباد سے عنقریب آنے والا تھا نہایت سخت تھی، اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہہ نہ تھا، ایسے نازک وقت میں سرسیّد تنہا اس خودسر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو ان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا بہتر یہی ہے کہ ان کو صحیح وسالم یہاں سے جانے دو...... اور سب انگریزوں کو اسی وقت اس خونخوار مجمع سے نکال کر روڑ کی روانہ کر دیا[2]۔''

سرسیّد کا نقطۂ نگاہ

دراصل سرسیّد کا نقطۂ نگاہ عام مسلمانوں سے جداگانہ تھا، وہ انگریزوں کو دوست

---

[1] تحریک آزادی اور مسلمان ناشر دار المؤلفین دیوبند ص ۸۰۔

[2] حیات جاوید از حالؔی مطبوعہ ترقی اُردو بورڈ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۷۔

سمجھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو دشمن اور گردن زدنی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے تھے، انگریزوں کا ہر طرزِ عمل صحیح اور درست، حق وانصاف کے مطابق تھا اور مسلمانوں کا انگریزوں کے مقابلہ میں ہر عمل لائق مذمت اور قابلِ نفرت تھا، حتیٰ کہ مسلمانوں کے اقتدار اور حکومت کے بجائے انگریزوں کی حکومت کو مسلمانوں کے لئے رحمت وبرکت تصور کرتے تھے، اس کے لئے وہ قرآن وحدیث کو استعمال کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت اور ان سے مکمل وفاداری کا سبق پڑھاتے تھے، انگریزوں سے نفرت ودشمنی اور بغاوت کو مسلمانوں کا ناقابل معافی جرم تصور کرتے تھے، وہ اپنے مقالہ ''امام اور امامت'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''السلطان ظل اللّٰہ فی الارض ...... حدیث میں سلطان کا لفظ بغیر قید کے آیا ہے، بس وہ سلطان خواہ مسلمان ہو، خواہ یہودی ہو، خواہ عیسائی ہو، خواہ آتش پرست ہو اس کے ساتھ اس کی رعیت کو اس طرح پیش آنا لازم ہے کہ جس طرح کہ حدیث میں بیان ہوا ہے......تمام مسلمان ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایہ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں[۱]۔''

اس لئے ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ پر ان کو کوئی ملال نہیں ہوا، بلکہ ان کو ایک گونہ خوشی تھی، انگریزی غلبہ واقتدار کے لئے ان کے دل میں ایک جوش اور ولولہ تھا، ان کو بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ تھا جس کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا تھا، یہ سب کچھ سرسیّد کی عین منشا کے مطابق تھا اس پر ان کو رنج نہیں خوشی تھی خود اُنھیں کے الفاظ ہیں:

> ''دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا، اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے اس کی قدر ومنزلت گرادی تھی، ہاں، بیرونجات کے لوگ جو بادشاہ کے حالات اور حرکات اور اقتدار اور اختیار

---

[۱] ''مقالات سرسیّد'' مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء ص ۷۵،۷۶۔

سے واقف نہ تھے بلاشبہہ بادشاہ کی بڑی قدر سمجھتے تھے اور اس کو ہندوستان میں بادشاہ اور آنربیل ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتظم ہندوستان جانتے تھے، الا خاص دہلی کے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے، باوجود ان سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدمیوں کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھ بھی رنج نہ تھا[1]۔"

بہادر شاہ کو احمق اور پاگل کہہ کر سر سیّد اس کا مذاق اڑا کر اپنے دلی جذبے کا ثبوت دیتے ہیں، یہ عام ہندوستانیوں کے جذبات ورجحانات کی ترجمانی نہیں اپنے جذبات وخیالات کا اظہار ہے وہ حقیقتاً اپنے خیالات وجذبات کو عوام کے خیالات وجذبات کے نام سے پیش کرتے ہیں، کیونکہ ایک دوسری جگہ وہ خود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور لکھ دیا کہ:

"دلی کے معزول بادشاہ کا ایران کو فرمان لکھنا، ہم کچھ تعجب نہیں سمجھتے، دلی کے معزول بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ ہندوستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا۔ دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ مکھی مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے پر کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں[2]۔"

ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر کے بارے میں جس شخص کے خیالات وجذبات یہ ہوں کیا اس سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظمت واقتدار کی حفاظت کا اس کے دل میں واہمہ بھی گذر سکتا ہے اہانت کے نقطہ نگاہ سے بہادر شاہ ظفر کو مالی خولیائی آدمی تحریر فرماتے ہیں اور سفید فام

---

[1] "اسباب بغاوت ہند" ضمیمہ حیات جاوید ص ۸۰۶۔

[2] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ جاوید از حالی ص ۸۰۸۔

چنگیزوں اور ہلاکوؤں کے جتھ کو ''آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے معزز لفظ سے یاد کرتے ہیں، سرسیّد کے دلی جذبات ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔

مسلمان نمک حرام تھے

غدر ۱۸۵۷ء میں جن مشائخ، علماء، رؤساء، امراء اور عوام خواص نے انگریزوں کے خلاف جد و جہد کی اور دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کرنے میں رکاوٹ ڈالی، دست بدست جنگ کی، شہید کئے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، کالے پانی بھیجے گئے، جنھوں نے اسلامی اقتدار کو بچانے کے لئے آخری تدبیر کے طور پر جہاد کے نام سے تلوار اٹھائی ان سارے مسلمانوں کی سرسیّد بڑے پر جوش لفظوں میں مذمت کرتے ہوئے ان کو نمک حرام تک کہتے ہیں، انھوں نے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے تین رسالے شائع کئے تھے، حالؔی نے انھیں رسالوں میں سے ایک رسالہ سے سرسیّد کے یہ جواہر پارے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں، سرسیّد تحریر فرماتے ہیں:

> ''جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی کی اور بدخواہی کی، میں ان کا طرفدار نہیں ہوں، میں اُن سے بہت ناراض ہوں، اور ان کو حد سے زیادہ برا جانتا ہوں، کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہئے تھا......اس ہنگامہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہئے تھا، پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے خلاف کیا[1]۔''

وفاداری کا انعام اور صلہ

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے لاکھوں مسلمانوں کو نان شبینہ کا محتاج بنادیا ہزاروں

---

[1] حیات جاوید از حالؔی شائع کردہ ترقی اردو بورڈ دہلی ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

رؤسا و امرا کو ہاتھ میں کاسۂ گدائی لینے پر مجبور کر دیا، رئیس زادیاں اور شہزادیاں یا تو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لگانے اور برتن مانجنے کے لئے نوکرانیاں بن گئیں یا در در بھیک مانگنے لگیں گویا مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اسی فضا اور ماحول میں انگریزوں نے سرسیّد کو ان کی وفاداری اور خدمات کا صلہ دینے کا اعلان کیا، انگریزوں کا یہ فیصلہ بجا تھا، ۵۷ء کے ہنگامہ میں جب انگریزوں کو ہندوستان کا ذرہ ذرہ اپنا دشمن نظر آتا تھا، ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس سے ان کو خوف نہ لگا ہوا ہو، ان کو ہندوستان میں اپنی حکومت کا خواب بکھرتا ہوا نظر آرہا تھا، ایسے مایوس کن حالات میں سرسیّد جیسا وفادار مخلص اور ذہین آدمی انگریزوں کو مل گیا، جس نے ان کے دلوں کو ڈھارس بندھائی اور اپنے دائرہ کار میں انگریزوں کی پوری پوری حفاظت کی، اس کے بھائی مسلمانوں کو انگریزوں نے بھیڑ بکری کی طرح ذبح کیا اور وہ مسکراتا رہا، اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کے پرخچے اڑا دیئے گئے مگر اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا، بلکہ خود بھی مسلمان بادشاہ کو پاگل اور دیوانہ کہہ کر انگریزوں کے طرز عمل کو اس نے خراج عقیدت پیش کیا، ایسے مخلص اور بے لچک وفاداری کرنے والے انسان کی خدمات کا صلہ نہ دیا جائے؟ یہ کیسے ممکن تھا، انگریزوں نے بڑی بڑی جاگیروں کی پیشکش کی لیکن سرسیّد نے بڑی بے نیازی سے ٹھکرادیا یہ ان کے خلوص کی توہین تھی، ان کی مخلصانہ خدمات صلہ وانعام سے کہیں بلند تھیں، جاگیر قبول کرنے سے انکار سرسیّد کی تدبیر وفراست کی دلیل تھی، وہ انگریزوں سے زیادہ چالاک تھے اور کم ازکم اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ جن انگریزوں سے سرسیّد کا واسطہ پڑا اور جن انگریز افسران کی ماتحتی میں وہ کام کررہے تھے ان سب سے کہیں زیادہ ذہین وفطین تھے اس لئے ان کی طرف سے جاگیر کی پیشکش تھی اور سرسیّد کی طرف سے مسلسل انکار، کیونکہ مستقبل کی راہ میں یہ جاگیر سرسیّد کے لئے سب سے بڑی رُکاوٹ بن سکتی تھی، اسی ہندوستان کی سرزمین پر ان کو زندگی بسر کرنی تھی، یہیں کے ہندو مسلمانوں میں ان کو کام کرنا تھا، جاگیر قبول کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ یہاں کے

عوام کی نگاہوں سے گر جاتے اور پھر جاگیر کے بغیر بھی ان کی شاہانہ زندگی گذر سکتی تھی، انھوں نے نقد انعام کو جاگر پر ترجیح دی اور جاگیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، لیکن انگریزی حکومت نے بطور اعزاز اور ان کے تقرب کے اظہار کے طور پر ان کو غدر میں انگریزوں کی بھر پور حمایت و مدد کرنے کا انعام اور صلہ دیا، خواجہ الطاف حسین حالؔی ہمیں بتاتے ہیں:

''گورنمنٹ نے خود ان کی خدمات کی قدر کی اور اُنکے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دوسو روپیہ ماہوار کی پولٹیکل پنشن دونسلوں تک مقرر کی[۱]۔''

سر سیّد کو اپنی خدمات کا صلہ اور انعام لینے سے انکار نہیں تھا کیونکہ اس سے ان کی خدمات کا اعتراف ہوتا تھا اور یہ سب سے بڑی بات تھی کہ انگریزی گورنمنٹ سر سیّد کو اپنا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کرے، مگر جاگیر لے کر بدنام ہونا اور عوام میں رسوا ہونا منظور نہیں تھا۔ حالؔی لکھتے ہیں:

''مسٹر شکسپیر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ من جملہ تعلقہ چاند پور کے ایک معقول جائداد سیّد احمد خاں کو بعوض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہئے مگر جب انھوں نے سر سیّد سے اس بات میں استمزاج لیا تو انھوں نے اس کے لینے سے انکار کیا انھوں نے سر سیّد سے کہا کہ نقد پنشن بہت کم مقرر ہوگی تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے مگر مجھ کو جائداد لینی منظور نہیں[۲]۔''

طائر فکر کی بلند پروازی

غدر ۱۸۵۷ء کے سر سیّد چشم دید گواہ ہی نہیں تھے بلکہ اس دہکتی ہوئی آگ میں کود کر اپنے سرکاری فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے تھے، اس سلسلہ میں کئی بار ان کو اپنی جان داؤ پر لگانی پڑی اور ان کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا، بجنور میں جہاں وہ

۱۔ حیات جاوید از حالؔی، ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔
۲۔ حیات جاوید از حالؔی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۵۔

تعینات تھے کچھ انگریز اور ان کے بال بچے جن کی تعداد پندرہ بیس کے قریب رہی ہوگی ان کو محفوظ اور سلامت رکھنے اور ان کو بہ حفاظت انگریزوں کی فوجی چھاؤنی روڑکی پہنچانے میں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا وہ سرسیّد جیسا وفادار اور انگریزی حکومت کا مخلص خیر خواہ ہی جھیل سکتا تھا، باغی مسلمانون سے سامنا ہونا اور ان کا انگریزوں کے قتل پر بضد ہونا اور سرسیّد کا پوری ہمت وجرأت سے باغیوں کے سردار محمود علی خاں سے گفتگو کر کے اس کو راضی کرنا کہ وہ انگریزوں کو قتل نہ کرے یہ سرسیّد ہی کا دل گردہ تھا، انھوں نے اپنی جرأت سے کام لے کر ان انگریزوں اور ان کے بال بچوں کو بغاوت کی اس دہکتی ہوئی بھٹی سے صاف نکال لیا اور ان کو روڑکی پہنچا کر اطمینان کی سانس لی جس کی وجہ سے بجنور کا انگریز کلکٹر شیکسپیئر خاص طور پر بہت متأثر ہوا اور اس نے اپنی حکومت سے سرسیّد کے لئے بہت بڑے انعام کی سفارش کرنی چاہی لیکن سرسیّد نے سوچا کہ یہ ایک ضلع کا حاکم معمولی انگریز ہے، اس کی خوشی وناخوشی کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتی ہے اس لئے براہِ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کے جلیل القدر ارکان اور ممبران پارلیمنٹ لندن کو اپنی خدمات سے متعارف کرنا زیادہ ضروری ہے، اس لئے جب وہ بجنور سے فرار کر کے بڑی بڑی مصیبتوں سے میرٹھ پہنچے تو انھیں رسالہ ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اسے مرتب کر کے شائع بھی کر دیا، اس رسالہ کا خاص مقصد ان معزز مسلمانوں کی مخبری اور نشاندہی کرنی اور سزا دلانی تھی جنھوں نے بہت نمایاں طور پر انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا تھا۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو رعایت اور بے کم وکاست لکھے گئے ہیں، جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام نشیب وفراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اس سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں[1]۔''

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۷۹، ۸۰ دیکھئے۔

اب سر سیّد کا مراد آباد ٹرانسفر ہو گیا، انگریز بغاوت پر قابو پا چکے تھے اور ہندوستانیوں کو کچل کر نیم جاں بنانے کے بعد مطمئن تھے اس لئے سر سیّد کو اب مراد آباد میں قدرے اطمینان نصیب ہوا، اور انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ انجام دینے کی تیاری کی اور وہ تھا ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کا مرتب کرنا اور چھپوا کر لندن بھیجنا، یہ رسالہ سر سیّد نے اگرچہ کمال خیر خواہی اور بے لچک انگریزی گورنمنٹ سے وفاداری کے جذبے سے لکھا تھا لیکن ان کے لئے ایک آزمائش اور امتحان بن گیا، لندن میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا گیا اور ارکان پارلیمنٹ میں تقسیم کیا گیا، رسالہ کا ردعمل متضاد ہوا، اشتعال پسند ممبران نے کہا کہ یہ رسالہ ہماری حکومت کو بدنام کرنے والا ہے مصنف سے باز پرس ہونی چاہیے، صاحب تدبر وفراست اور روشن دماغ ارکان پارلیمنٹ کا تأثر اس کے برعکس تھا انھوں نے رسالہ کی قدر و قیمت کو پہچانا اور مصنف کی طرف سے دفاع کیا کہ یہ رسالہ سراسر حکومت کی خیر خواہی کی نیت سے لکھا گیا ہے اور اس پر ہم کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے لیکن مشتعل ممبران اس سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے سر سیّد سے باز پرس کی اور سخت باز پرس کی، رسالہ کی مخالفت میں سب سے گرم بیان وزارت خارجہ کے سکریٹری مسٹر سسلی بیڈن کا تھا، انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:

> ''اس شخص نے بہت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے[۱]۔''

اتفاق سے مسٹر سسلی بیڈن ہندوستان آئے، سر سیّد کو اپنی کوٹھی پر بلوا کر بہت ہی گرم لب ولہجہ میں ان سے باز پرس کی اس کا لب ولہجہ اتنا درشت اور سخت تھا کہ سر سیّد کو سوائے صفائی دینے کے اور کوئی راہ فرار نظر نہیں آئی، مسٹر سسلی بیڈن نے کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے یہ رسالہ لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ

---

۱ حیات جاوید از حالیؔ ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۹۴۔

کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے، چونکہ سرسیّد انگریزوں کے لئے انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ حکومت کے خیر خواہ تھے اس لئے اول روز ہی سے نہایت دانشمندانہ اقدامات کئے تھے اس لئے انھوں نے مسٹر سسلی بیڈن کے جواب میں کہا:

''میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانسو ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے...... میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا، صرف ایک کتاب گورنمنٹ کو بھیجی ہے اور اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا[1]۔''

غلام ہندوستان کا ایک معمولی ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت کا سرکاری ملازم لندن سے آئے ہوئے وزارت خارجہ کے انگریز سکریٹری کے جواب میں اس سے زیادہ فدویانہ صفائی اور کیا دے سکتا تھا، لیکن سرسیّد چونکہ حکومت کی وفاداری میں سچے تھے اس لئے رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت والی بات ہوئی۔

سرسیّد کی ذہانت

اس تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں ایک یہ کہ یہ رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' ہندوستان اور یہاں کے عوام کی خیر خواہی اور بھلائی کی نیت سے قطعاً نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا واحد مقصد انگریزوں کی نئی نئی حکومت کے مستقبل میں آنے والے خطرات سے آگاہ کرنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ اگر تم کو ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کرنی ہے تو رسالہ میں درج مشوروں پر عمل کرو، دوسری بات یہ کہ رسالہ بتاتا ہے کہ سرسیّد بہت ذہین بہت بڑے سیاستداں، بہت ہی مدبر اور حکومت وسیادت کا دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انھوں نے یہ رسالہ لکھ کر انگریزوں کو بتایا کہ تم

---

[1] حیات جاوید از حالیؔ ص ۹۴، ۹۵۔

طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان پر قبضہ ضرور کر چکے ہو لیکن اپنے قبضہ کو برقرار رکھنے اور ہندوستان کو غلامی کے شکنجوں میں جکڑے رکھنے کے لئے تدبیریں مجھ سے سیکھو، سرسیّد بادشاہ نہیں تھے لیکن بادشاہ گر ضرور تھے، یہ صرف سرسیّد کا دماغ تھا کہ اس نے انگریزی گورنمنٹ کو ہندوستان میں حکومت کرنے کا ایک ایسا بنیادی گُر بتا دیا کہ انھوں نے اس پر عمل کر کے محدود تعداد میں رہتے ہوئے اتنی کثیر آبادی والے ملک پر نہایت رعب داب اور شان شوکت سے پوری ایک صدی تک حکومت کی، میں اس کی مثال میں بعض مشوروں کی نشاندہی مناسب سمجھتا ہوں۔

ہندوستانیوں کو لڑاؤ اور حکومت کرو

سرسیّد نے اپنے رسالہ میں انگریزوں کو سب سے اہم جو مشورہ دیا وہ یہ تھا کہ ہندو مسلمان میں تفریق پیدا کر دو دونوں کو کبھی ایک محاذ پر جمع مت ہونے دو، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار بنائے رکھو، تمہاری حکومت کامیابی سے چلتی رہے گی، اب تک پورے ہندوستان میں چاہے وہ مغلوں کی فوج ہو یا کسی مسلمان نواب یا کسی ہندو راجہ مہاراجہ کی ہر جگہ بلا استثناء ہندو مسلم سپاہیوں کی مشترک فوج رکھی جاتی تھی، ایک ہی دستے میں ہندو سپاہی بھی ہوتے تھے اور مسلمان سپاہی بھی، میرٹھ میں جب بغاوت کا آغاز ہوا، وہاں بھی چھاؤنی میں ہندو اور مسلمان کی ملی جلی فوج تھی جو مغلوں کے زمانہ سے چلی آرہی تھی، سرسیّد نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ فوج کی یہ ترتیب تم فوراً ختم کر دو، ورنہ تمہاری حکومت کو ہمہ وقت ہندوستان میں خطرہ لاحق رہے گا، دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے الگ کر دو، جب دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گی تو ان میں آپسی اختلافات لازمی ہو گا اس لئے اگر مسلمان بغاوت کرتا ہے تو ہندو اس کی مخالفت کرے گا، اور ہندوؤں میں بغاوت کے آثار اگر ظاہر ہوں گے تو مسلمان اس کی راہ کا روڑا بن جائے گا، اس لئے پہلے ہی دن سے انگریزوں کو ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' کو اپنا بنیادی عقیدہ بنا لینا چاہئے، سرسیّد لکھتے ہیں:

''یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا، مگر یہ سبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا، ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بہ سبب ایک جا رہنے کے اور لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا، ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی، دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں، اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے، ایک دوسرے کا حامی اور مددگار ہو جاتا تھا، اگر انھیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور ایک پلٹن نری مسلمان کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس میں اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی، اور وہی تفرقہ قائم رہتا، اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس جدید کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا[1]۔''

انگریزی حکومت پر سرسیّد کا یہ اتنا زبردست احسان ہے کہ جب تک انگریز ہندوستان میں رہے اس کا عملی طور پر اعتراف کرتے رہے، اور تاریخ کے ہر دور میں سرسیّد کے اس سنہرے مشورے پر عمل کرتے رہے، جنگ آزادی کے دوران ہندوستان کے محبوب ترین اور قدآور لیڈروں اور رہنماؤں نے انگریزوں کے طلسم کو توڑنا چاہا اور کبھی کبھی کچھ دیر کے لئے کامیاب بھی ہوئے اور ہندو مسلمان ایک پلیٹ فارم پر انگریزوں کے خلاف جمع ہوئے لیکن حکومت کو سرسیّد کا یہ مشورہ یاد رہا اسی لئے جب خلافت کے زمانہ میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے تو انھوں نے سوامی شردھانند کو جو کانگریس کے لیڈر تھے جیل سے رہا کر کے ''شدھی اور سنگھٹن'' کی تحریک چلوا کر اس اتحاد و اتفاق کو ڈائنامیٹ کر دیا، اس طرح انھوں نے اپنی پوری حکمرانی میں سرسیّد کے

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ص ۸۴۳۔

دیئے ہوئے اس سبق کو کبھی فراموش نہیں کیا، عہد غلامی کی درازی میں سرسیّد کا زبردست ہاتھ تھا۔

سرسیّد پر حکومت کا اعتماد بڑھتا چلا گیا

انھیں باتوں کی وجہ سے روز بہ روز سرسیّد کی ذات پر انگریزی گورنمنٹ کا اعتماد بڑھتا چلا گیا، سرسیّد کی صداقت وراستبازی، ان کا اخلاص اور ان کے جذبۂ وفاداری نے انگریزوں کے دلوں میں اپنا بلند مقام بنالیا تھا وہ عہدہ کے لحاظ سے منصف تھے جو ڈپٹی کلکٹر کی سطح کا ایک عہدہ ہے جو اس دور میں ہمیشہ انگریز کلکٹر کے ماتحت ہوتا تھا اس کا دائرۂ کار بھی ضلع کے ایک مخصوص حصہ تک رہتا تھا جو ایک تحصیل کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ غیر معمولی عہدہ ان کی بلند وبالا شخصیت کے لئے حجاب نہیں بن سکا، ان کی شخصیت کا جوہر جوں جوں نکھرتا گیا انگریزوں کی محفلوں میں ان کا اعزاز بڑھتا چلا گیا، مگر سرسیّد اپنے موجودہ اعزاز وافتخار پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ گئے بلکہ ہمہ وقت ایک کے بعد ایک بلند مقام تک پہنچنے کی سعی مسلسل کرتے رہتے تھے، اس کے لئے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دینے کا تہیہ کرلیا تھا، چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اس لئے بحیثیت سرکاری ملازم وطن دوستوں کے علی الرغم انگریزی حکومت کے وفادار اور خیرخواہ تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی وفاداری ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہوچکی تھی لیکن سرسیّد کی وفاداری اس سے بھی بلند مقام چاہتی تھی، وہ سوچ رہے تھے کہ ایک فرد کی وفاداری پوری مسلمان قوم کی وفاداری کا بدل نہیں ہوسکتی اور جب تک پوری مسلمان قوم پر یہ رنگ نہ چڑھ جائے اس وقت تک ان کا جذبۂ وفاداری پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اور انگریزی حکومت کو ہندوستان میں استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس مقصد کے لئے سرسیّد نے سفر لندن کا عزم مصمم کرلیا، ایک بیٹے کو اسکالر شیپ مل گئی اپنے اور اپنے دوسرے بیٹے اور ایک ذاتی ملازم کے اخراجات سفر کے لئے انھوں نے از خود انتظام کیا اور پورے جاہ وطمطراق کے ساتھ چار افراد کا یہ قافلہ

لندن کے لئے روانہ ہو گیا، اِس سفر کا مقصد ایسے اسباب و ذرائع کی تلاش تھی جن سے کام لے کر ہندوستان میں انگریزی حکومت کو استحکام حاصل ہو، سرسیّد خود لکھتے ہیں:

''یہ بات میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے۔ بخوبی استحکام و پائیداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دی جائے۔ بس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے اُن کو مطلع کر کے ان کو فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں[۱]۔''

لندن میں سرسیّد کا اعزاز

سرسیّد ہندوستان میں جس عہدہ پر تھے آپ اس سے واقف ہیں، اس ضلع سے اُس ضلع میں ان کا ٹرانسفر اسی طرح ہوتا رہتا تھا، جیسے عام ملازمین کا، کبھی بجنور میں کبھی مراد آباد میں، کبھی غازی پور میں کبھی بنارس میں ان کا عہدۂ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے کے مساوی تھا اس کے باوجود لندن میں جو ان کا اعزاز و اکرام کیا گیا وہ ہندوستان کی ایک عظیم ترین شخصیت کی حیثیت سے ہوا، لارڈ لارنس جو لندن کی معزز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے وہ سرسیّد پر سب سے زیادہ مہربان تھے اور مروت سے پیش آتے تھے، اپنے گھر پر ان کو اکثر ڈنر پر بلاتے تھے اور ہر مہینہ میں ایک بار سرسیّد سے ملنے ان کی قیام گاہ پر آتے تھے، انھوں نے لندن کے اکثر اُمراء اور مشاہیر سے سرسیّد کو ملوایا، لارڈ اسٹینلی جو قسطنطنیہ میں حکومت کے سفیر تھے، وہ جب لندن آتے سرسیّد سے ضرور

۱؎ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

ملتے تھے، سر جان ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سر سیّد کو بوجوہ خصوصیت ہوگئی تھی، ملکہ معظّمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے وہ بھی سر سیّد سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی جو ملکہ معظّمہ کے داماد ہیں، ملایا۔

اس اعزاز واکرام کا راز کیا تھا؟

انگریز جیسی مغرور قوم ایک غلام ملک کے ایک فرد کا یہ اعزاز واکرام کرے، یہ حیرتناک بات تھی، آخر اس کی تہ میں راز کیا تھا؟ بات یہ ہے کہ سر سیّد کے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کا انگریزی ترجمہ کر کے جب تقسیم کیا گیا تو اولاً بعض جذباتی انگریزوں نے اپنی برہمی کا اظہار کیا لیکن حکومت کے اعلیٰ ارکان نے اس کو قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور جب سنجیدگی کے ساتھ اس رسالہ کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو اس کی صحیح قدر ومنزلت کا اندازہ ہوا، سر سیّد نے جتنے مشورے انگریزوں کو دیئے تھے اور جس خلوص سے دیئے تھے وہ ہندوستات میں انگریزی حکومت کے استحکام کے لئے ٹھوس بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے، سر سیّد کی تحریر میں جو بے لچک وفاداری کی روح دوڑ رہی تھی انگریزوں نے اس کو پالیا اس لئے سر سیّد کی قدر ومنزلت میں یک بیک اضافہ ہوگیا اور ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، غلام ہندوستان سے جس کا ذرہ ذرہ انگریزوں کے خون کا پیاسا نظر آرہا تھا اتنا مخلص اتنا وفادار اتنا زیرک اتنا ذہین وفطین انسان ان کو مل جائے گا ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، جس کو اپنے آقا کی محبت میں مسلمانوں کی حکومت کے تہس نہس ہونے کا ذرا غم نہیں، ہزاروں ہزار مسلمان انگریزوں کی تلوار سے خاک وخون میں تڑپے مگر اس کو کوئی ملال نہیں، اس کے لب حرف شکایت سے آشنا نہیں، وفاداری کا جذبہ اگر اس کے سینے میں موجزن ہے تو وہ صرف انگریزی حکومت کیلئے لندن کے ارباب دانش کے لئے یہ بڑا حیرتناک انکشاف تھا، یہ اعزاز واکرام سر سیّد کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا جس کے وہ

مستحق تھے، سر سیّد نے ان کو بتایا کہ ایک ایسے ملک میں جو ایک مذہبی ملک ہے، مختلف اور متضاد مذہب اور تہذیب و معاشرت کے لوگ رہتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد مذہب رکھتے ہیں ایسے ملک میں حکومت کیسے کی جا سکتی ہے؟ انگریزوں نے اب تک صرف اپنی فوجی قوت پر بھروسہ رکھا تھا مصلحت بینی اور دور اندیشی کا فقدان تھا، سر سیّد نے ان کی نگاہوں کے سامنے ایک روشن شاہرا کھول دی چونکہ ہر مشورہ انھوں نے پورے خلوص پوری دلسوزی اور دل کی گہرائیوں سے مکمل وفاداری کے جذبے سے دیا تھا اس لئے ان میں کہیں جھول نہیں تھا اسی لئے انگریزوں نے سر سیّد کی قدر کی اور ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا، ہر انسان اپنے محسن کی قدر کرتا ہے، انگریزوں نے اپنے طرزِ عمل سے بتا دیا کہ ہم بھی احسان شناس ہیں، احسان فراموش نہیں۔

سر سیّد کی لندن میں ایک تقریر

لندن میں انجینیروں کا ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں حکومت کے اہم ذمہ داروں نے شرکت کی تھی سر سیّد کو بھی مدعو کیا گیا تھا، خود لارڈ لارنس نے بہت شاندار لفظوں میں سر سیّد کا تعارف کرایا اور پھر ان سے گذارش کی گئی کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں، سر سیّد بھی اس موقعہ کو ہاتھ سے دینا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تقریر پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔

سر سیّد اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں ایک مقام پر انگریزی حکومت کو یہ مشورہ دے چکے تھے کہ ہندوستان میں اگر آپ کو حکومت کرنی ہے تو رعب داب اور شاہانہ جاہ و طمطراق کے ساتھ حکومت کیجئے، ہندوستانیوں کو اپنی رعایا محکوم اور ماتحت تصور کیجئے، اس کے بغیر ہندوستان میں حکومت کامیاب نہیں ہوسکتی، انھوں نے لکھا تھا:

> ''اہل ہند کو قدیم عادت تھی کہ اپنے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، بادشاہ کی شان و شوکت اور تجمل و تحشم دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ایک قاعدہ جبلت انسانی میں پڑا ہوا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے، یہ بات جانتا

ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا مالک ہے، ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں[۱]۔''

یہ مشورہ انگریزوں کے لئے بڑا قیمتی مشورہ تھا اوران کے مغرورانہ مزاج کے عین مطابق تھا رسالہ کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر لندن کا اونچا طبقہ سرسیّد کے ان جذبات وخیالات سے واقف تھا، اس لئے جب انجینیروں کے جلسہ میں انھوں نے تقریر کی کہ:

''ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں مثلاً تعلیم، ہتھیار، اور عدل وانصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انھیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے جن کو ان سے کام پڑا ہے جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا ہے لیکن وہ چیز جس نے خاص وعام سب کے دل میں انگلش قوم کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینیری کے نتائج ہیں جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے، ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب داب اور اس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے[۲]۔''

تو سرسیّد کی اس تقریر پر اتنی زوروں کی تالیاں بجائی گئیں کہ پورا ہال گونج گیا، کیونکہ خود پسند اور مغرور انسانوں سے کہا جائے کہ ان سے دوسرے لوگ بہت ہی مرعوب ہیں تو اس کو بڑی مسرت ہوتی ہے، سرسیّد نے اسی نفسیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اپنی تقریر کا انداز بیان یہی رکھا۔

جنت کی سیر

سرسیّد جیسے مخلص اور دیانتدار سرکاری ملازم اور عالی دماغ انسان انگریزی حکومت کا سچا خیرخواہ ملکہ معظّمہ کا اتنا معتقد ہو کہ اس کے سر پر خدا کا ہاتھ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ملکہ کی طرف سے شائع کئے جانے والے

---

۱ رسالہ اسباب بغاوت ہند، ضمیمہ حیات جاوید از حالیؔ ص ۸۳۸۔

۲ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۳۔

اشتہار کو الہامی کہتا ہوا ایسے شخص کی اگر پورے جوش اور ولولے سے پذیرائی ہو اور مسرت وخوشی سے مملو ہوکر اگر ان کو یورپین تہذیب وعریانت کے جاذب نظر اور دلکش مناظر بھی دکھا دیئے جائیں تو اس کا جذبۂ وفاداری اپنے معراج کمال پر پہنچ جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے سرسیّد کو مختلف مقامات کی سیر کرائی گئی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹیوں سے ان کو رُوشناس کرایا گیا، شاندار سے شاندار مناظر دکھائے گئے، سرسیّد ان تفریحات اور دلکش مناظر کے دیکھنے کے بعد سیّد مہدی علی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہو لندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے؟ یا نہیں؟''[1]

سرسیّد نے انگریزوں کی زندگی کو اندر باہر سے خوب تفصیل سے دیکھا اور بہت متاثر ہوئے، ڈیڑھ سو سالوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے بے پناہ دولت حاصل کی تھی، لندن کے بہت سے لُچے لفنگے، آوارہ گرد نوجوان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم بن کر ہندوستان آئے، انھوں نے یہاں سونے کا بہتا ہوا دریا دیکھا، ہیرے جواہرات کے انبار دیکھے، دونوں ہاتھوں سے خوب سمیٹا، وہ لندن میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے، لفاظی نہیں اظہار واقعہ ہے میں بطور مثال صرف ایک اقتباس ایک انگریز مصنف گرے کی تاریخ ہند سے دے رہا ہوں، وہ لکھتا ہے:

''سرنگا پٹم کے مشہور قلعہ کو فتح کرنے کے بعد کمپنی نے فیصلہ کیا کہ جواہرات، روپیہ، سامان کو موقع ہی پر تقسیم کرلیا جائے، جس افسر نے جس قدر خدمت کی ہے اس کے لحاظ اور اندازہ لگا کر اسے مال غنیمت سے حصہ دیدیا جائے، اس تقسیم کے لئے ایجنٹ مقرر کردیئے گئے میجر پرائس لکھتا ہے کہ میں بھی اسی میں تھا، قلعہ کی دولت دیکھ کر آنکھیں پھر گئیں، دیکھا نہیں جاتا تھا کہ ناقابل یقین دولت اور لاتعداد زر و جواہر قلعہ میں کہاں سے آگئے، مختلف قسم کے پارچہ جات

---

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

اور طرح طرح کی قیمتی اور نادر اشیاء اور لاجواب ذخیرے سامنے کھلے پڑے تھے، ہماری عقل حیران تھی، فرد حساب بھی تیار نہ کر سکتے تھے، معلوم ہوا کہ بیرونی دروازوں سے سپاہی اور توپ خانوں کے لوگ گھس آئے تھے اور کافی مال لے کر چمپت ہو گئے تھے، شہر میں بھی ہر شخص نے خوب لوٹ مار کی بیسیوں گھروں میں جا کر روپیہ چھین لیا گیا، ڈاکٹر مٹن کے پاس ۷۴ نمبر کی رجمنٹ کے ایک سپاہی نے نہایت معمولی رقم میں پردہ اور کپڑے بیچے جن میں اس قدر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے کہ ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ ایک ہندوستانی جوہری نے چالیس ہزار پونڈ لگایا تھا، بعض اور زیوروں کی قیمت کا اندازہ لگانے سے جوہری بھی قاصر تھے، اس سپاہی نے یہ کپڑے ایک گھر سے چرائے تھے اور اپنی رجمنٹ کے ڈاکٹر کے ہاتھ نہایت معمولی رقم پر فروخت کر دیئے تھے، تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ تمام جواہرات اور زیورات کو میز پر پھیلا دیا گیا اور ڈھیریاں بنا دی گئی تھیں، پھر ہر ڈھیری کی قیمت ایک جوہری کے ذریعہ سے تخمینہ کرائی گئی، جس کے بعد یہ چیزیں افسروں کو تقسیم کر دی گئیں، سوائے لارڈ ہیرس کے جو کمانڈر انچیف تھا باقی سب افسر میزوں کے گرد بیتابی کے ساتھ جمع ہو گئے، لارڈ صاحب اپنی بڑی پوزیشن کی وجہ سے نہیں آئے مگر انھیں ان کا حصہ خیمہ میں بھیج دیا گیا، لارڈ ہیرس کے ڈھیر میں وہ ہار بھی تھا جس کی قیمت ۱۳۵۰۰ پونڈ بتائی جاتی ہے، یہ ہار ایک مندر کی مورتی کے پیٹ سے نکلا تھا، سر ڈیوڈ بیرڈ کو اس کے حصہ میں ایک انگشتری ملی جس کی قیمت پچاس ہزار تھی، مگر اس نے اس وقت غصہ میں آ کر اسے پھینک دیا تھا کہ یہ تو رنگا ہوا شیشہ ہے ایک سپاہی نے اٹھا کر پانچ ہزار میں فروخت کر دی، میجروں کو جواہرات تقسیم کرنے کے بعد باقی جواہرات اور قیمتی اشیاء دیگر افسروں اور سپاہیوں میں تقسیم کر دی گئیں ٹیپو سلطان نے ایک تخت بے مثل ساخت کا بنوایا تھا جو خالص سونے اور جواہرات کی بنی ہوئی تھی، تخت چار سونے کے شیروں کی

پشت پر قائم تھا اس تخت کے ٹکڑے کر کے ڈھیر لگا دیئے گئے ۱۸۰۰ پونڈ ہر شخص کے حصہ میں آئے تخت کی چھت جنرل گانٹ کے ہاتھ ۲۵۰۰ پونڈ میں فروخت کر دیا گیا، اس تخت کے سامنے دو شیر ٹھوس اور خالص سونے کے تھے بادشاہ کو ولایت بھیج دیئے گئے، اس کے ساتھ کچھ اور ہیرے جواہرات اور قیمتی ہتھیار بھی روانہ کر دیئے گئے، یہ تو افسروں اور حاکموں کو ملا، ہر سپاہی کو جسے پرائیویٹ کہا جاتا ہے تقریباً چھ چھ پونڈ ضرور مل گئے لیکن انھوں نے پرائیویٹ طور پر کافی روپیہ پیدا کر لیا تھا، کیونکہ میجر پرائس لکھتا ہے کہ بہت سے یورپین سپاہیوں نے کئی کئی ہزار کے جواہرات بھیجے اور پھر اپنی نوکری چھوڑ کر اپنے گھروں کو چلے گئے، بعض سپاہیوں کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک شراب کی بوتل کے لئے کئی کئی سو روپئے کی مالیت کے جواہرات کوڑیوں کے دام بیچ ڈالے ان تفصیلات سے جو سرکاری کاغذات کے ذریعہ معلوم ہوتی ہیں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصص مثلاً بنگال کے محلات، اودھ کے شاہی خاندانوں، دہلی کے بادشاہ اور پنجاب کے علاقوں، اور سندھ کے امیروں، راجپوتانہ کی ریاستوں اور دیسی راجدھانیوں سے انگریزی افسروں، فوجی حاکموں، گماشتوں، کارندوں اور حتیٰ کہ معمولی سپاہیوں نے جائز اور ناجائز طریقہ سے کس قدر روپیہ اینٹھا ہوگا[1]'' (تاریخ ہند از گرے)

ہمارے آباء واجداد کی دولت لوٹ کر جب وہ ہندوستان سے لندن پہنچے تو وہ وہاں شاہانہ زندگی بسر کرنے لگے، عیش وعشرت اور رئیسانہ تکلفات سے آراستہ وپیراستہ ان کا معاشرہ بن گیا جو آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، سرسیّد نے ان مناظر کو دیکھا تو ان کی آنکھوں سے درد وغم کے بجائے ان کی آنکھوں میں رشک کی بجلیاں تیرنے لگیں۔

یورپ میں زندگی ہمیشہ اخلاقی بندشوں سے آزاد رہی اور جب ان کے یہاں دولت کی فراوانی ہوئی تو وہ خوب کھل کھیلے جس وجمال قدرتی تھا، پُر تکلف لباسوں نے

[1] تاریخ سلطنت خداداد (میسور) از محمود خاں بنگلوری شائع کردہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۴۷ء ص ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳۔

حسینان فرنگ کو اور چمکا دیا، عیش وعشرت کے پر تکلف سامان اور پاکیزہ تر اسباب معاشرت چمکتے چمچماتے فرنیچر اور لہکتے مہکتے درو بام، اور دعوت نظارہ دیتی ہوئی یورپین ہرنیاں اور تتلیاں، ان تمام رعنائیوں اور شادابیوں نے لندن کو دنیاوی جنت بنا رکھا تھا، سرسیّد ان مناظر کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگئے، اور جذبات کی رو میں بہ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو نصیحت کرنے لگے کہ وہ یورپین تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت اختیار کریں، تعصب اور دقیانوسیت اپنی زندگی سے باہر نکال کر باہر پھینک دیں، جنت ودوزخ کے فرضی تصورات کو ذہنوں سے جھٹک کر نکال دیں تو دنیا ان کے لئے خود جنت بن سکتی ہے زندگی کا سلیقہ انگریزوں سے سیکھیں، انگریزی حکومت کو السلطان ظل اللہ فی الارض کی نگاہ سے دیکھیں، ان سے نفرت وعداوت، بغض وعناد، دشمنی وبغاوت کر کے نمک حرامی نہ کریں اور ایک وفادار رعایا اور خیر خواہ دولت انگلیشیہ بن کر رہیں اسی میں ان کی بھلائی ہے، اس طرح کی نصیحتوں سے مملؤ بیانات وہ لندن سے لکھ کر ہندوستانی اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیجتے تھے اور وہ یہاں سے شائع ہوتے تھے جس کی وجہ سے پورے ملک میں سرسیّد کے خلاف غم وغصہ اور اشتعال کی فضا بن گئی، جب ان کے ہم مشرب ہم نواؤں نے ان کو ہندوستان کے حالات اور فضا سے مطلع کیا تو ان کو جوش اور جذبات کی رو یک بیک تھم گئی، انھوں نے محسوس کیا کہ ان سے چوک ہوگئی، ظاہر وباطن کی یکسانیت مستقبل کی راہوں میں سنگ گراں بن جائے گی، اس لئے اندرونی جذبات کو اپنے حدود میں رہنا چاہئے اور ظاہر کا دائرہ کار دوسرا ہونا چاہئے، انھوں نے ۲۲؍ مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک تحریر بہ عنوان "غدار از طرف گنہگار سیّد احمد خاں" ہندوستان بھیجی اور پھر ایک مضمون بعنوان "عرضداشت سیّد احمد بخدمت اہل وطن" اخباروں میں اشاعت کے لئے روانہ کی[1]۔

نئے جذبات اور نئی اُمنگیں

انگریزی حکومت کے ایک وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے اپنی حکومت کی

---

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۵۷۔

خواہی سرسیّد کا فرضِ منصبی تھا جس کو وہ نہایت عزم واستقلال سے انتہائی کٹھن اور مشکل حالات میں بھی ادا کرتے رہے، اسی وجہ سے پوری انگریزی حکومت ان کے خلوص اور دیانتداری کی معترف ہوگئی اور ان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ زیر بار رہی، لندن میں ان کی پذیرائی اور اعزاز واحترام نے ان کے جذبہ وفاداری کو آتش سیال بنادیا اور وہ لندن ہی میں بیٹھ کر ہندوستان میں اپنے مشن کو چلانے کا ذہنی خاکہ تیار کرنے لگے تھے، لندن جانے کے بعد ان کو ہر طرح کی سہولتوں کے دراز ے کھلتے ہوئے نظر آنے لگے تھے، انگریزوں نے بھی اپنی غلطی کو محسوس کرنا شروع کردیا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبر ایک تصور کرتے تھے سرسیّد کو اندر باہر سے پرکھنے کے بعد ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی جیسا کہ سرسیّد کے لندن سے رخصت ہونے کے وقت ایک اخبار نے لکھا تھا:

> ’’جن انگریزوں سے یہاں ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام لیاقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصیتوں نے ان سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کردیا تھا، بہت عمدہ اثر ہوا، یہاں کے بہت سے مدبران سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایسے لئیق اور واقفکار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سیّد احمد خاں میں نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور بودی رہتی[1]۔‘‘

انگریز سرسیّد کی کن باتوں سے متأثر ہوئے؟ اور اپنے کام کے لئے ان کو موزوں ترین آدمی سمجھا؟ ہندوستان کے بارے میں ان سے کیا خصوصی گفتگو ہوئی کہ ہر ایک ان کی لیاقت کا قائل ہوگیا؟ وہ وہی بات تھی جو بلا استثناء ہر انگریز کے دل میں پیوست تھی کہ ہندوستان میں ہمارے کام کا کوئی آدمی نہیں، بالخصوص مسلمانوں میں ایسا کوئی شخص نہیں جو صحیح معنی میں خلوص دل سے برطانوی حکومت کا وفادار اور خیرخواہ ہو وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ پوری مسلمان قوم اپنا اقتدار چھن جانے کی وجہ سے تلملائی

[1] حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۶۰۔

ہوئی ہے، ان کے دلوں میں انگریز دشمنی کا لاوا پک رہا ہے، لیکن سر سیّد سے مل کر ان کی غلط فہمی دور ہوئی، اور پھر سر سیّد جیسا عالی دماغ انسان جو ایک حکومت کا دماغ رکھتا ہے، ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کی جاسکتی ہے، اتنے بڑے ملک کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے ہندوستان کی دو بڑی اور پر جوش قومیں مسلمان اور ہندوؤں کو کس طرح ایک دوسرے سے لڑا کر انگریزی حکومت کو بچایا جاسکتا ہے یہ سب کچھ ان کو سر سیّد سے سیکھنا پڑا، اور انھیں خطوط پر بعد میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو ایک صدی تک چلایا اور کامیاب ہوئے، انھیں احسانات کے اعتراف کے طور پر ملکہ وکٹوریہ کی بارگاہ خاص میں شرف بازیابی حاصل ہوا، اور ان کے سمدھی اور داماد کے ہاتھوں سے ان کو تمغہ اور خطاب[1] دیا گیا۔

سر سیّد کی لندن سے واپسی

ایک سال پانچ ماہ لندن میں رہ کر جب ستمبر ۱۸۷۰ء میں سر سیّد ہندوستان تشریف لائے تو ان کے سینہ پر ایک چمکتا ہوا ستارہ اعزاز و افتخار کی آب و تاب سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا اور ان کے سر پر جواد الدولہ عارف جنگ آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس کا سنہرا تاج جگمگ جگمگ کر رہا تھا، یہ چمکتا ہوا ستارہ، یہ جگمگاتا ہوا تاج سر سیّد جیسے عالی دماغ شخص پر انگریزی حکومت کا کوئی احسان نہیں تھا، سر سیّد کا حق تھا جو ان کو ملا، کیونکہ جب پورے ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی دوست نہیں تھا وہ اپنے ہم وطن، ہم مذہب مجاہدین آزادی کی صفوں سے نکل کر ان انگریزوں کی صفوں میں شامل ہوگئے جو ان کے آباء و اجداد کی آٹھ سو سالہ حکومت کو تہس نہس کر رہے تھے، وہ اپنے وطن اور اپنے ہم مذہب دونوں کی نگاہوں میں معتوب ہوئے لیکن انھوں نے انگریزوں کی رفاقت، ان کی مکمل اور ناقابل شکست اطاعت انقیاد اور بے لچک وفاداری کو ترک نہیں کیا، ان

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۱۵۳، ۱۵۴۔

کی خدمات لارڈ کلایو لارڈ ولزلی، لارڈ لارنس، جنرل ولسن، جنرل مارس اور جنرل ہڈسن کی خدمات سے کسی طرح کم نہ تھیں، انھوں نے حکومت کے دائرہ کوتلوار کی طاقت سے وسیع کیا اور سرسیّد نے اپنی حکمت عملی سے انگریزی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں کلیدی رول ادا کیا، انھوں نے ہندوستانیوں کے دل و ماغ سے آزادی کے تصور کو بھی نکال دیا اور بھرپور کوشش کی کہ ہندوستانیوں کے دل ودماغ پر بغاوت وانقلاب کی پرچھائیں بھی نہ پڑیں، سرسیّد کا یہ کارنامہ انگریز فاتحین کے کارناموں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جوایک صدی پوری کی وہ انگریز جنرلوں اور کرنلوں کی شمشیر زنی کی وجہ سے نہیں سرسیّد کے صائب وصحیح مشوروں پر عمل کر کے یہ کامیابی حاصل کی، اس لئے یہ تمغہ اور خطاب سرسیّد پر کوئی احسان نہیں تھا بلکہ سرسیّد کے احسانات سے خود انگریزی حکومت کی گردن جھکی ہوئی تھی، سرسیّد اگرچہ رنگ، نسل اور خاندان کے لحاظ سے انگریز نہیں تھے لیکن دل ودماغ، ذہن وفکر اور جذبات وخیالات کے لحاظ سے انگریزی قوم کے ایک عظیم ترین فرد تھے۔

مسلمانوں کو درس وفاداری

''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' کی اشاعت اور سفر انگلستان میں حکومت کی طرف سے اعزاز واکرام اور تمغہ خطاب پانے کے بعد سرسیّد کی ذات انگریزی حکومت کے وفاداروں کے لئے منارۂ نور بن گئی۔ اب ہندوستان میں ان کی ہر جدوجہد اور سرگرمیاں حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے داروں کی نگاہ میں ہر شک وشبہہ سے بالاتر ہوگئیں اور اب ان پر کسی کوانگلی اٹھانے کی جرأت نہیں رہ گئی، اس لئے لندن میں بیٹھ کر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے جو تجاویز سوچی تھیں اور جو خاکہ بنایا تھا ہندوستان واپسی کے بعد اس پر پوری سرگرمی سے عمل شروع کر دیا، چونکہ سرسیّد انتہائی ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ آہنی عزم وارادہ کے بھی مالک تھے مشکلات کے وقت گھبرا جانا انھوں نے کبھی جانا ہی نہیں، ہر

طرح کی مخالفتوں کے طوفان میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں لگے رہنا اور پائے اثبات میں جنبش نہ ہونا ان کی فطرت تھی، اس لئے وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن میں لگ گئے۔

سر سیّد پر کامل اعتماد کی ایک مثال

سر سیّد پر انگریزی حکومت کس درجہ اعتماد کرتی تھی اور اس کو کتنا بھروسہ تھا اس کی ایک مثال حالی نے اپنی مشہور کتاب میں پیش کی ہے، آپ یہ داستان انھیں کے لفظوں میں سنئے، وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سر سیّد سے ملاقات ہوگئی، دونوں آگرہ جا رہے تھے اور سر سیّد کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور رہے، اس افسر نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟ انھوں نے کہا ''وہابی مسلمان ہوں'' پھر اس نے سر سیّد کا سارا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا، جب ریل آگرہ پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے، پھر سر سیّد مٹن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے، اتفاق سے وہ افسر انھیں کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حلیہ اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے، اب کمشنر صاحب نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ ''لو یہ تمہاری اسامی حاضر ہے'' جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہ سرکار ہے تو اسے تعجب ہوا اور سب بڑی دیر تک اس بات پر ہنستے رہے[۱]۔''

شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ ۱۸۶۴ء تک وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی سزا پھانسی اور کالے پانی سے کم نہیں تھی مذکورہ سالوں میں انگریزی حکومت نے مجاہدین

[۱] حاشیہ از حالی حیات جاوید ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۷۶۔

آزادی پر جو سازش و بغاوت کے تین بڑے مقدمات چلائے ہیں ان کو تاریخ میں ''انبالہ سازش کیس'' یا ''مقدمہ وہابیان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان مقدمات میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء و مشائخ اور مسلمان امراء و رؤسا ماخوذ تھے اور بلا استثناء ان تینوں مقدمات میں تمام ملزموں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا پھر کچھ دنوں جیلوں میں رکھ کر پھانسی کے بجائے ان کو کالے پانی بھیج دیا گیا پھر ان کو وطن کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوئی[1]۔''

وہابی ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ اگر حکومت کو شبہہ بھی ہو گیا کہ فلاں شخص نے وہابی مسلمانوں کی مدد کی ہے تو سزا اسے نہیں بچ سکتا تھا، چنانچہ تیسرے ''مقدمہ وہابیان'' جو عظیم آباد میں ۱۸۷۰ء میں چلا گیا اس میں حشمت داد خاں اور امیر خان کو صرف اس لئے مجرم قرار دیدیا گیا کہ ان کے یہاں سے وہابی مجاہدین کی ایک ہُنڈی برآمد ہو گئی تھی، یہ کلکتہ کے رؤساء میں شمار ہوتے تھے چمڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا، محض اسی جرم پر جھوٹے گواہوں سے گواہیاں دلوا کر امر خاں کو کالے پانی بھیج دیا گیا اور ان کی کروڑوں کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، حشمت داد خاں کو دس سال مختلف جیلوں میں رکھنے کے بعد اس حال میں چھوڑا گیا کہ یہ کروڑ پتی آدمی دانے دانے کو محتاج ہو چکا تھا اور اسی غم میں مر گیا۔

وہابی ہونا اس دور میں بغاوت کے جرم سے بھی بڑا جرم مانا جاتا تھا چاہے یہ الزام کتنی ہی بڑی شخصیت پر لگایا جائے بلا ثبوت اس کو پھانسی پر چڑھا دینا انگریزوں کے لیے ضروری تھا۔ سر سیّد سے کہیں بڑی اور عظیم شخصیتیں صرف اس جرم میں ماخوذ ہوئیں، عظیم آباد کے بہت ہی معزز و محترم صاحب علم و فضل رئیس کبیر بڑے جاگیر دار مولانا احمد اللہ ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی جیسے لوگ وہابی ہونے کے الزام میں گرفتار کئے گئے اور بغاوت و سازش کا ان پر فرضی مقدمہ چلا کر ضمیر فروش اہلکاروں سے گواہیاں دلوا کر فرد جرم عائد کر دی گئی، انگریز جج نے پھانسی کا حکم سنا دیا اور کروڑوں کی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ناشر دار المؤلفین دیوبند۔

جائداد کو بحق سرکار ضبط کرلیا گیا اور عید کے دن ان کو اور ان کے بال بچوں اور پردہ نشین خواتین کو ان کے گھروں سے اس حال میں نکالا گیا کہ گھر سے ایک سوئی بھی لے جانے نہیں دیا گیا اور اس معزز خاندان کو سڑک پر اس طرح چھوڑا گیا کہ صرف ان کے بدن پر جو کپڑے تھے وہی ان کی ساری کائنات تھی اور ان دونوں بزرگوں کو پہلے پھانسی کی سزا سنائی گئی کچھ دنوں جیل میں رکھنے کے بعد پھانسی کی سزا کو بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا اور ان کو ۱۵/جون ۱۸۶۵ء کو کالے پانی بھیج دیا گیا[۱]۔

منصوبہ بند پروگرام

لندن سے واپسی کے بعد سرسیّد کے سامنے دو پروگرام تھے، پہلا پروگرام مسلمانوں میں جدید تعلیم اور جدید تہذیب کو مقبول عام بنانا تھا ان کے خیال میں اس سے دو فائدے تھے، ایک تو میڈل کلاس کے مسلمانوں کے لئے باعزت ذریعہ معاش پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہندوستان میں سب سے زیادہ معاشی اعتبار سے وہی پریشان حال تھے نوابوں اور راجاؤں کو تو حکومت نے رام کرلیا تھا، کچھ ریاستوں کے حکمران خاندان کے وظیفے مقرر کردیئے تھے اور کچھ ریاستوں کو ''سب سڈیری سسٹم'' کے اصول پر حکمراں خاندان کو موج مستی کرنے کی سہولتیں دیدی تھیں، اپنی فوج ان ریاستوں میں رکھ کر یا ریزیڈنٹ مقرر کرکے ان نوابوں اور راجاؤں کی شہ رگ کو شکنجہ میں کس لیا تھا مگر وہ اپنی ریاست میں عیش وآرام کی زندگی گذار رہے تھے، رہ گئے عوام تو سرسیّد کو اُن سے نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ ان سے کوئی ہمدری اور نہ کبھی عام مسلمانوں کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی رہی، صرف میڈل کلاس مسلمانوں کا طبقہ ایسا تھا جو ہمیشہ سے ملازمت پیشہ رہا ہے، مغلیہ حکومت کے دور میں تمام دفاتر پر وہ چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سماج میں عزت بھی تھی اور زندگی بھی خوش خرم گذر رہی تھی، مغلیہ حکومت کے خاتمہ اور انقلاب زمانہ نے ان کے ہاتھوں سے یہ ذریعہ معاش چھین لیا، نئی حکومت کے دفاتر میں اُردو فارسی کا چلن ختم ہونے سے وہ بے سہارا ہو گئے اس

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان'' ص۴۴ تا ۵۳، شائع کردہ دارالمؤلفین دیوبند مؤلفہ اسیر ادروی۔

لئے اس طبقہ کی حالت نا گفتہ بہ ہوگئی، اب انگریزی کا رواج تھا بغیر اس کے ملازمت ممکن نہ تھی اس لئے ان کی تعلیم کا بندوبست کرنا سرسیّد نے ضروری سمجھا۔

دوسرا فائدہ یہ تھا کہ یہ طبقہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت کا قابل اعتماد اور وفادار عنصر بن جائے گا، اس طرح کی جماعت ہندوستان میں بنانا انگریزی حکومت کے مقاصد میں شامل تھا، بہت پہلے لارڈ میکالے نے ۷/ مارچ ۱۸۳۵ء کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کی حمایت کی تھی اور اپنی رپورٹ میں اپنی اس رائے کی وجہ یہ بیان کی تھی:

> ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو[1]۔''

سرسیّد کا مقصد ایسی ہی جماعت کی تشکیل تھی، کیونکہ یہ جماعت انگریزی حکومت کا دست و باز و بن کر اس کو مدد پہنچائے گی اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کو استحکام حاصل ہوگا، لیکن سرسیّد نے اس شراب کو دو آتشہ بنانے کے لئے انگریزی تعلیم کے ساتھ یورپین تہذیب بھی اختیار کرنے پر ضرورت سے زیادہ زور دینا ضروری سمجھا، اس کے لئے اپنے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں یورپین اساتذہ کا اسٹاف لازمی قرار دیا، ان کو ہندوستانی اساتذہ کے مقابلہ میں لمبی لمبی تنخواہیں دیتے، ان کے رہن سہن کے معیار کو شاہانہ رکھنے کی کوشش کرتے، ان کے مقابلہ میں ہندوستانی اساتذہ کو وہ سہولتیں اور تنخواہیں نہیں دیتے تھے، ان کی نگاہ میں شاید ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ حاکم اور محکوم کا فرق نمایاں رہے، مدرسۃ العلوم کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ احساس باقی رہے کہ وہ محکوم قوم کا فرد ہے، اس طرح وہ انگریزی اساتذہ کی معاشرت، تہذیب اور سوسائٹی سے زیادہ متاثر ہوگا، کیونکہ ہر انسان اپنے سے اُوپر والے کے طور طریق کو اختیار کر کے اس کی صف میں شامل ہونے کو ذریعہ فخر سمجھتا ہے، سرسیّد کے سامنے

---

[1] تاریخ التعلیم از میجر باسو، بحوالہ ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' از طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۷۔

انگریزی تعلیم سے یہی مقصد تھا، اور وہ اس کے لئے پورے طور پر کوشش کرتے رہے۔

ان کا دوسرا پروگرام ہندوستان کے عام مسلمانوں سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کرنا تھا وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان علماء ومشائخ کے اثر واقتدار سے گلو خلاصی حاصل کرلیں اور جب مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی تو آسانی کے ساتھ ان باتوں کو قبول کرلیں گے جن کی سرسیّد تبلیغ کرتے تھے۔

پہلے پروگرام کے تحت علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم کھولا، اور دوسرے پروگرام کی تکمیل کے لئے رسالہ ''تہذیبُ الاخلاق'' جاری کیا، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے کا پروگرام بنایا، انھیں دونوں مقاصد کو لے کر سرسیّد ہندوستان میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑتے رہے، لکچر دیتے رہے، مضامین لکھتے رہے اور کچھ رؤسا اور اُمراء کو اپنا ہم نوا بنا کر اس مشن کو پوری قوت سے ۱۸ سال تک مسلسل چلاتے رہے، اور حکومت کو اپنی سرگرمیوں سے ہمیشہ باخبر رکھتے رہے، اگر ہندوستان میں دھیمی سی بھی کوئی آواز سنائی دیتی جس سے انگریزی حکومت کی مخالفت کی جھلک ملتی، اس کے خلاف پورا یک محاذ کھڑا کردیتے، چنانچہ جب انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کو تین چار برس ہوگئے اور اس میں کچھ ترقی پسند افراد شامل ہوگئے تو حکومت سے بعض مسائل میں مطالبات کی تجویزیں بھی پاس ہونے لگیں اس سے سرسیّد نے یہ سمجھا کہ اب ہوا کا رخ بدل رہا ہے اور حکومت پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات منوانے کی جانب پیش قدمی ہورہی ہے، سرسیّد جیسے مخلص وفادار کو یہ کیسے برداشت ہوسکتا تھا، انھوں نے کانگریس کے خلاف دھواں دھار تقریریں مختلف مرکزی مقامات میں کیں اور کانگریس کی سرگرمیوں کو بریک لگانے کے لئے ایک انجمن بناڈالی۔

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اگست ۱۸۸۸ء میں سرسیّد نے ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' اس غرض سے قائم کی

کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقدار کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کی رائیں، خیالات اور خط وکتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائیں اور نیز اخبارات کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائیں۔

سرسیّد کا جذبۂ وفاداری اس کو برداشت نہیں کر رہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنی مشکلات ومصائب کے حل کے لئے کوئی تجویز پاس کریں یا حکومت سے کوئی مطالبہ کریں وہ ہندوستان کو غلامی کی دلدل سے اُبھرتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اور جو لوگ اس روش کو اختیار کر کے یہاں کے قومی مسائل کو حل کرنے کا جذبہ رکھتے تھے ان کی سرگرمیوں سے اپنی حکومت کو باخبر رکھنا ضروری سمجھتے تھے تاکہ بروقت ان طاقتوں کو کچلنے اور تہس نہس کرنے کے لئے حکومت تیار رہے جب کہ خود کانگریس میں ابھی ایسے ترقی پسند داخل نہیں ہو سکتے تھے جو اس جرأت رندانہ کا اظہار کرتے، لیکن سرسیّد جیسا دوراندیش انسان ہوا کا رخ پہچان گیا کہ آج جس جماعت کی آواز دبی دبی سی ہے کل اس کی آواز میں رعد وبرق کی کڑک بھی پیدا ہو سکتی ہے جو ایوان حکومت میں زلزلہ ڈال سکتی ہے اس لئے پیش بندی کے طور پر اس انجمن کے ذریعہ اس کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کر دیا اور کانگریس کی مخالفت کو اپنا مشن بنا لیا۔

سرسیّد بات کے دھنی تھے اور عملی آدمی تھے جس بات کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کو بروئے کار لانے میں پوری جدوجہد کو کام میں لاتے تھے اس لئے جب کانگریس کی مخالفت شروع کی تو کئی سو کی تعداد میں جاگیرداروں کو ایک پلیٹ فارم پر کانگریس کی مخالفت میں کھڑا کر دیا اور بالخصوص مسلمانوں میں زبردست پروپیگنڈہ کے ذریعہ کانگریس سے نفرت پیدا کرنے کا کام بھی پوری سرگرمی سے شروع کر دیا اور اس کے بہترین نتائج بھی سامنے آ گئے، خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہمیں بتاتے ہیں:

''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کے قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی ممالک متوسط، اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی

انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جلسے کئے گئے، تمام تعلقہ داران اودھ، مہاراجہ بنارس ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں[۱]۔''

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا ۞ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

آج آزاد ہندوستان میں سرسیّد کی ان سرگرمیوں کی روداد پڑھی جاتی ہے اور ان کی وطن دشمنی اور مسلمانوں کے مستقبل کو تباہ کرنے اور ان کو ہندوستان کی سرزمین میں ہمیشہ کے لئے ذلیل ورسوا کرنے کی جدوجہد پر نظر جاتی ہے تو دل غم وغصہ سے کھول جاتا ہے، آج تاریخ کی ان سچائیوں کو پڑھ کر ہماری گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں، دل چاہتا ہے کہ کاش کوئی تاریخ صفحات سے ان حقائق کو کھرچ کر پھینک دے ہمارے دامن پر لگے ہوئے اس گھناؤنے داغ کو کوئی دھودے، لیکن مسلمانوں کے مسیحا نے ساری زندگی انگریزوں کی وفاداری کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا تو اس کی پردہ پوشی کے لئے نہ الفاظ کی جادوگری کام آسکتی ہے اور نہ زور بیان اور طاقت لسانی کی چادر سے اس کو چھپایا جاسکتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی ان کی وفات کے چوتھائی صدی بعد قائم ہوئی اور ان کے جذبات وخیالات کی سمیّت سے ایک حد تک محفوظ رہی ورنہ شاید ۱۹۴۲ء کی پرشور تحریک ۱۹۴۷ء کے بعد ہونے والی آگ اور خون کی بارش میں اس کا وجود مٹ گیا ہوتا اور اس کے نام ونشان کو صفحۂ ہستی سے کھرچ کر پھینک دیا ہوتا اور ہم اپنے ایک عظیم قومی سرمایہ سے محروم ہوجاتے۔

سرسیّد کی ساری سرگرمیوں کے پس پشت جو جذبہ کام کررہا تھا، اختصار کے ساتھ میں نے اس کی نشاندہی کردی، میری اس تفصیل سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ سرسیّد کا واحد مقصد ہندوستان میں انگریزی حکومت کو طاقت وقوت پہنچانا اور اس کے استحکام کے لئے جد جہد کرنا تھا، نہ ان کے سامنے ہندوستان کے مفاد تھے، نہ

[۱] حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۲۵۸، ۲۵۹۔

مسلمانوں کے نہ اسلام کے، ان کو صرف انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا اس مفاد کے لئے وہ اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے مذہب سب کو قربان کر سکتے تھے، وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دست و بازو بن کر رہے، بلکہ جو ہاتھ ہندوستانی عوام کو غلامی کے سخت ترین شکنجوں میں کس رہے تھے انھیں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ سرسیّد کا بھی تھا، وہ ہندوستان کے دماغ سے نہیں انگلستان کے دماغ سے سوچتے تھے وہ شکل وصورت، جسم، لباس اور ہیئت کے لحاظ سے ضرور ہندوستانی تھے لیکن غور وفکر، سمجھ، بوجھ، ذہن ومزاج اور دل ودماغ کے لحاظ سے خالص انگریز اور اس کے سوا کچھ نہیں، وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے غیرت وخودداری کو حماقت سمجھتے تھے، وہ ایک غلام اور وفادار نوکر کے دماغ سے سوچتے تھے، وہ اپنے آقا انگریزوں کے قدم رکھنے سے پہلے اپنی پلکوں سے زمین کو صاف کرنے کے قائل تھے، نہ ہندوستان کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت تھی نہ اسلام اور مسلمانوں کی۔

بار بار کے تجربوں کے بعد انگریزی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں نے ہندوستان کی سرگرمیوں کی مخبری کی خدمت ان کو سپرد کی تھی کیونکہ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے اخلاص ووفا کی قسمیں کھائی جانے لگی تھیں، حالی نے حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے درجنوں اعتراف اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں ان میں سے چند آپ بھی ملاحظہ فرمالیں اور دیکھیں کہ یہ لوگ سرسیّد کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو کتنی محبت سے یاد کرتے ہیں اور اپنے کس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، حالی تحریر فرماتے ہیں:

> ''سر جان اسٹریچی نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسیّد کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ''کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں سیّد احمد خاں نے دیا میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ میں جن کے ذریعہ ان کی جاں نثاری کا پورے طور پر اظہار کرسکوں، اگر سیّد احمد خاں نہ ہوتے تو ہماری جانیں نواب

محمود علی خاں کی شکار ہو جاتیں [۱]۔''

''پال مال گزٹ'' مورخہ ۲۹؍ مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد کی وفات کے بعد ان کی نسبت جن جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے حالی ہمیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں:

''سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسیّد احمد خاں کی زندگی پر، وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا، اور جو خدمتیں اس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے [۲]۔''

مسٹر ایچ، جی، کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار ''ہوم ورڈ میل'' میں سرسیّد کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی:

''سیّد احمد خاں جس سے میں نے ۱۸۷۸ء میں جب کہ وہ لیجلسٹو کونسل کا ممبر تھا واقفیت حاصل کی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاص کر مشکل اور خطرے کے وقت میں خواہش کرے گا [۳]۔''

یعنی ہندوستان میں انگریز حکام کو سیّد احمد خان جیسے وفادار اور انگریزی حکومت کے حقیقی خیر خواہ کے مشورے کے بغیر کام کرنا مشکل ہوگا، مشکلات وخطرات کے موقعہ پر اس کی جاں نثاری اور فداکاری پر پورا اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے، حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو اس سے بہتر سے بہتر تعاون حاصل ہوگا۔

سرسیّد کے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' جو ان کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور یقیناً بڑا زبردست کارنامہ ہے لیکن ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کے لئے نہیں، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکومت کے لئے کیونکہ اس کے مندرجات پر عمل کر کے ہی وہ ہندوستان کو غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑنے میں کامیاب ہوئے اور اپنی ایک مستحکم اور پائیدار حکومت بنا سکے، اسی رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار

۱۔ حیات جاوید از حالی ص ۳۳۰۔
۲۔ حیات جاوید از حالی ص ۲۸۵۔
۳۔ حیات جاوید از حالی ص ۳۲۲۔

''سینٹ جیمس بجٹ'' نے لکھا:

''سیّد احمد خان کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس ملک کے واسطے سراسر مفید ہے وہ اس کے ان خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کردیتی ہے جو اس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں بیان کئے ہیں، یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے[۱]۔''

کرنل گریھم نے اس رسالہ کے متعلق اپنی رائے کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں وہ لکھتے ہیں:

''بعض لوگ سیّد احمد خاں کی ''اسباب بغاوت ہند'' سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہمارے خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفاء میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے فی نفسہ نہایت درجہ مفید ہے۔''

اتنے اہم ترین انگریزوں کی رائے آپ کے سامنے ہے ان پر مزید تبصرہ کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بس اتنی وضاحت البتہ ضروری ہے کہ تمام ذمہ دار انگریزوں کی رایوں میں ایک قدر مشترک صرف سرسیّد کی انگریزوں سے بے لچک وفاداری ہے، وہ انگریزوں کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلتے تھے، ان کے سامنے صرف انگریزی حکومت کا مفاد تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ تھا سرسیّد کی زندگی کی تصویر کا ایک رُخ، ان کی تصویر کا دوسرا رُخ صرف مسلمانوں کی دیدۂ بینا کے لئے ہے، آیئے تصویر کے اس رخ کو ایک مسلمان کی نگاہ سے بھی دیکھ لیں۔

تصویر کا دوسرا رُخ

اب تک آپ کے سامنے میں نے سرسیّد کی تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا کہ

۱؎ حیات جاوید از حالی ص ۳۲۵۔

انھوں نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے اور یہاں کے باشندوں کی غلامی کو دیرپا اور مستحکم بنانے میں کیا رول ادا کیا، اس تفصیل سے جو سچائی سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی عوام یا خاص مسلمانوں کے رہنما اور لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ انگریزی حکومت کے نمائندے تھے، ان کو انگریزی حکومت کا مفاد عزیز تھا ملک یا مسلمان کا نہیں۔

ان کا مشن دوسرے نمبر پر یہ تھا کہ پوری مسلمان قوم کو انگریزی حکومت کا مکمل وفادار بنادیں، اس کے لئے انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلسل جد جہد کی، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان بحیثیت مجموعی برطانوی حکومت کے مخلص وفادار بن جاتے ہیں تو پھر انگریزی حکومت واقتدار کو تنہا ہندو قوم کبھی ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اس لئے بعض اونچے درجے کے انگریزوں نے سرسیّد کو ''وفادار مسلمان شرفا'' کا نمائندہ کہا ہے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرانے کا سبق انگریزی حکومت کو اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں پہلے ہی پڑھا چکے تھے، وہ ایک ایسا مرکز یا محاذ بنانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی ہم نوا ہوکر انگریزی حکومت کی ثنا خواں ہوجائے اور وہ انگریزی حکومت کو خدا کی رحمت و برکت تصور کرنے لگے، وہ اپنے مضمون ''امام اور امامت'' میں لکھتے ہیں:

> ''تمام مسلمان جو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے سایۂ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسی مہربان اور عادل گورنمنٹ ان کی جان و مال اور عزت اور مذہب پر مسلط کی ہے[1]۔''

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کو جو پچاس ہزار مسلمانوں کے شہید ہونے کے بعد جاری ہوا اس کو الہامی اعلان کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملکہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے[2]۔

---

[1] مقالات سرسیّد حصہ اول مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۷۷۔

[2] حیات جاوید ص ۸۴۲۔

اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی ساری جد و جہد مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی کے لئے تھی یا انگریزی حکومت سے مرعوب کر کے مسلمانوں میں غلامانہ بے غیرتی و بزدلی، مایوسی، کم ہمتی پیدا کر کے ہر قسم کی جد جہد میں حوصلہ شکنی کے لئے تھی، مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا وفادار بنانے کے لئے احادیث وقرآن کو بے تحاشا استعمال کرتے اور معنی و مفہوم کے بیان کرنے میں مجتہد مطلق کی طرح کلام کرتے، اسی سلسلہ میں بہت سے اسلام کے مسائل میں انھوں نے جمہور امت اور مسلمانوں کے سواد اعظم سے اختلاف کر کے خود ساختہ عقائد ونظریات مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کی، اپنے مقصد اور حکومت سے وفاداری کا سبق پڑھانے میں قرآن وحدیث کے مسلسل استعمال کی وجہ سے ان لوگوں کے حلقہ میں جو سرسیّد کے نظریات سے متفق ہو چکے تھے ان کو ایک مذہبی رہنما کی ہی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ وہ ان کو اس سے کہیں بلند وبالا مقام دیتے تھے، جس سال ان کا انتقال ہوا، اسی سال ان کے مقالات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے جسے مولوی امام الدین گجراتی اور مولوی احمد بابا مخدومی نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا، اس مجموعہ کے سرورق پر سرسیّد کا نام اس طرح لکھا گیا:

> ”ملک کے جاں نثار، مسلمانوں کے عملی غمخوار، مصلح وریفارمر، مجتہد ومجدد، پیشوائے ملت، امام وقت، اسلام کے عاشق صادق، قوم پر اپنا تن من دھن قربان کرنے والے، جوادالدولہ، عارف جنگ، آنریبل ڈاکٹر سرسیّد احمد خان صاحب بہادر کے، سی، ایس، آئی، ایل، ڈی، ایف، آر، ایس، بانی مدرسۃ العلوم علی گڈھ، مرحوم ومغفور علیہ الرحمۃ[۱]۔“

مال کا اسراف ہی ناپسندیدہ نہیں الفاظ کا بے جا اسراف اور بے محل استعمال بھی کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں مگر عقیدت اور غلوئے محبت کا یہ اظہار شاید مرتب کے لئے اپنے اندر کوئی افادیت کا پہلو رکھتا رہا ہو، اس چار سطری نام والقاب کے سلسلہ مں مجھے بس اتنی بات عرض کرنی ہے کہ سرسیّد کے ذہن وقار اور فکر رسالہ کا یہ کمال ہے کہ ۱۸۵۷ء

---

[۱] مقالات سرسیّد حصہ اول، شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۹۲۔

کے موقعہ پر پورا اسلامی ہند کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اپنی حکومت واقتدار کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے اپنی ساری قوت وطاقت لگا کر ہارتا ہے اور شکست کے بعد پوری مسلمان قوم دیکھتی ہے کہ جس ظالم وجابر قوم سے ہم نبرد آزما ہیں اسی کی صف میں سر سیّد احمد خاں بھی کھڑے ہیں، اور اسلامی ہند کی ذلت آمیز شکست میں ان کا بھی ہاتھ ہے، اس کے باوجود تحریر وتقریر کے زور پر اسی شخص کو اسلام کا سب سے بڑا فدارکار، اسلام کا عاشق صادق، اور مسلمانوں کا غم خوار اور خدا جانے کیا کیا القاب مسلمان قوم دے ڈالتی ہے، یہ غیرت وخوداری کی موت اور احساس کمتری اور پست ہمتی کی سب سے نچلی اور پست ترین سطح ہے۔

ہندوستان اور عیسائیت

جب لال قلعہ میں انگریزی ریزیڈنٹ رہنے لگا اور بادشاہ کی حدود سلطنت دہلی شہر تک محدود ہوکر رہ گئیں اور ''ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' کی منادی ہونے لگی، ملتان سے برما تک انگریزوں کے اختیار میں آگیا تو لندن میں فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں فروغ عیسائیت کی مہم چلا کر وہاں کی اکثریت کو عیسائی بنایا جائے تاکہ ہماری حکومت کو استحکام حاصل ہو، اسی نقطۂ نگاہ سے لندن میں ایک تربیتی سنٹر کھولا گیا، جہاں اسلام پر اعتراضات کرنے اور علماء اسلام سے مناظرہ کرنے کی پادریوں کو تربیت دیجاتی تھی، جب تربیت یافتہ پادریوں کی تعداد ہزاروں میں ہوگئی تو پادریوں کی یہ ساری فوج ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے بھیج دی گئی اور پورے ملک میں پھیلا دی گئی، حکومت کے عہدہ دار مشنری ذہن ومزاج کے بھیجے جانے لگے، سر ولیم میور جو یوپی کا گورنر تھا خود مشنری تھا، دہلی میں لندن کا اسقف اعظم پادری فنڈر آیا اور دہلی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اسلام پر اعتراضات کرنے لگا اور انتہائی جارحانہ انداز میں مسلمانوں کو مناظرہ کی دعوت دینے لگا، اسلام کے خلاف اس نے ایک کتاب ''میزان الحق'' لکھی تھی اور اس کو پیش کر کے یہ دعویٰ کرتا تھا کہ یہ کتاب

الہام سے لکھی گئی ہے کوئی مسلمان عالم اس کا جواب نہیں دے سکتا، ہندوستان کے کسی عالم میں اگر جرأت ہوتو اس کا جواب دے یا مجمع عام میں مجھ سے مناظرہ کر کے مذہب عیسوی کو جھوٹا ثابت کردے، یہ وہ دور تھا کہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا رعب داب چھایا ہوا تھا اور کسی کو اس پادری کے جواب میں زبان ہلانے کی جرأت نہیں تھی، گویا پادریوں کی زبان سے ایک جابر و قاہر حکومت بول رہی ہے، اسی طرح ہر بڑے شہر میں پادریوں کا ایک جتھ مصروف جدوجہد تھا، یہ جہاں بھی عوام میں جاتے تھانے سے کہ کر چند پولیس کے جوان اپنے ساتھ لے جاتے تھے اسلئے عوام کیا خواص تک سہمے ہوئے تھے، ہر شخص کو یقین ہو چکا تھا کہ انگریزی حکومت پورے ہندوستان کو ایک نہ ایک دن بجبر واکراہ عیسائی بنا کر رہے گی، اسی دوران کلکتہ کے لاٹ پادری ای ایڈمنڈ کی کھلی چٹھی ملک میں شائع ہوگئی اور اس نے صاف صاف لکھ دیا کہ:

”معلوم ہوتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی کے ساتھ غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنا چاہئے یا نہیں ...... مذہب عیسائی ہی ایسا مذہب ہے جو خدا کے پاس سے براہِ راست الہام کے ذریعہ سے آنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہی ایسا مذہب ہے جس سے اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں جس کا حال اس سے منکشف ہوتا ہے خوشی حاصل ہوسکتی ہے، دنیا کے کسی مذہب سے اس مذہب کو ممتاز کرنے کے لئے اس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ یہ انسان کی عقل اور دل سے اپیل کرتا ہے اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جو محض دلیل کے زور سے پھیلا ہے جو قومیں اس مذہب پر اعتقاد رکھتی ہیں سب سے زیادہ غور خوض کرنے والی اور دنیا میں سب سے زیادہ شائستہ ہیں پس بہر کیف اس مذہب کو حق حاصل ہے کہ اس پر غور کیا جائے[1]۔“

یہ صرف ایک گشتی چٹھی نہیں تھی بلکہ یہ اشارہ تھا کہ حکومت کے ذمہ داروں کو اب اس سمت میں ٹھوس اور مضبوط قدم اٹھانا چاہئے، اور جس طرح ممکن ہو پورے ملک کو

[1] ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ، ایڈیشن چھٹی پادری ای ایڈمنڈ ص ۸۴۷، ۸۴۸۔

گرجا گھر میں سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا جائے، ہندوستان کے عوام اور خواص سب نے اس اشارہ کو سمجھ لیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔

اس صورت حال سے سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین مسلمان تھے، کہ ان کی حکومت ہاتھ سے جا چکی اب ان کے مذہب پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے، یہ تمام حالات سر سیّد کی آنکھوں کے سامنے تھے یہ سارے تماشے دہلی میں ہو رہے تھے اور سر سیّد دہلی میں مقیم تھے، لیکن اس قیامت کی گھڑی میں عیسائیت کی طاقت کے ذریعہ تبلیغ پر ان کی زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا، کیوں کہ عیسائیت کی مخالفت انگریزی حکومت کی مخالفت تھی اور سر سیّد کو یہ کسی حال میں منظور نہیں تھا۔

یتیموں کو جبراً عیسائی بنانا

مراد آباد اور اطراف میں زبردست قحط پڑا بے شمار یتیم ہو گئے، سرکاری انتظام میں محتاج خانہ کھولا گیا، سرکاری طور پر یتیم خانے کا انچارج سر سیّد کو بنایا گیا، سر سیّد نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اس کام کو کیا افسرانِ بالا تک ان کے حسن انتظام کی رپورٹ گئی، یتیموں میں ہندو اور مسلمان دونوں کے بچے تھے، قحط کی مصیبت سے نجات پا کر اپنے اپنے مذہب کے لوگوں میں وہ چلے جائیں گے، ہر سمجھ دار شخص یہی سمجھتا تھا، سر سیّد کا بھی ارداہ جب تک حکومت کی منشا نہیں معلوم تھی، یہی تھا کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جو مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے ان کو ہندوؤں کے سپرد کر دیا جائے گا، جب قحط پر قابو پا لیا گیا اور حکومت نے محتاج خانہ بند کرنے کا ارادہ کیا تو قدرتی طور پر لاوارث یتیموں کا نظم کرنا ضروری تھا اسی دوران پادریوں نے کلکٹر مراد آباد سے ان یتیموں کا مطالبہ کیا کہ ان کو ہمیں سپرد کر دیا جائے، کلکٹر نے اس کے فیصلہ کے لئے کمیٹی بنائی جس میں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریز بھی تھے، سر سیّد کو بھی اس کمیٹی کا ایک رکن بنایا گیا یہی کمیٹی یتیموں کی سپردگی کا فیصلہ کرے گی، سر سیّد چونکہ یتیم خانے کے انچارج تھے اس لئے قدرتی طور پر کمیٹی میں ان کی رائے کا

وزن زیادہ تھا، اور انگریز کلکٹر کے بعد سب سے با اثر رکن سرسیّد ہی تھے، انگریز افسران کے چشم وابرو کے اشارہ پر متفقہ طور پر فیصلہ کردیا گیا کہ تمام لاوارث اور یتیم بچے مشنریوں کے سپرد کردیئے جائیں اور ان تمام مسلمانون اور ہندوؤں سے ان بچوں کو واپس لے لیا جائے جن کی سپردگی میں یہ بچے دیئے گئے ہیں ان سے لے کر عیسائیوں کے حوالے کردیئے جائیں، سرسیّد نے اس فیصلہ کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، بلکہ تائید کرنے والوں میں یہ بھی شامل تھے، البتہ ان سے ان یتیموں کو واپس کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا جو ان کی پرورش میں دیئے گئے تھے، گویا کمیٹی نے یہ اجازت دے دی کہ جو بچے سرسیّد کی ذاتی تحویل میں ہیں وہ ان کے پاس علیٰ حالہٖ رہیں گے لیکن اب سرسیّد کو انگریزی افسران کی منشا معلوم ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے ازخود ان یتیموں کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا، سرسیّد کے مداح سوانح نگار حالی خود ہمیں بتاتے ہیں:

> ''وہ بچے زاروقطار روتے تھے، اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر سرسیّد نے اپنے جذبۂ وفاداری کے تحت ان کو واپس نہیں لیا[1]۔''

جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ان یتیم بچوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے لئے لے جایا جارہا ہے، اوران سے ان بچوں کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کو زبردستی گھر سے نکال کر عیسائیوں کے مذبح میں بھیج دیا جہاں ان کے دین ومذہب کے قتل کا مکمل بندوبست تھا۔

عیسائیت سے پنجہ آزمائی

ہندوستان میں عیسائیت بڑے رعب داب اور لاؤ لشکر کے ساتھ آئی تھی، عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بے شمار لٹریچر شائع ہوتے رہتے تھے اور مفت تقسیم کئے جاتے، ہر طرح کے اجتماعات میں پادریوں کی بڑے ہی جارحانہ لب ولہجہ میں

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۰۔

تقریریں ہوتی رہتی تھیں اور ہندوستان کے خطہ خطہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں سے مناظروں کی بھی دھوم دھام تھی ۱۸۵۴ء کے مناظرہ نے تو اس کی شہرت ہندوستان سے یورپ تک پہنچادی جو آگرہ میں پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے درمیان ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر وزیر خاں کا بھی زبردست کردار تھا[1]، مناظرہ کا خاص موضوع انجیل کا محرف ہونا تھا، مسلمان مناظرین نے ناقابل تردید دلائل سے سات آٹھ جگہ تحریف کا ثبوت دیا اور خود پادری فنڈر نے مجمع عام میں اس کا اعتراف کرلیا، اور مسلمانوں کی فتح کا شور مچ گیا، مناظرہ میں انگریزی حکومت کے بہت سے اعلیٰ عہدہ دار شریک تھے، پادری فنڈر کی اس کھلی شکست پر بہت جزبز ہوئے، پادری فنڈر کو ہندوستان سے راتوں رات فرار کرنا پڑا، یورپ میں اس مناظرہ کا اتنا اثر ہوا کہ پادری فنڈر اپنے عہدے سے معزول کردیا گیا، وہ لندن سے بھاگ کر ترکی گیا، اتفاق امر انھیں دنوں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظّمہ پہنچے ہوئے تھے، ترکی خلیفہ نے جب پادری فنڈر کی لن ترانیاں سنیں تو اس نے تحقیق کرائی کہ ہندوستان میں ہونے والے مناظرہ کی صحیح صورت حال کیا ہے تو مکہ کے گورنر نے خلیفہ کو لکھا کہ ہندوستان میں پادری فنڈر کا جس عالم سے مناظرہ ہوا تھا وہ آج کل مکہ میں ہیں خلیفہ نے گورنر کو حکم بھیجا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب کو فوراً ترکی بھیج دیا جائے۔

پادری فنڈر کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ ترکی سے بھاگا اور پھر پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں مر کھپ گیا کیونکہ پھر اس کے بعد اس کا کہیں نام نہیں سنا گیا، اس مناظرہ نے ہندوستان میں ہوا کا رخ بدل دیا، مسلمان جواب تک حکومت کے ڈر کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے ان میں جرأت بڑھی اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں علماء اسلام نے پادریوں کا تعاقب شروع کردیا اور ان کو گھیر گھیر کر مناظرہ کرنے لگے، اور مجمع عام میں ان کے خلاف تقریریں کرنے لگے اور پادریوں کی ہوا اکھیڑدی، پادریوں کے حوصلے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ''احیاءِ اسلام کی ایک عالمگیر تحریک'' مؤلفہ اسیر ادروی ناشر دار المؤلفین دیوبند۔

پست ہوگئے مسلمانوں نے سانپ کا پھن کچل کر رکھ دیا کہ اس کے ڈسنے کا امکان کم سے کم ہوتا چلا گیا۔

بائبل کی تفسیر

آگرہ میں جب مناظرہ ہورہا تھا سرسیّد دہلی میں تھے اور سرکاری عہدہ دار تھے، وہ اس مناظرہ سے پوری طرح باخبر تھے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسیّد کو پادریوں کی اس شکست سے کچھ خوشی نہیں ہوئی بلکہ ایک گونہ ان کو رنج اور ملال ہوا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مناظرہ کے بعد ہی انھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کرلیا، اس کے لئے انھوں نے بڑی محنت کی، کافی سرمایہ لگایا اور مسلمان مناظرین کے اس دعویٰ تحریف کے برخلاف انھوں نے انجیل کو غیر محرف ثابت کرنے لئے پورا زورِ قلم صرف کردیا ہے۔

۱۸۵۴ء کے مناظرہ آگرہ سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک یعنی جب تک عیسائی مشنریوں کا زور تھا اور وہ تبلیغ عیسائیت کے لئے انتھک جدو جہد کرتے رہے علماء اسلام عیسائیت کے باطل اور ناقابل عمل ہونے کے لئے صرف ایک دلیل دیتے رہے کہ تمہارے ہاتھوں میں جو انجیل ہے وہ خدا کا کلام نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو انجیل اُتری تھی اس کے اندر کتر بیونت کرکے عیسائیوں نے اس کو ناقابل اعتبار بنادیا ہے، اور ہر جگہ پادریوں کو مناظروں میں اسی تحریف کے موضوع پر ذلت آمیز شکستیں ہوتی چلی گئیں، مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا منصور دہلویؒ جو عیسائیوں کے آخری دور میں مناظرہ ومباحثہ کرنے والے بزرگوں میں ہیں ان تمام حضرات نے اسی پہلو سے عیسائی مناظرین کی مناظروں اور مباحثوں میں زبانیں بند کیں اور پادریوں کو مجمع عام میں رسوائیاں اٹھانی پڑیں۔

ان حالات میں سرسیّد کا بائبل کا تفسیر لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کیا وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے؟ کیا اسلام اور مسلمانوں کو بائبل کی تفسیر کی ضرورت تھی؟ جب ان میں سے کوئی بات نہیں تھی تو اس بے موسم کی راگنی کا حاصل کیا

تھا؟ عقل اس کی توجیہ سے قاصر ہے، حالی جو سر سیّد کی اسی طرح مدح کرتے ہیں جیسے عربی کا مشہور شاعر متنبّی اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا رہتا تھا، حالی نے بھی سر سیّد کے ہر غلط کام کی تاویل کو اپنا فرض منصبی بنا رکھا ہے، یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے، اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں[1]۔''

دیکھا آپ نے؟ ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت میں ایسی خون ریز جنگ چھڑی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں یا تو اسلام زندہ رہے یا عیسائیت، اس جنگ کے نتیجہ پر ہندوستان میں اسلام کی موت وحیات منحصر ہے اور مسلمان اپنی پوری قوت مدافعت سے کام لے کر اسلام کی زندگی کے لئے موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور عیسائیت کے قاہرانہ وجابرانہ حملوں سے بچانے کی جد وجہد میں مصروف ہیں اور سر سیّد اسلام اور عیسائیت میں مطابقت ثابت کر کے مسلمانوں کی قوت مدافعت کو کمزور کرنے کی جد وجہد کر رہے ہیں، یہ اسلام کی نہیں عیسائیت کی ہمدردی میں کیا جا رہا ہے اور حالؔی اس کو سر سیّد کی اسلامی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، حالؔی کے ہاتھ میں قلم ہے اس کو کون پکڑ سکتا ہے، حالی کا کردار سر سیّد کی سوانح میں بالکل وہی ہے جو آج کل کی عدالتوں میں وکیلوں کا ہوتا ہے، مقدمہ چاہے کتنا ہی جھوٹا اور بے بنیاد ہو اس کو زور بیان اور طاقت لسانی سے سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عدالت کو دھوکے میں رکھ کر اپنے موافق فیصلہ کرانے کی انتھک جد وجہد کرتے ہیں، حالی بھی سر سیّد کے مقدمہ میں جو ملت اسلامیہ کی عدالت میں پیش ہے ایک ماہر قانون وکیلوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۲۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مشنریوں کے ہزاروں جتن کے باوجود چند ہی غیر مشہور مسلمان عیسائی ہوئے کیونکہ تمام مسلمان بلا استثناء عیسائیت کو باطل اور گمراہ سمجھتے تھے اور اس کی طرف سے ان کے دلوں میں نفرت بیٹھی ہوئی تھی اور ان کا بے شمار لٹریچر جو ملک میں برابر تقسیم ہوتا رہتا تھا کبھی کوئی پڑھنے اور دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو جتنا جبر کیا جارہا تھا اور مشنریوں کی طرف سے لالچ دیا جارہا تھا ہزاروں اور لاکھوں پست حال مسلمان عیسائی ہوگئے ہوتے، سر سیّد مسلمانوں کے دلوں سے عیسائیت سے اسی نفرت کو دور کرکے ان کو عیسائیت قبول کرنے کے لئے ہموار کرنے اور عیسائیت کے لئے مسلمانوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لئے بائبل کی یہ تفسیر لکھ رہے تھے اور خاص طور پر مسلمان مناظرین جو تحریف انجیل کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پادریوں کو میدان مناظرہ میں شکست دے رہے تھے، اس کی تردید کرکے پادریوں کے ہاتھوں میں نیا ہتھیار دے رہے تھے، خود حالی ہمیں بتاتے ہیں کہ سر سیّد کا کیا مقصد تھا:

> ''مسلمان موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے، ان کو بائبل اور اس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہوسکتی ہے[۱]۔''

سر سیّد مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ تلوار چھین لینا چاہتے ہیں کہ جس تلوار سے کام لے کر مسلمانوں نے ہندوستان میں عیسائیت کی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا اور اس کی موت یقینی ہوگئی تھی، وہ بائبل کی تفسیر لکھ کر اسلام کی نہیں عیسائیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ تفسیر بائبل شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں مسرت اور خوشی کر لہر دوڑ گئی، مشہور مستشرق ڈاکٹر گارسن دی تاسی جو پیرس یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا استاذ تھا اور پُر جوش عیسائی تھا، ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ سے اس کو بڑی

۱؎ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۱۱۲۔

دلچسپی تھی وہ ہر سال یونیورسٹی میں اپنے طلبہ کے سامنے ایک لکچر دیتا تھا اس میں اُردو کی مطبوعات کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو کتابیں اُردو میں لکھی جاتی تھیں اُن پر تبصرہ کرتا تھا، جب سر سیّد کی کتاب اس کے پاس پہنچی تو اس نے اس سال کے اپنے اٹھارہویں لکچر میں جو ۷؍ستمبر ۱۸۶۸ء کو دیا تھا، کہا:

''اُردو کی بعض دوسری کتابیں جنھیں ہم خالص مسیحی تو نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں، ان میں وہ کتاب شامل ہے جو ایک مسلمان عالم نے بائبل کی تفسیر پر لکھی ہے، یہ کتاب اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہے اور فاضلانہ بھی ہے، میری مراد سیّد احمد خان کی تفسیر بائبل ہے[۱]۔''

ایک مشنری ذہن ومزاج کا عیسائی سر سیّد کی کتاب کو عیسائی کی کتاب تو نہیں نیم عیسائی کی کتاب کہتا ہے، یعنی مشنری لٹریچر تو براہ راست عیسائیت کی دعوت دیتا ہے، سر سیّد کی تفسیر بائبل اس راہ کے کانٹوں کو چن چن کر مسلمانوں کو عیسائیت کی منزل تک پہنچنے میں سہولت پہنچانے والی کتاب ہے، مسلمان تو اس وقت اسلام کی طرف سے مدافعت میں موت وزیست کی لڑائی لڑ رہے ہیں، ان کو عیسائیت کے فضائل ومناقب جاننے کی کیا ضرورت تھی؟ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انگریزی حکومت جو ہندوستان میں عیسائیت کے فروغ کے لئے خفیہ طور پر پوری طاقت صرف کر رہی تھی، سر سیّد نے بائبل کی یہ تفسیر لکھ کر حکومت کی منشا اور اس مشن میں مدد پہنچانے کے لئے لکھی تھی، اس کے علاوہ ان کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔

بائبل کی تفسیر لکھنے کا مقصد

بائبل کی تفسیر لکھنے کی منشا سر سیّد نے خود اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو انھوں نے جان میوسن آرنلڈ کو لکھا تھا، انھوں نے اپنی کتاب ''قرآن اینڈ بائبل'' مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں یہ خط نقل کیا ہے، اس میں سر سیّد نے بند لفظوں میں ان کو سمجھایا ہے کہ مسلمان

[۱] خطبات گارسن وتاسی جلد ۲ ص ۲۰۱، ۲۰۲، اردو ترجمہ تصحیح ونظر ثانی ڈاکٹر حمید اللہ مقیم پیرس شائع کردہ پاکستان۔

عیسائیوں کے لٹریچر کو غلط، مہمل اور لغو سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نہیں پڑھتے اور پادریوں کو مسلمانوں میں عیسائیت کو پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس لئے ان کو کامیابی نہیں ملتی ہے، میں نے یہ تفسیر لکھ کر مسلمانوں کے اس ذہن کو بدلنے کی کوشش کی ہے، حالی نے اس خط کا جو اقتباس دیا ہے میں وہی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

''وہ جان میوسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی، خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباء واجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بے کار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے، ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بُرے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا[1]۔''

سرسیّد کہتے ہیں کہ پادریوں کو اپنے مذہب کے حق ہونے پر دلائل پیش کرنے کا سلیقہ نہیں اس وجہ سے ان کی ساری جدوجہد رائیگاں جارہی ہے اور مسلمان ان کو خاطر میں نہیں لاتے، سرسیّد بائبل کی تفسیر لکھ کر پادریوں کو مسلمانوں میں تبلیغ عیسائیت کا طریقہ اور سلیقہ بتاتے ہیں سرسیّد کا جملہ ''کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا'' معنی خیز ہے اور آرنلڈ جیسے مشنری ذہن کے انسان کو بڑا اپیل کرنے والا بھی۔

تفسیر بائبل آرنلڈ کی نظر میں

جان میوس آرنلڈ نے سرسیّد کی تفسیر بائبل پڑھ کر جو نتیجہ نکالا وہ ہے کہ سرسیّد نے

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۶۔

عیسائیوں پر عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے مشنریوں پر اور ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو رعب داب، جبر اور طاقت کے بل پر عیسائی بنانے والوں پر اور ساری دنیا کے مشنریوں پر یہ کتاب لکھ کر زبردست احسان کیا ہے اور اب عیسائیت کو حق اور اسلام کو باطل اور قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا سرسیّد کی اس کتاب کی وجہ سے آسان ہو گیا ہے[1]۔

حالی نے آرنلڈ کا آخری جملہ ''قرآن کو جھوٹا ثابت کرنا آسان ہو گیا'' نقل کر کے آرنلڈ کا مذاق اڑایا ہے اور کہا کہ معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے؟ یعنی یہ حقیقت نہیں، یاد رہے کہ حالی ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی تحریروں میں انگریزوں کے اقوال اتنی اہمیت و عقیدت کے ساتھ نقل کرتے ہیں جیسے وہ وحی اور الہام ہو اور اس کو اتنا مستند بنا کر پیش کرتے ہیں کہ اب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، وہ آنکھ بند کر کے مستشرقین اور علماء یورپ کے اقوال کو بطور سند ہمیشہ نقل کرتے آئے ہیں اگر آپ چاہیں تو مقدمہ شعر و شاعری سے ان کی ایک پوری فہرست نقل کر سکتے ہیں لیکن آرنلڈ جیسا مصنف جب اپنی کتاب ''قرآن اور بائبل'' میں سرسیّد کی کتاب پر اپنا تأثر لکھتا ہے تو وہی حالی آرنلڈ کا مذاق اڑاتے ہیں، اس لئے کہ اس سے سرسیّد پر پڑی ہوئی نقاب سرکتی ہوئی نظر آتی ہے اور ان کی قدر و قیمت گھٹنے لگتی ہے، مگر اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی، سرسیّد کی کتاب پڑھ کر آرنلڈ نے جو تأثر لیا، یقیناً کتاب سے کتاب کے پڑھنے والے وہی تأثر لیں گے جو آرنلڈ نے لیا ہے، آپ آج مستشرقین اور علماء یورپ کو اتنا احمق کیوں سمجھنے لگے ہیں جب کہ کل ان کی ہر بات آپ کے لئے سند تھی۔

زہر یا تریاق؟

سرسیّد نے بائبل کی تفسیر لکھ کر مسلمانوں کو بغلی گھونسہ مارا ہے، خواجہ حالؔی اسے اسلام کی خدمت سے تعبیر کرتے ہیں، زہر کو تریاق کا نام دینا حالی کے لئے زیبا نہ تھا، شاید یہ ان کی مجبوری تھی، مگر ایک خالی الذہن انسان جو دوستی و دشمنی کے حدود سے باہر

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۱۱۹۔

ہے جو سچائی ہے جو حقیقت ہے وہی تسلیم کرے گا، بائبل کی تفسیر لکھ کر سرسیّد نے اپنے محفوظات ذہنی کو آشکارا کر دیا ہے، یہ ہے سرسیّد کا وہ کارنامہ جن کو مجتہد عصر اور مجدد وقت کہا جاتا ہے بلکہ ولی، قطب اور ابدال اور جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، حالؔی بھی سرسیّد کو اسی بلند مقام پر فائز دیکھتے ہیں جیسا کہ اپنی کتاب میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہم سرسیّد کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ واہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں، بلاشبہ وہ آخر عمر میں بہ سبب فربہی مفرط اور کبرسن کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے[1]۔''

حالی کو متضاد باتیں کہنے میں جیسے کوئی جھجک نہیں، ان کے نزدیک نماز روزے کی پابندی نہ ہونے کے باوجود کوئی شخص عام مشائخ اور اہل اللہ سے بلند مقام پر فائز ہوسکتا ہے، معلوم نہیں ان کے پاس وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر سرسیّد کی ولایت وقطبیت کو پرکھتے ہیں اور اس طرح وہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کا مذاق اڑاتے ہیں، سرسیّد صاحب جیسے ولی کامل اور خواجہ حالؔی جیسے معتقد ؎

ہم چنیں مکتب وہمیں مُلا ۞ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

سر ولیم میور کا جواب

کچھ لوگ میرے اس انکشاف پر سرسیّد کی بعض دوسری تصنیفات کو پیش کریں گے جیسے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب یا خطبات احمدیہ ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام کا درد ان کے سینہ میں نہیں تھا تو وہ یہ کتابیں کیوں لکھتے؟

اس سلسلہ میں مختصر بات یہ ہے کہ میں نے سر ولیم میور کی ''لائف آف محمدؐ'' نہ پڑھی ہے نہ دیکھی ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں اور وہ بھی اُردو زبان میں اس کتاب کے جواب کی ضرورت تھی یا نہیں، سر ولیم میور کی کتاب انگریزی میں ہے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے شاید دو چار نے اس کتاب کو پڑھا ہو،

---

[1] حیات جاوید از حالی ص ۵۲۲۔

ان کی کتاب سے اسلامی ہند کے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے گا اس کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا اور اسلام سے بدگمان ہو کر عیسائیت قبول کرنے کا اندیشہ تو قطعاً نہیں تھا حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا اس لئے مسلمانوں نے اس کے جواب کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور بعد کے زمانہ نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں نے اس فضول کام میں اپنی انرجی ضائع نہیں کی یہ ان کی دانشمندی تھی۔

سر سیّد نے جواب لکھا؟ میں مسلسل کہتا آ رہا ہوں کہ سر سیّد بہت ذہین اور زمانہ کے نبض شناس اور مسلمانوں کی نفسیات سے آگاہ تھے، اب دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں نے عیسائیت کے خلاف اپنی مہم تیز کر دی ہے اور مناظرہ اکبر آباد کے بعد ان کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی توجہ ادھر سے ہٹانے کے لئے انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب کی اہمیت بتا کر اس کا جواب لکھنے کا اعلان کرایا، سر سیّد کے اس کام کی مثال ٹھیک اس معالج اور ڈاکٹر کی ہے کہ آدمی کہ شہ رگ کٹ گئی ہے اور اس کے جسم کا خون اتنی روانی سے جاری ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں پڑ چکی ہے، اس کا خون روکنے اور علاج کرنے اور اس کی جان بچانے کے زود اثر علاج کے بجائے اس کے ہاتھ میں چبھ جانے والی سوئی کے زخم کے علاج پر پوری توجہ صرف کر رہا ہے اور بہتے ہوئے خون سے صرف نظر کر رہا ہے جو جلد ہی اسے موت کی آغوش میں لے جانے والا ہے، سر سیّد بھی اسی معالج کا کردار ادا کر رہے تھے، وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے اس جبر کو دیکھ رہے تھے جو عیسائیت کے پھیلانے میں حکومت کے عہدیدار اختیار کر رہے تھے، خود ان کی تحریروں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں ایک مقام پر کہتے ہیں:

> ''کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو کیا ہندو کیا مسلمان عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لا ڈالے[1]۔''

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۵۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسیّد نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ حکومت کی شکایت کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے ہندوستان کے ماحول اور فضا میں وہ طریقہ کار مناسب نہیں ہے، کام کی مخالفت نہیں، طریقہ کار کی شکایت تھی، پورا ہندوستان عیسائی ہو جائے اس سے سرسیّد کو کوئی سروکار نہ تھا صرف انداز تبلیغ کی مخالفت کر رہے تھے جس سے ملک میں انتشار اور بے چینی بڑھ رہی تھی، انھوں نے اسی رسالہ میں اپنے اس واقعہ کو بھی لکھ دیا ہے جو یتیموں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کیئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے نمونے گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اسی طرح مفلس اور محتاج کر کرا اپنے مذہب میں لے آئیں گے[۱]۔''

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری افسران تبلیغ عیسائیت میں دلچسپی لیتے ہیں اور پادریوں کو مدد پہنچاتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کر رکھا ہے، گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زا جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت روپیہ دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں، بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے ہیں کہ ہماری کوٹھی پر ان کے پادری کا وعظ سنو[۲]۔''

پادریوں کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے اسی رسالہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ:

''(پادری صاحبان) غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ گاہ، میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا، بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا چپراسی جانے لگا[۳]۔''

۱؎ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔

۲؎ حوالہ مذکور۔

۳؎ رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۶۔

کلکتہ کے لاٹ پادری کی چٹھی جس نے پورے ملک میں زلزلہ ڈال دیا تھا سرسیّد اس سے خوب واقف تھے اور جو اس کا ردعمل ہوا اس سے بھی آگاہ تھے، انھوں نے عیسائیت کی چیرہ دستیوں کی صحیح تصویر کشی کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہئے اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ، میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اور ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بے شک یہ سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں آپس میں ہندوستانی لوگ اہل کاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی چٹھی آئی؟ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے، ان چٹھیوں نے یہاں تک ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی، لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آجائے گی کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو؟ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں[۱]۔''

ایسے ماحول اور ان حالات میں سرسیّد بائبل کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور اس کی غیر محرف ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ انجیل قرآن

---

[۱] رسالہ اسباب بغاوت ہند ضمیمہ حیات جاوید از حالی ترقی اردو بورڈ ایڈیشن ص ۸۱۷، ۸۱۸۔

وحدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور سر ولیم میور کی انگریزی کتاب کا اردو میں جواب لکھ رہے ہیں، اسلام پر یورپ کے لوگ انگریزی میں پڑھیں اور سر سیّد کی کتاب اردو میں ہندوستان کے لوگ پڑھیں، سر سیّد بحیثیت سرکاری ملازم ہونے کے یہ بھی جانتے تھے کہ جن لوگوں نے اکبر آباد مناظرہ میں یورپ کے مایہ ناز پادری کو مجمع عام میں شکست دی تھی ان سے انتقام لینے کے لئے ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے نام وارنٹ جاری کیا گیا، گھوڑ سوار پولیس ان کی گرفتاری کے لئے بھیجی گئی، اور پھر کس طرح اور کتنی مصیبتوں سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں مکہ پہنچے؟ یہ بڑی ہی دردناک کہانی ہے، مکہ مکرمہ میں بھی گرفتاری کی کوشش کی گئی مگر خدا نے بچالیا[1] ان دونوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ انھوں نے پادریوں سے مناظرہ کرکے ان کو ذلت آمیز شکست دی تھی اور حکومت کے منصوبہ کی راہ میں سد سکندری کھڑی کردی تھی، یہ تھا تبلیغ عیسائیت کے سلسلہ میں ہندوستانیوں پر جبر وستم، حکومت کا ہر عہدہ دار چنگیز و ہلاکو بنا ہوا تھا ایسے حالات میں سر سیّد مسلسل کتابیں لکھ رہے ہیں، رسالے، مضامین اور مقالات تہذیبُ الاخلاق میں شائع کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عیسائیت کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو؟

سر سیّد کی دیگر تصانیف

حالی نہ لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی اور آگرہ میں مشنریوں کے کاروبار پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثہ ہونے لگے اس وقت سر سیّد کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے جوابات لکھے جائیں، سر سیّد اور مشنریوں کا جواب؟ حالی نے لکھا ہے کہ ''تبیین کلام'' اسی مقصد سے لکھی گئی، یہ پڑھ کر انتہائی حیرت ہوئی، اس میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات کے بجائے لوگوں کو خود سر سیّد کے ایمان میں شبہ ہونے لگا جیسا کہ سر سیّد کے نام سیّد مہدی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ''تحریک آزادی اور مسلمان''، ناشر دار المؤلفین دیوبند ص ۷۷ و ۹۱۔

علی خاں نے غصہ میں بھرے ہوئے خط میں لکھا ہے[۱]۔ اس کتاب کا مشنریوں کے جواب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، لکھی بھی تو بائبل کی تفسیر لکھی جس میں عیسائیوں کو عیسائیت کے حق ہونے کو ثابت کرنا آسان ہوگیا، سرسیّد اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی میں سچے تھے تو تفسیر کے بجائے وہی کتاب لکھ کر مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ دیتے تو شاید ان کا زخم کچھ مندمل ہو جاتا، حالی نے مشنریوں کے جواب کی بات سرسیّد کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے یوں ہی کہہ دی ہے۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

عیسائیت ناکام ہوگئی

ہندوستان میں عیسائیت جس لاؤلشکر کے ساتھ آئی تھی اور جس جبر وتشدد سے کام لے کر انگریزوں اور مشنریوں نے مذہبی حیثیت سے بھی ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوا، یہ صرف مسلمانوں کی سخت جانی تھی کہ اپنی ساری مظلومیت کے باوجود انھوں نے عیسائیت کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کی سرزمین سے اس کو ذلیل ورسوا کر کے شہر بدر کر دیا، سرسیّد نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کی ہرامکانی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے ان کی کوششوں کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا، اور اپنی زندگی ہی میں ان کو اپنی ناکامی کا بار بار تجربہ ہوتا رہا اس مسلسل ناکامی اور شکست نے ان میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی اور اس کا غصہ انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھ کر اتارا اور تیرہ صدیوں کے علماء اور مفسرین کے کارناموں پر انگریزی برش سے سیاہی پھیر دینے کی کوشش کی لیکن جب حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، جب ذہن پر ناکامیوں کی مسلسل ضرب پڑتی ہے تو کُند ہوجاتا ہے، اس کی قوت برداشت تو ضرور بڑھ جاتی ہے لیکن ذہن ٹھس ہوجاتا ہے، اور ذہانت وفطانت اور تدبر وفراست کی بجلی جو اس میں کارفرما رہتی ہے وہ رخصت ہوجاتی ہے، سرسیّد بھی تفسیر قرآن میں اسی کیفیت سے

---

[۱] حیات جاوید از حالی ص۵۳۳،۵۳۴۔

دو چار رہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تفسیر کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے، کیونکہ جہاں تک وہ اس راہ میں چلے وہ صراط مستقیم سے اتنا منحرف ہو چکے تھے کہ پھر ان کا اسلام کے صراط مستقیم پر لوٹ کر آنا ناممکن ہو گیا تھا، اس لئے انھوں نے راہ کی سختیوں سے چور ہو کر راستے ہی میں رختِ سفر اتار دیا اور سفر آخرت اختیار کر لیا۔

تفسیر احمدی

یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ اپنی دو ایک نسلوں کے لئے معاش اور اعزاز و افتخار کے وسائل فراہم کر جائے اور خود اپنا دامن زادِ آخرت سے خالی رہ جائے اور وہ بھی اس حال میں کہ ساری دنیا کی لعنت و فضیحت کا سامنا کرنا پڑے، لوگوں میں اس کی عظمت و احترام کے بجائے اس کو قومی دشمن، مذہب مخالف، اور اسلامی تہذیب و تمدن کو ڈائنامیٹ کرنے والا تصور کیا جانے لگے، ایسے حالات میں اس نے اپنی چند روزہ زندگی کے لئے دنیاوی عیش و عشرت کے لئے کچھ ''متاع کاسد'' حاصل کر لی تو یہ اس کی کامیابی نہیں، ناکامی ہے۔

سر سیّد نے ساری زندگی انگریزی حکومت سے مکمل اور بلا شرط اور بے لچک وفاداری کے ساتھ گذاری اور حکومت کے معتمد علیہ بن گئے، دنیاوی اعتبار سے یہ ان کی بہت بڑی کامیابی ہے اگرچہ پوری ہندوستانی قوم کے جذبات انگریزی حکومت اور ان کے ہم نواؤں کے خلاف رہے، سر سیّد عیسائیت کے فروغ میں تعاون دے کر مسلمانوں کی نگاہوں سے گر گئے اور پھر یورپین تہذیب کی مسلمانوں میں اشاعت کے لئے انھوں نے قرآن کو استعمال کرنا شروع کر دیا تو پوری ملت اسلامیہ کے سینے غم و غصہ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گئے، کیونکہ انھوں نے اپنے تمام خود ساختہ نظریوں کی صداقت ثابت کرنے کے لئے بلا جھجک آیات قرآنی کو استعمال کرنا شروع کر دیا، یہ بات دیندار مسلمانوں کے حلقے میں ناقابلِ برداشت ہو گئی، اس لئے اس کا ردعمل ہوا اور بہت ہی سخت ردعمل ہوا، ان کے خلاف فتوے مرتب ہوئے اور عرب و ہند کے

مفتیوں نے بڑے سخت لب ولہجہ میں اظہار خیال کیا جیسا کہ حالؔی نے لکھا ہے[1]، چونکہ یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے اس لئے میں اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔

تفسیر احمدی کے کچھ نمونے

یہ تفسیر سر سیّد نے ہر طرح کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھی ہے اس لئے جمہور امت اور ملت اسلامیہ کے متفقہ عقائد، نقطۂ نگاہ، جذبات وخیالات اور مستند مفسرین کی تصریحات کے خلاف ہے، سر سیّد نے زیادہ تر اپنی عقل، سوجھ بوجھ، غور وفکر اور من مانی توجیہہ وتاویل پر بھروسہ کیا ہے بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انھوں نے خود ایک نظریہ بنالیا اور اس کی روشنی میں تفسیر لکھنے لگے اور آیات کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریئے کی تائید میں اس کو پیش کر دیا۔

مستند علماء نے ان کی تفسیر کے رد میں مستقل کتابیں لکھی ہیں مولانا محمد علی بچھرایوبی جو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہمراہ مباحثہ شاہجہانپور میں شریک ہوئے تھے انھوں نے اس کے رد میں ''البرہان'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے مولانا عبدالحق حقانی نے اپنی تفسیر کے ضخیم مقدمہ میں مفصل تبصرہ وتنقید کی ہے، حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ان ہفوات کی ایک مفصل فہرست مرتب کر دی ہے میں اسی فہرست کا تھوڑا سا حصہ پیش کرتا ہوں، آپ خود اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کریں، آپ کا ایمان آپ کا ضمیر کیا فیصلہ کرتا ہے، میں نہ مفتی ہوں نہ فتویٰ دینا میرا مشغلہ ہے، آپ کے ایمان اور آپ کے ضمیر کے فیصلے کے لئے بلا اظہار رائے اور بلا تبصرہ پیش کرتا ہوں، تو دانی حساب کم وبیش را۔

حضرت آدم، ملائکہ اور ابلیس کا قصہ فرضی ہے اور صرف تمثیل ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ (تفسیر احمدی ج ا ص ۵۲ تا ۶۹، مطبوعہ مفید عام آگرہ)

جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں نہ اس کا کوئی وجود خارجی ہے۔ (تفسیر احمدی

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات جاوید از حالی ص ۵۴۱ سے ۵۵۷ تک۔

مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ ج ا ص ۱۰)

نامۂ اعمال کا لکھنا، کراماً کاتبین کا مقرر ہونا، اعمال کا تولا جانا ایک افسانہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۳ ص ۱۰۲، ج ۶ ص ۴۲)

روزہ رکھنا سب پر فرض نہیں جس کا جی چاہے روزہ رکھے جس کا جی چاہے فدیہ دے کر خود کھائے پیئے چاہے جوان ہو یا بوڑھا۔ (ج ا ص ۲۲۸)

فرشتوں کا کوئی وجود نہیں، جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل نام فرضی ہیں۔ (ج ا ص ۶ ۴ و ۱۴۲ تا ۱۵۴، ج ۳ ص ۴۷)

شیطان یا ابلیس صرف ایک افسانہ ہے اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں۔ (ج ا ص ۴۷ تا ۵۲)

قیامت میں صور کا پھونکا جانا اس کی کوئی اصلیت نہیں، صور کوئی چیز نہیں۔ (ج ۳ ص ۵۴)

انبیاء کے معجزات کی کوئی حقیقت نہیں، معجزات بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ (ج ا ص ۷۱، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ج ۲ ص ۲۹)

موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریائے نیل میں راستہ بن جانا بے حقیقت ہے۔ (ج ا ص ۷۱ تا ۱۰۰)

موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ا ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)

رفعنا فوقکم الطور میں جو پہاڑ کا سر پر اٹھائے جانے کی تفسیر احمقانہ ہے یہ بے بنیاد بات ہے۔ (ج ا ص ۱۱۵)

فکونوا قردۃ خاسئین، اصحاب سبت کی صورتوں کا مسخ ہو جانا غلط اور بے حقیقت ہے۔ (ج ا ص ۱۱۷ تا ۱۱۹)

قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا حکم الٰہی نہیں ہے۔ (ج ا ص ۱۸۶ تا ۱۹۴)

شہیدوں کا زندہ رہنا صحیح نہیں ہے۔ (ج ا ص ۱۹۸)

حجر اسود کا بوسہ ثواب کا کام نہیں، حج میں ننگے سر ننگے بدن رہنا لغو ہے۔ (ج ا ص ۲۴۸ تا ۲۵۷)

سود کی بہت سی قسمیں جائز ہیں. جب کہ شریعت میں حرام ہیں۔ (ج ا ص ۲۹۸ تا ۳۱۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے، یہ غلط خیال ہے۔ (ج ۲ ص ۲۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا صحیح نہیں ہے۔ (ج ۲ ص ۲۴)

گردن مروڑی ہوئی چڑیوں کا کھانا حلال ہے۔ (ج ۲ ص ۱۸)

چور کا ہاتھ کاٹنا وحشیانہ سزا ہے اگر قید کا انتظام ہے تو ہاتھ کاٹنا جائز نہیں۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

غیر مسلم کی حکومت میں رہ کر شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا جائز نہیں حکومت کے قانون کے مطابق فیصلہ واجب ہے۔ (ج ۲ ص ۲۰۷)

حشر ونشر کی کوئی حقیقت نہیں۔ (ج ۲ مطبوعہ انسٹیٹیوٹ پریس علی گڈھ ص ۱۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا اور ید بیضا کا معجزہ صرف تخیل کا کرشمہ تھا۔ (ج ۳ ص ۲۲۲)

اصحاف کہف کا صدیوں تک غار میں سونا یہ غلط ہے۔ (ج ٦ ص ۱۵)

محشر میں شفاعت اور شفاعت کی اجازت اس کی کوئی حقیقت نہیں[1]۔ (ج ٦ ص ۱۴۰، ۱۴۱)

قرآن خدا کا کلام نہیں

قرآن جس کو ہم خدا کا کلام کہتے ہیں سر سیّد اس کو تسلیم نہیں کرتے، سر سیّد کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''جس طرح سونے کی حالت میں تعلقات ظاہری منقطع ہوجاتے ہیں اور جس میں انسان کو انہماک ہے وہی خیالات مجسم صورت میں انسان کو دکھائی دیتے ہیں، وہی حالت انسان پر بیداری میں حالت استغراق اور انہماک میں طاری

[1] امداد الفتاویٰ جلد ششم مرتبہ مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند شائع کردہ مکتبہ دار العلوم کراچی ص ۲۸۷ تا ۲۹۷

ہوتی ہے اور بیداری میں بھی اسی طرح سب چیزیں اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے جیسے کہ حالت خواب میں دیکھتا ہے وہ بن آواز دینے والے کے سنتا ہے، بغیر کسی موجود فی الخارج کے موجود فی الخارج دیکھتا ہے، بغیر کسی موجود ہونے، کسی بات کہنے والے کے ایک وجود کو متکلم پاتا ہے، چونکہ ذات پاک انبیاء کی بہت زیادہ مقدس اور منہمک فی اللہ اور فی صفات اللہ ہوتی ہے ان کو کامل استغراق فی ذات اللہ اور فی صفات للہ ہوتی ہے اسی استغراق اور انہاک کے سبب کبھی بغیر آواز کرنے والے کے آواز سنتے ہیں اور بغیر کسی موجود کے ایک موجود کو پاتے ہیں جو ان سے اور وہ ان سے کلام کرتے ہیں اسی حالت کے واقعات ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے، مجھ سے بات کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو یاد کر لیتا ہوں[1]۔''

یعنی نہ کوئی وحی لانے والا ہے نہ کوئی بھیجنے والا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں جو خیالات ہیں حالتِ استغراق میں وہی الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں خارج میں کچھ نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ سارا قرآن اسی طرح مرتب ہوا ہوگا تو پھر اس کو خدا کا کلام کہنا کیسے درست ہوگا۔ حضورؐ کے استغراق وانہاک کی حالت میں جو باتیں زبان مبارک سے نکلیں وہی وحی ہے، وہی قرآن ہے، گویا سرسیّد کے نزدیک نبوت نعوذ باللہ جنون اور پاگل پن کی قسم ہے، اس کے بعد کوئی تبصرہ فضول ہے، ان حقائق کے بعد بھی اگر کوئی شخص سرسیّد کو مسلمانوں کا مسیحا کہتا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ شخص پتھر کو بھی خدا مان سکتا ہے۔''

---

[1] تہذیب الاخلاق ج ۲ شمارہ نمبر ۳ دور سوم بحوالہ مقالات سرسیّد از مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

فکر فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی اردو تفسیر ''تدبیر قرآن'' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآنیات سے متعلق فکر فراہی کا یہ عملی ظہور ہے، مولانا اصلاحی نے اپنے استاذ مولانا حمید اللہ فراہی کے نظریات وخیالات کی روشنی میں یہ تفسیر مرتب کی ہے، ان کے تمام علمی افادات وکمالات اور ان کی فکری خصوصیات کو اس تفسیر میں ملحوظ رکھا ہے، مولانا فراہی جو اس مکتبۂ فکر کی ورح رواں ہیں، ان کے درسی افادات نے مولانا اصلاحی کے ذہن وفکر کو کتنی جلا بخشی ہے اس کا پتہ مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے جانے والے ان مضامین سے چلتا ہے جو ایک معیاری رسالہ ''علوم القرآن'' علی گڈھ کے مولانا امین اصلاحی نمبر شائع ہوئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فکر فراہی کیا ہے؟ اس کی خصوصیات وامتیازات کیا ہیں؟ پھر یہ بھی سوال ہے کہ مولانا فراہی کے ذہن کا یہ خودرو پودا ہے یا اس کی جڑیں کسی دوسرے ذہن میں ہیں؟ اور فکر فراہی میں صرف اس کے برگ وبار اور پھول پتیاں ہیں، اس کی تلاش کے لئے ہمیں مولانا فراہی کے حالات زندگی اور علمی وعملی سرگرمیوں کی سرزمین میں چلنا ہوگا۔

مولانا فراہی کی مختلف مقامات پر ملازمت، سرسیّد کے دربار میں باریابی، ان کے حکم سے ایک بڑے انگریز افسر کے جذبات کی ترجمانی وہم نوائی، عرب ملکوں میں اس کی وکالت کرتے ہوئے ہم ان کو پاتے ہیں، پھر مولانا فراہی کا علی گڈھ میں قیام کا زمانہ ہے جب سرسیّد اپنی تفسیر احمدی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دے رہے تھے اور وہ سرسیّد کے ماتحت کام کررہے تھے، اگرچہ بعد کے دور میں انھوں نے سرسیّد کے افکار وخیالات پر اپنی تحریروں میں کہیں کہیں برہمی کا اظہار کیا ہے اور تیز وتند جملے لکھے ہیں لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے اور دلائل وشواہد کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ ان کے ذہن وفکر پر سرسیّد کا جادو چل چکا تھا وہ غیر اختیاری طور پر مسمریزم کے معمول کی طرح اسی راہ پر

چلتے رہے جس پر سرسیّد کے سحر نے ان کو ڈال دیا تھا یہاں تک کہ خود ان کو اپنی اثر پذیری کا احساس تک نہیں تھا، یہ تمام حالات مولانا فراہی کو شکوک وشبہات کے دائرے میں ضرور لاتے ہیں لیکن ان پر یقین کرنا صحیح نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ بدگمانی ہو اور ان بعض الظن اثم ہمارے سامنے ہے، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ سرسیّد انتہائی ذہین وفطین انسان تھے اسی کے ساتھ ضبط وتحمل میں ہمالیہ تھے وہ اعتراض اور نکتہ چینی سے کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے، وہ مثبت انداز میں غور وفکر کے قائل تھے، منفی رویہ کو دانشمندی کے خلاف تصور کرتے تھے، وہ اپنی بات مسلسل کہتے رہتے تھے، نکتہ چینی کرنے والوں کے ناک سکوڑنے، ابرو چڑھانے، اور ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو نہیں دیکھتے تھے اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو بات مسلسل کہی جائے گی وہ اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ بعض بہت ہی ذہین وفطین حضرات غیر محسوس طور پر ان سے متأثر ہوئے جب کہ بظاہر وہ سرسیّد کے مخالف تھے۔

سرسیّد احادیث کو قابل حجت نہیں سمجھتے تھے اور اپنی تفسیر میں بائبل پر تو اعتماد کرسکتے تھے لیکن روایات حدیث پر اعتماد نہیں کرتے تھے، مولانا فراہی سرسیّد کی بعض باتوں پر تنقید کرتے تھے مگر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، تفسیر قرآن میں احادیث وروایات سے اجتناب واحتراز سرسیّد ہی کے دبار کا عطیہ ہے جب کہ سرسیّد کے رویہ کے پس پردہ وہی انکار حدیث کا جذبہ کارفرما ہے، جاہلی ادب سے استناد، تفسیر بالرائے اور ذاتی ذہانت وفطانت کی مشعل ہاتھ میں لے کر خود ساختہ توجیہ وتاویل کرنا، قدیم مفسرین کا استخفاف، جگہ جگہ بائبل کے حوالے دینا، فہم قرآنی میں صحیح احادیث کو ترک کرکے توریت کو بطور شہادت پیش کرنا یہ ساری باتیں سرسیّد ہی کے دربار سے ان کو حاصل ہوئیں، بہت ممکن ہے فکر فراہی میں احادیث کی استنادی حیثیت بھی مشکوک ہو مگر یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں کیونکہ مولانا فراہی نے بہت کم لکھا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں ملتی اس لئے اس نقطۂ نگاہ کی کوئی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آئی، البتہ ان کے خصوصی شاگرد جو فکر فراہی کے وارث

وامین ہیں انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھا ہے اگر یہ سب کچھ فکر فراہی کے نقطۂ نگاہ، نظریات وخیالات کے سچے اور صحیح معنی میں وارث ہیں اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اصلاحی کی تحریریں فکر فراہی کی آئینہ دار ہیں اور اس آئینہ میں فکر فراہی کی بہت واضح تصویر اپنے تمام خدوخال کے ساتھ نظر آجائے گی، ہم اس نقطۂ نگاہ سے مولانا امین اصلاحی کے مضامین مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ فکر فراہی کی اصلی تصویر آپ کے سامنے آجائے مولانا اصلاحی کا شاندار کارنامہ قرآن کی تفسیر ''تدبر قرآن'' ہے، یہ ان کی پوری زندگی کی علمی سرگرمیوں کا حاصل ہے، اس اردو تفسیر میں انہوں نے فکر فراہی سے سر مونہ ہٹنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، اگرچہ ان میں کچھ لوگوں کو شک ہے، ان کے مداحوں اور نقادوں نے دونوں پہلوؤں پر زور قلم صرف کیا ہے، ان مضامین میں دونوں طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ان کے نقادوں نے مولانا اصلاحی کے ساتھ تھوڑی سی بے انصافی کی ہے، انہوں نے کہیں بھی دانستہ فکر فراہی سے انحراف نہیں کیا ہے، وہی آیتوں کی تفسیر وتاویل میں احادیث وروایات سے اجتناب واحتراز، وہی درایت کی کارفرمائی اور تفسیر بالرائے کی کوشش، جاہلی ادب عربی کی روشنی میں منشأ قرآنی کو سمجھنے کی جدوجہد، صحیح ترین احادیث وروایات کو نظرانداز کر کے مفہوم قرآنی کو عقل انسانی کے حدود میں لانے اور خدا کے کلام کو انسانی کلام کے اصولوں پر ڈھالنے کی محنت، بائبل کی روایتوں سے تطبیق واستدلال ہر جگہ پائی جاتی ہے، جو بظاہر فکر فراہی کی اصل روح ہے، اس سلسلہ میں مولانا اصلاحی اپنے استاد کے قدم سے قدم ملا کر چلے ہیں اور جہاں افادات فراہی میں ان کو کوئی روشنی نہیں ملی وہاں ذاتی اجتہاد کی مشعل ہاتھ میں لے کر راہ طے کی ہے، ہمارا خیال ہے کہ یہ اجتہاد بھی فکر فراہی کا ہی فیضان کرم ہے، اس لئے مولانا اصلاحی پر فکر فراہی سے انحراف کا الزام کچھ درست نہیں معلوم ہوتا، ہمارے نزدیک ''تدبر قرآن'' فکر فراہی کی مکمل آئینہ دار ہے، بظاہر ہر جگہ فکر فراہی کی تیز روشنی جھما جھم برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تفسیر قرآن کے بعد مولانا اصلاحی نے فن حدیث کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس کے بھی دستاویزی ثبوت علمی دنیا کے سامنے موجود ہیں، ان کے شاگردوں نے ان کے درس حدیث کی تقریروں کو کیسٹ سے انہیں کے لفظوں بلکہ انھیں کے لب ولہجہ میں قلمبند کر کے ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

رسالہ علوم القرآن علی گڈھ جو ایک معیاری ششماہی رسالہ ہے اس کے ''مولانا اصلاحی نمبر'' میں اصلاحی کی خدمت حدیث کا ریکارڈ موجود ہے، رسالہ معارف دارالمصنّفین اعظم گڈھ کے مدیر محترم نے ''مبادی تدبر حدیث'' کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کے علمی جواہر کو اس خریطہ سے نکال کر رسالہ معارف کے صفحات پر بکھیر دیا ہے جن کی چمک دمک، آب وتاب ایمان وعقیدہ کی آنکھوں کی روشنی کو سلب کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ان بیش بہا اور قیمتی جواہرات کے سامنے منکرین حدیث کے امام عبداللہ چکڑالوی، غلام احمد پرویز کتاب ''دو اسلام'' کا مصنف، رسالہ طلوع اسلام کے مقالہ نگار پانی بھریں منکرین حدیث کے سرخیل سرسیّد احمد خاں سر پیٹ کر رہ جائیں کہ یہ خزانہ ہمارے ہاتھ کیوں نہیں آیا۔

اس وقت ہمارے سامنے ''مبادی تدبر حدیث'' کا تو کوئی نسخہ نہیں ہے، البتہ علوم القرآن علی گڈھ کا مولانا اصلاحی نمبر اور رسالہ معارف اعظم گڈھ کا وہ شمارہ موجود ہے جس میں مبادی تدبر حدیث کا تعارف کرایا گیا ہے، ہم انھیں دونوں رسالوں کی مدد سے مولانا اصلاحی کی خدمت حدیث کے کچھ نمونے پیش کریں گے۔

مولانا اصلاحی کا مزاج یہ ہے کہ وہ محدثین کرام کا ذکر نہایت حقارت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے گاؤں کے کسی پٹی دار کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں جس سے ان کی اَن بن ہو، وہی سوقیانہ الفاظ اور بازاری لب ولہجہ استعمال کرتے ہیں جو آپسی اختلافات کے وقت ایک دوسرے کے بارے میں اختیار کیا جاتا ہے جب کہ پوری امت اسلامیہ چودہ سو سالوں سے جن کے نام انتہائی عقیدت واحترام سے لیتی ہے،

وہ ان محدثین کرام کو اپنی سطح سے ذرا بھی اونچا مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا دل ان مقدس، ہستیوں کے بغض وعناد سے بھرا ہوا ہے، شاید وہ یہ انداز بیان اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ ان محدثین کے مرتب کردہ احادیث کے مجموعوں کو لغو، خرافات کا مجموعہ اور ناقابل اعتبار ہونے کے لئے فضا تیار کی جائے اور مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ احادیث کی یہ تمام کتابیں ''طلسم ہوشربا'' اور ''فسانہ عجائب'' سے زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی ہیں، جھوٹ اور خرافات اور لغویات کا انبار ہیں، اس کے چند نمونے آپ خود ملاحظہ فرمائیں، کیسٹ کے ذریعہ مرتب کردہ ان کے درس حدیث کی تقریریں جو ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں اس کے صفحہ ۵۳۳ پر ان کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

> ''اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ میں ابن شہاب زہری موجود ہیں، یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں، وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعوں کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب زہری سے مروی ہیں، مگر اس کے باجود امام بخاری اور امام مالک نے ان کو سر پر بٹھایا ہے، یہ امت کے لئے بہت بڑا حادثہ ہے۔''

(بحوالہ رسالہ معارف اعظم گڈھ شمارہ اپریل ۲۰۰۱ء ص ۳۱۰)

گاؤں کے کسی بڑے آدمی کی اولاد سرکش ہو جاتی ہے اور باپ کچھ نہیں کہتا تو لوگ کہتے ہیں کہ بہت سر چڑھا رکھا ہے اس کا نتیجہ بھگتے گا اور اس کی اولاد بھی بھگتے گی سر چڑھانے والا مغرور بھی ہوتا ہے اور ناعاقبت اندیش بھی، مولانا اصلاحی کے نزدیک امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس صاحب مؤطا، اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ البخاری کے مرتب امام بخاری کی بھی وہی حیثیت ہے، یعنی دونوں احمق بھی ہیں اور ناعاقبت اندیش بھی حالانکہ امام مالک کی کتاب مؤطا کی اتنی اہمیت ہے کہ کچھ اکابر علماء اس کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں اس کتاب کے مرتب امام مالک کو مولانا اصلاحی بار بار صلواتیں سناتے ہیں ان کو فریبی اور جعل ساز ثابت کرنے کی ہر ممکن

کوشش کرتے ہیں، مبادی تدبر حدیث میں ان کا ملفوظ گرامی یوں نقل کیا گیا ہے:

''امام مالک چونکہ جرح وتعدیل میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اس لئے بڑے طنطنے سے کہتے ہیں کہ میں ان پر اعتماد کرتا ہوں۔'' (معارف ص ۳۰۸)

ضدی اور مغرور شخص اپنی طاقت کے زعم میں صریح غلط بات برملا کہتا ہے تو اس موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے طنطنے سے کہتا ہے بعض الفاظ اپنی ایک خاص تاثیر رکھتے ہیں اور قبیح مواقع پر استعمال کی وجہ سے اس کی معنویت ذہن میں نفرت وغصہ کی فضا بنا دیتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ پولس ظلم وزیادتی اور دھونس جما کر بے قصور لوگوں سے بھی رشوت لے لیتی ہے۔

مولانا اصلاحی اس طرح کے الفاظ کو بھی استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے بلکہ اپنی انا اور جوش تنقید کا مظاہر کرتے ہیں۔

امام مالک کے بارے میں نہایت دل آزار اور کریہ لفظوں میں کہتے ہیں:

''ایک متنازع فیہ شخصیت کے حق میں اس طرح کا اصرار امام صاحب کی بڑی زیادتی ہے زہری کا تشیع اور مرسل روایت کا ان کے پاس انبار ان کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ امام صاحب ان کے حق میں دھونس سے کام لیں''

مولانا اصلاحی نے ایک جگہ امام مالک کو دغاباز، فریبی اور جعلساز ثابت کرنے کی بھی جرأت دکھائی ہے، مؤطا میں امام مالک بعض روایتون کو راوی کا نام لئے بغیر بلغنی کے لفظ سے بیان کرتے ہیں، ایسی تمام روایتوں کو بلاغات امام مالک کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، مولانا اصلاحی کے الفاظ یہ ہیں:

''یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے اور ان کی اکثر بلاغات وہ ہیں جن کے پیچھے ابن شہاب زہری چھپے ہوئے ہیں، امام مالک ان سے حسن ظن رکھتے ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ ابن شہاب پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا ہے اس لئے ان کو اپنی بلاغات کے پردے میں چھپا لیتے تھے، یہ ابن شہاب کی شرارت ہے جس کا مقصد حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنا ہے'' (رسالہ معارف ص ۳۹۸)

محدثین کرام کو مولانا اصلاحی زہر فروش بتاتے ہیں یعنی ایسا زہر جو ایمان کو موت کی نیند سلا دے، آج تک محدثین کے بارے میں ایسا سخت جملہ پورے ذخیرہ اسلامیات میں کہیں نہیں ملتا، مولانا اصلاحی ایک موقعہ پر کہتے ہیں:

''گویا امام مالک سندوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بات کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے کہ سندوں میں لپیٹ کر نہ جانے کیا کیا زہر دیا جاتا ہے'' (معارف ص ۳۱۲)

اگرچہ اس میں تمام ذخیرۂ حدیث کو زہر کی پڑیا بتادیا گیا ہے لیکن تمام محدثین کے ساتھ امام مالک، امام بخاری سب اس زد میں آجاتے ہیں، گویا یہ سب زہر فروش ہیں، لیکن زہر چھپا کر بیچتے ہیں۔

مولانا اصلاحی صحیح بخاری کو وہ مقام نہیں دیتے جو پوری امت اسلامیہ نے دے رکھا ہے ان کے نزدیک بخاری میں بھی رطب و یابس بھرا ہوا ہے اس کی بہت سی روایتیں جھوٹی اور غلط ہیں قصوں کہانیوں کو بھی حدیث بنادیا گیا ہے اگرچہ مولانا اصلاحی کے پاس محدثین اور علماء جرح وتعدیل کے اصولوں کے مطابق کوئی دلیل نہیں ان کے نزدیک سچائی کی کسوٹی صرف ان کی اپنی عقل ہے ان کا ایک خصوصی شاگرد جو ان کے علوم و فکار کا سب سے بڑا مبلغ ہے اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''صحیح بخاری کی متعدد روایات کے متن کو قرآن کی کسوٹی پر رکھ کر مولانا نے قابل قبول نہیں گردانا ہے'' (علوم القرآن علی گڈھ مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۴)

مولانا اصلاحی کے اسی شاگرد رشید نے ان کے تفردات کی نشاندہی کرتے ہوئے صحیح بخاری کے سلسلہ میں یہ بتایا ہے:

''صحیح بخاری کے بالکل آغاز میں لائی گئی ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان مکالمہ پر مبنی روایت بلاوجہ لائی گئی ہے جب یہ حدیث نہیں تو حدیث کے مجموعہ میں یہ کیوں لکھی گئی'' (علوم القرآن ص ۲۶۷)

اس نے آگے چل کر مولانا اصلاحی کے نقطۂ نگاہ کے بارے میں ہمیں یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے:

''بخاری شریف کی چار مزید روایتوں کو پیش کر کے مولانا نے ان کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے'' (علوم القرآن ص ۲۶۷)

حدیث کی بے اعتباری ان کے دل میں ایسی جاگزیں معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی روایات کی مسلمہ حقیقتوں کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے اور بلا تامل اس کو ٹھکرا دیتے ہیں اور پوری ملت اسلامیہ کے ذہن ومزاج، ایمان واعتقاد، روایت کی شہرت واہمیت، تمام دنیائے اسلام کی تسلیم شدہ حقیقت کو بیک جنبش قلم رد کر دیتے ہیں اور اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لائق ثابت کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے مولانا اصلاحی کا تلمیذ خاص لکھتا ہے:

''اور غار حرا میں جبریل کی آمد اول کی حدیث کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر بالکل الگ ہے وہ سورہ علق کے انتہائی غضب آلود انداز بیان کی روشنی میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسی سورہ ابتدائی مکی دور میں نازل نہیں ہوسکتی تھی، سورہ کی پانچ ابتدائی آیتوں کو باقی سورہ سے الگ کرنے کی کوئی بنیاد بھی نہیں ہے''

(علوم القرآن ص ۲۶۶)

یعنی بخاری ومسلم اور تمام حدیثوں میں غار حرا میں پہلی وحی کی جو روایت ہے وہ جھوٹی ہے پھر اس کی انہوں نے ایک عقلی دلیل دی ہے فن حدیث کے اصولوں کے مطابق دوسری اور کوئی دلیل ان کے پاس نہیں، اس کے بعد اسی شاگرد رشید نے ایک اور اہم انکشاف کیا ہے جو تمام صحیح ترین روایتوں کے خلاف ہے وہ لکھتا ہے:

''مولانا کے نزدیک جبریل کی آمد وحی پہنچانے کے لئے تھی ہی نہیں''

(علوم القرآن ص ۲۶۶)

مولانا اصلاحی نے قیاسی گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی ہے اور وہ سرپٹ دوڑ رہا ہے شاگرد لکھتا ہے:

''مولانا کے نزدیک اقرأ باسم ربک کے الفاظ پا کر کسی راوی نے سورہ علق کی پانچ آیتوں کو پڑھ دیا اور ان کے پہلی وحی ہونے کا عقیدہ قائم ہو گیا''

(علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۷)

یعنی جبریل وحی لے کر نہیں آئے تھے اور نہ پیغام نبوت لے کر آئے تھے نہ آپ اس وقت نبی بنائے گئے بلکہ صرف کشتی لڑنے کے لئے آئے تھے اور کشتی لڑ کر واپس چلے گئے، نعوذ باللہ من ہذہ الخرفات۔ انکار حدیث کے سلسلہ میں مولانا اصلاحی کا ذہن ومزاج سمجھنے کے لئے اتنی مثالیں کافی ہیں، اب صرف ایک مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ پورے مجموعہ حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے تھے اس مقصد کے لئے وہ براہ راست بات نہیں کرتے بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ لوگ خود کہنے لگتے ہیں کہ ان حدیثوں کا کیا اعتبار ہے؟ ان کے دلوں میں خود یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ احادیث کا تمام ذخیرہ مجموعہ خرافات ہے۔

حدیث کے مشہور ترین راوی ابن شہاب زہری ہیں حدیث کی تمام کتابوں میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں کوئی مجموعۂ حدیث ان کی روایتوں سے خالی نہیں، انہیں ابن شہاب زہری کو وہ نشانہ بناتے ہیں اور بڑی دھوم دھام سے ان کے معائب، ان کی فریب کاریاں، جعلسازیاں، دین میں جھوٹی توہم پرستیاں بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ رافضیوں کے لئے روایتیں گھڑتے تھے اور اسلامی روایات وتعلیمات میں انہوں نے بہت سی خرافات بھر دی ہیں، مولانا اصلاحی اس سلسلہ میں اپنی سطح سے بہت نیچے اتر آئے ہیں سوقیانہ الفاظ، بازاری لب ولہجہ استعمال کرنے میں بھی کوئی باک نہیں سمجھتے جب کہ اپنے حلقہ میں وہ بہت بڑے عالم دین، حدیث وقرآن کے بہت بڑے واقف کار، حکومت الٰہیہ کے قیام کے مقدس ومطہر قائد اعظم سمجھے جاتے تھے اور اسلامیات کے سلسلہ میں وہ علم وتحقیق کے تخت طاؤس پر متمکن تھے جو ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا تھا لیکن جب وہ ابن شہاب زہری کا نام لیتے تھے تو شاید وہ محسوس کرتے تھے کہ میں اپنے گاؤں میں اپنے کھیت کی مینڈ پر بیٹھا ہوا ہوں اور مجھے وہ سب کچھ کہنے کا حق ہے جو مرے گاؤں کا کاشتکار کہتا ہے اور جن الفاظ اور لب ولہجہ کا استعمال کرتا ہے ان سب کا استحقاق مجھے حاصل ہے، اس لئے وہی الفاظ وہی لب ولہجہ ختیار کر لیتے ہیں جو کسی طرح ان کے عالمانہ وقار کے شایان شان نہیں، مولانا

اصلاحی کے شاگرد رشید نے لکھا:

''مؤطا اور بخاری کی اسناد پر بالعموم مولانا نے بحث نہیں کی، البتہ جن روایتوں کی سند میں محمد بن شہاب زہری یا ان کے شاگردوں کا نام آتا ہے وہاں مولانا بے حد محتاط ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں انھیں اس بات پر ابرام تھا کہ اگرچہ امام مالک اور بخاری دونوں زہری پر اعتماد کیا ہے اور ان سے روایتیں بہ کثرت لی ہیں تاہم یہ ایسے ثقہ راوی نہیں تھے کہ ان کی ہر روایت بے دھڑک ہو کر قبول کر لی جاتی، زہری ادارج کے ماہر تھے، انھوں نے متعدد روایات کو خلط ملط کر کے واقعہ افک کا افسانہ بنا دیا'' (علوم القرآن علی گڈھ مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۳)

مولانا اصلاحی نے امام زہری پر جو الزامات عائد کئے ہیں ان کے شاگرد نے یہ فہرست بھی پیش کر دی ہے وہ لکھتا ہے:

۱- وہ عوامی خرافات کو دین بنا کر روایتوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ (علوم القرآن ص ۲۶۴)

۲- وہ مرسل روایتوں کو موصول کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ (علوم القرآن ص ۲۶۴)

۳- وہ من موجی تھے، یہ بد معاشی ہے۔ (رسالہ معارف اپریل ۲۰۰۱ء ص ۳۱۳)

۴- وہ شیعیت کے لئے مہتم ہی نہیں تھے بلکہ اس کو دین بنانے کے لئے انہوں نے خاصا کام کیا ہے۔ (علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر ص ۲۶۴)

ابن شہاب زہری پر مولانا اصلاحی جو اس قدر برسے ہیں ان کا اس سے مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرۂ احادیث کی تمام کتابوں کی بنیاد ہلا دی جائے اور مجموعہائے حدیث کے خلاف بے اعتباری کی عام فضا بنا دی جائے، یہ صرف ایک راوی پر جرح نہیں، ہزاروں روایتوں کو مخدوش بنانے کی خفیہ کوشش ہے، میرے علم و مطالعہ کے مطابق صرف امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک ہزار دو سو انتیس مقامات پر امام زہری کے حوالے سے روایت کی ہے اور پوری بخاری میں یہ روایتیں پھیلی ہوئی ہیں

اسی طرح صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں زہری کی بے شمار روایتیں موجود ہیں اگر امام زہری کو جھوٹا بددین، جعلساز مان لیا جائے تو صحاح ستہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی ہے ان کی صحت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے جب ہزاروں روایتیں ناقابل اعتبار ہوگئیں تو پوری کتاب پر اعتبار کہاں باقی رہا، اس طرح مولانا اصلاحی نے بڑا زبردست وار کیا ہے ان کی تلوار کی زد سے کوئی محدث نہیں بچا، نہ کوئی حدیث کی کتاب محفوظ رہی، ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں منکرین حدیث کا علمی سلسلہ نسب جو سرسیّد خاں تک پہنچتا ہے مولانا اصلاحی کا شجرۂ نسب بھی بیک واسطہ سرسیّد سے جا ملتا ہے، وہی ان کے مورث اعلیٰ ہیں کیوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے انہوں نے ہی یہ فتنہ بویا ہے۔

تدبر قرآن، تدبر حدیث کے بعد مولانا اصلاحی نے تدبر تصوف پر بھی کام کیا ہے اگر چہ ان کی کتاب کا نام یہ نہیں بلکہ ''تزکیۂ نفس'' ہے لیکن بہر حال یہ بھی مولانا اصلاحی کا خصوصی تدبر ہے اس میں بھی انہوں نے پوری اسلامی تاریخ کا قیمہ بنا کر رکھ دیا ہے ان کے نزدیک جس طرح کی دینی سرگرمیوں کی پابندی اور ایک خاص طرح کا مذہبی نظام بنایا گیا اس کو بعد کے دور میں تصوف کا نام دے دیا گیا ان کا فیصلہ ہے کہ تصوف کا قرآن وحدیث بلکہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہ طریقہ قطعاً غیر اسلامی ہے اس طریقہ میں قرآن وحدیث کا کوئی دخل نہیں بلکہ دوسرے گمراہ مذاہب کی خرافات کا مجموعہ ہے اس طبقہ کے مشہور افراد جاہل تھے جو لوگ تصوف کے قائل تھے ان میں صرف غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کچھ پڑھے لکھے تھے، یہ ان کے الفاظ ہیں علوم القرآن مولانا اصلاحی نمبر میں ان کی کتاب تزکیۂ نفس کا تعارف موجود ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خانقاہ، زاویہ، بیعت وارشاد، تزکیۂ نفس، اولیاء اصفیاء کا جو اسلامی تاریخ میں ایک لمبا سلسلہ ہے یہ سب خرافات اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

مولانا اصلاحی کے علمی کارناموں کی اس تفصیل کو پیش کرنے کا مقصد یہ سمجھنا ہے کہ ان کے مداحوں نے جو بلند بانگ دعوے کئے ہیں ان کو ثریٰ سے اٹھا کر ثریا تک

پہنچا دیا ہے اسکی حقیقت کیا ہے؟ کیا انکے ذہن کی زرخیزی کا یہ ثمرہ ہے یا یہی فکر فراہی ہے کیوں کہ مولانا اصلاحی کو فکر فراہی کا ترجمان اور وارث وامین کہا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں کے آئینہ میں جو تصویر نظر آرہی ہے کیا وہ فکر فراہی کی اصل تصویر ہے؟ جب کہ ان کی تفسیر تدبر قرآن پر رسالہ تحقیقات اسلامی علی گڈھ جنوری ۲۰۰۱ء میں ایک محقق عالم کا تازہ ترین جائزہ شائع ہوا ہے جو ۳۰ صفحات بر مشتمل ہے اور کئی درجن آیتوں کی تاویلات پر گرفت کر کے آخر میں مقالہ نگار نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا ہے:

''یہ ایک انتہائی خطرناک بات ہے، اس طرح کی تاویل کو اگر جائز قرار دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں قرآن کا بھی وہی حشر ہو جائے جو اہل مغرب نے بائبل کا کر رکھا ہے'' (تحقیقات اسلامی ص ۵۰)

''تدبر حدیث'' میں مولانا اصلاحی کا جو رویہ ہے وہ منکرین حدیث سے ذرا بھی مختلف نہیں، اگر چہ صراحتاً انہوں نے کہیں نہیں کہا ہے کہ احادیث مجموعہ خرافات ہے لیکن ان کی عملی سرگرمیوں، ان کے حدیث کے درس اور محدثین پر ان کی جارحانہ تنقیدوں کا حاصل یہی ہے کہ احادیث اعتبار کے قابل نہیں، اوپر جو تفصیلات پیش کی گئیں ان کی روشنی میں کوئی بھی اہل علم اس کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک احادیث کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

تصوف، ارباب تصوف، اولیاء اصفیاء، ارشاد و تلقین، تزکیۂ نفس، بیعت ارشاد ان کے نزدیک شجر ممنوعہ ہی نہیں بلکہ اسلام دشمن طریقہ ہے ہمارے بہت محدود مطالعہ میں مولانا فراہی کے قلم سے کہیں یہ خرافات نہیں لکھی ہیں نہ اس طرح کے خیالات کا انہوں نے کبھی اظہار کیا ہے، ہمارے نزدیک مولانا اصلاحی کے ذہن وفکر کی زمین کا خودرو پودا ہے جس میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہیں اگر سچی بات یہی ہے تو فکر فراہی سے ہمارا حسن ظن اب بھی قائم ہے کیوں کہ براہ راست مولانا فراہی کی تحریروں کا یہاں کوئی ذکر نہیں اس لئے براہ راست فکر فراہی سے بدگمانی قطعاً جائز نہیں، لیکن

اگر کچھ لوگوں کو اصرار ہے کہ مولانا امین اصلاحی فکر فراہی کے ترجمان، اس کے وارث وامین ہیں ان کی ساری علمی و دینی سرگرمیاں اسی فکر فراہی کی روشنی میں ہیں تو فکر فراہی سے دور کا سلام ہے، اور سو بار سلام ہے۔

آخر میں دل کے پورے درد کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ڈیڑھ سو سالوں سے اسلام کی تصویر بگاڑنے کی کوشش جاری ہے اور اب بات یہاں تک پہنچی ہے کہ مسلمانوں کی اولاد یورپین یونیورسٹیوں میں جاکر ''قرآن محمد کی تصنیف ہے'' جیسے موضوع پر تحقیق کرکے پی ،ایچ،ڈی کرنے لگے ہیں، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں جاکر احادیث کو مجموعہ خرافات کا دعویٰ کرنے والے مستشرقین کی رہنمائی میں اپنی تھیسیس لکھتے ہیں اور سند حاصل کرکے ہندوستان آتے ہیں اور اہم عہدوں پر فائز ہوکر مسلمان نسل کو ذہنی وفکری ارتداد میں مبتلا کرتے ہیں اور اسلام کی صورت مسخ کرتے ہیں اور اس تجدد پسند، روشن خیال اور مغرب پرست طبقہ کی زد میں اسلام ہے اہل علم اس کی مدافعت میں جو کچھ کرسکتے ہیں، کرتے ہیں لیکن ان کا وار اسلام کے کسی نہ کسی پہلو پر ہوتا رہتا ہے دوسری طرف جو لوگ حدیث وقرآن کے عالم کہے جاتے ہیں، رفتار زمانہ پر نظر رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور حکومت الٰہیہ قائم ہونے کی بات کرتے ہیں اور اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ پیش کرنے کے مدعی ہیں ان کا حال یہ ہے کہ اسلام کی ظاہری جسم کے بجائے اندرونی جسم کے آپریشن میں مصروف ہیں اور اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں دین سے بغاوت اور شک وارتیاب کے جراثیم بھر رہے ہیں، سیدھے سادے مسلمان آخر کس کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھیں خدا ہی سے فریاد ہے۔ ؎

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

احادیث کا ادبی مقام و مرتبہ

ادب کی چاہے جو تعریف کی جائے، اس کا جو بھی معیار اور جیسی بھی کسوٹی مقرر کی جائے احادیث اس معیار اور کسوٹی پر کھرا سونا ثابت ہوں گی، لیکن میرے نزدیک اس طرز فکر سے احادیث کی ادبی شان کی عظمت اور ادبی شاہکار ہونے کا احساس مدھم ہو جاتا ہے، میرا ایمان مجھے اس خیال سے روکتا ہے، میری والہانہ عقیدت و شیفتگی میرے رہوار فکر کی لگام کھینچ کر یہ کہتی ہے کہ تمہاری سمت ِسفر صحیح نہیں ہے، کلام رسول یا احادیث خود ادب عالیہ کی کسوٹی ہیں اور عربی ادب کا ایسا معیار ہیں کہ جس پر عام انسانوں کے ادبی شاہکاروں کو پرکھنا جانچنا چاہیے دوسرے نمونوں کو سامنے رکھ کر کلام رسول میں ادبی پہلوؤں کو ڈھونڈنا عقل و فکر کی گستاخی اور دلیل کم نظری ہے، کلام رسول دنیائے ادب کا شاہکار ہی نہیں، ادبی دنیا کا معجزہ ہے۔

احادیث کی شان امتیاز

آج ہمارے سامنے عربی ادب کے جو شاہکار موجود ہیں یا اعلیٰ شاعری کے نمونے ہیں جن میں بزم کی رنگینیوں کو الفاظ کے گل بوٹوں سے سجا کر چمن زار ادب بنا دیا گیا ہے یا رزم کی ہنگامہ آرائیوں کو فکر کے اُتار چڑھاؤ اور پُر شوکت الفاظ کی زرہ بکتر پہنا کر معرکۂ کارزار کی عکاسی کی گئی ہے اور ان شاہکاروں میں فکر و نظر کی ساری صلاحیتیں صرف کی گئی ہیں، پھر ادیب و شاعر کے قلم نے ان کو ادبی صحیفوں میں زندۂ جاوید بنانے کا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ تمام ادبی شاہکاریوں ہی وجود میں نہیں آ گئے، بلکہ پہلے دل میں خیال پیدا ہوا، پھر ذہن و فکر نے اس کے مختلف پہلوؤں کو سوچا، دماغ نے غور کیا اور قلم نے دست گیری کی تب وہ ادبی شاہکار وجود میں آیا۔

احادیث رسول کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے، یہ وقت، حالات، ماحول اور ضرورت اور دوسرے تقاضوں پر فوری اور زبانی ارشادات ہیں افہام و تفہیم، ارشاد

وتلقین، وعظ ونصیحت اور درپیش مسئلوں کا ان لفظوں میں حل بتایا گیا ہے جن کو ہم آج حدیث کہتے ہیں، نہ قبل از وقت ذہن وفکر نے اس میں کاوش کی ہے، نہ چراغوں کی لو میں بیٹھ کر قلم نے لکھا ہے، نہ ان میں عبارت آرائی کی بالقصد کوشش کی گئی ہے نہ ان میں خوبصورت لفظوں کی تلاش کو دخل ہے، نہ حسن انتخاب کی کرشمہ سازی اس کے باوجود احادیث کے جملے، طرز ادا، الفاظ کی مرصع کاری، انداز بیان، سلاست وروانی، عبارت کی شگفتگی کی وجہ سے عربی ادب کے ایسے جواہرات ہیں جن کے سامنے انسانوں کے شاہکار کارناموں کے موتیوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔

تقریر وتحریر میں جو فرق ہے وہ ہر تعلیم یافتہ سمجھتا ہے، ایک بہترین ادیب جس کی تحریروں پر لوگ سر دھنتے ہیں، ذہن ودماغ پر کیف وسرور نشہ بن کر چھا جاتا ہے اسے سن کر قوت سامعہ کو وجد آجاتا ہے لیکن وہی ادیب جب اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی زبان لکنت کھانے لگتی ہے، الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے نکلتے ہیں جملے بکھرے بکھرے موتیوں کی طرح سلک گہر کی آب وتاب کھو دیتے ہیں، ربط کلام مجروح ہوتا ہے اور ربط پیدا کرنے کی کوشش ایسی ہوتی ہے جیسے بہت نازک اور باریک تار میں موٹی اور بھدی ویلڈنگ کر دی جائے، عبارت کی شگفتگی وسلاست کا خون ہو جاتا ہے، لیکن وہی ادیب جب قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو اس کا قلم زر خالص، کھرے سونے کا مرصع، سبک، متناسب اور دیدہ زیب ہار بناتا ہے کہ اس کی چمک دمک اور اس کی آب وتاب پر عقل وفکر کی نگاہیں پڑتی ہیں تو خیرہ ہو جاتی ہیں، ادیب کے ہاتھ کا بے جان قلم ادیب کے بیدار ذہن سے زیادہ حساس اور اہم کردار ادا کرتا ہے، عبارت آرائی، لفظوں کے انتخاب اور نوک پلک درست کرنے میں موثر رول ادا کرتا ہے، ذہن میں خیالات آتے ہیں لیکن اس کی ترتیب، پیشکش کا انداز اور طرز ادا کیا ہو؟ یہ ادیب کا قلم بتاتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ قلم چلتا چلتا یک بیک رک جاتا ہے، ادیب لاکھ چاہتا ہے کہ قلم آگے بڑھے لیکن قلم اپنی نوک کاغذ پر جمائے اڑیل گھوڑے کی طرح ٹھہر جاتا ہے، قلم جب ادیب کے ذہن میں موجیں مارتے ہوئے خیالات کے لئے ایک

عمدہ اور خوبصورت طرز ادا یا طریقہ انتخاب کرلیتا ہے تو رُکا ہوا قلم یک بیک چل پڑتا ہے، قلم ادیب کی قوت فکریہ کو مرتکز کرتا ہے، اس کے خیالات وافکار کے انبار کو چھانتا پھٹکتا ہے اور اس کے ذہن میں معلومات کا جو خزانہ ہے اس کے آبدار موتیوں کو چھانٹ لیتا ہے اور اس کے قیمتی جواہرات کو منتخب کرلیتا ہے تب کہیں آگے بڑھتا ہے، اس لئے ہر ادبی شاہکار کے وجود میں آنے میں سب سے اہم کردار قلم کا ہوتا ہے زبان کا اس میں کوئی بھی دخل نہیں ہوتا ہے اس کے برعکس احادیث یا کلام رسول موقعہ ومحل، حالات وماحول کے تقاضوں کے زیر اثر زبانی ارشادات اور باتیں ہیں، روز مرّہ کی گفتگو ہے، الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ترتیب، زبان وبیان کی دلکش اور خوبصورت طرز ادا میں ذہن وفکر کی اس کاوش کا قطعی دخل نہیں جو عام ادیبوں کے ادبی شاہکاروں کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے، اس کے باوجود احادیث کا ادبی مقام ومرتبہ تا حد اعجاز بلند ہے جس مقام ومرتبہ تک کسی ادیب کے طائر فکر کی پرواز ممکن نہیں ہے، اہلِ زبان نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

ادب کا بحرِ نا پیدا کنار

مسلم شریف کی روایت ہے، ضماد ازدی مکہ آئے وہ جھاڑ پھونک کے ماہر تھے، مکہ کے احمقوں سے سنا کہ محمد ﷺ کو جنون ہوگیا ہے انہوں نے سوچا کہ اگر میری ملاقات ان سے ہوجائے تو میں ان کا علاج کروں گا۔ ہوسکتا ہے وہ صحت یاب ہوجائیں وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا:

یا محمد، انی ارقی من هذا الريح، فهل لك. آپ کو جو ہوا لگ گئی ہے میں اس کا علاج کرتا ہوں۔

حضور اکرم ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ مکہ کے باہر کا آدمی ہے مکہ کے دشمنوں نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے، خود اس کے ذہن کی یہ پیداوار نہیں ہے اس لئے آپ نے نہ اس کی بات کی تردید فرمائی نہ یہ فرمایا کہ یہ دشمنوں کی سازش ہے اور پروپیگنڈہ

ہے ان ساری باتوں سے قطع نظر کر کے آپ نے فرمایا:

ان الحمد لله، نحمده ونستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له، اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله.

ضماد ازدی نے یہ چند مرصع اور رواں دواں جملے سنے، سن کر حیرت زدہ رہ گئے، انھوں نے عرض کیا: حضور! ایک بار اور، حضورؐ نے ایک بار اور ان الفاظ کو دہرا دیا، انھوں نے اصرار کر کے تین بار یہ جملے سرکار دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے سنے، پھر ان کا تأثر کیا ہوا؟ سننے کی بس یہی بات ہے، یاد رکھئے کہ ضماد عرب کے مشہور قبیلہ ازدشنورہ کے فرد تھے، عربی زبان وادب اور عربی شاعری سے واقف تھے، بلکہ رمز شناس تھے وہ نہایت حیرت سے عرض کرتے ہیں:

لقد سمعت قول الكهنة وقول السحرة وقول اشعراء، ما سمعت مثل كلماتك هؤلاء، لقد بلغن قاموس البحر.

میں نے کاہنوں، جادوگروں، اور شاعروں کے کلام سنے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا کلام آپ جیسا نہیں، یہ تو فصاحت وبلاغت کا تھاہ سمندر ہے۔

(بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ۵۲۵)

ضماد ازدی نے الفاظ کے جادوگروں، عبارت آرائی کے فنکاروں کے ادبی شاہکاروں کو حضور اکرم ﷺ کے چند جملوں کے لعل و گہر کے سامنے ریزے سمجھا، اور اس کا عملی اظہار اس طرح کیا انھوں نے بلا تاخیر حضورؐ سے عرض کیا:

هات يديك، ابايعك على الاسلام.

دست مبارک بڑھایئے، مجھے ایمان کی دولت سے نواز دیجئے۔

اہل علم ہمیشہ اور مسلسل ان الفاظ کو اپنے خطبوں میں دہراتے ہیں اس لئے ذہن عبارت کی شگفتگی برجستگی، سلاست، فصاحت وبلاغت، ربط کلام کے سلک گہر کی موزونیت کی طرف نہیں جاتا، لیکن عرب کے گاؤں کا رہنے والا جو عربی زبان وادب کا

جوہری اور رمز شناس اور اس کی قدر و قیمت کا سمجھنے والا تھا اس کا یہ اعتراف کرنا کہ اس کلام کی ادبی شان اس کی فصاحت و بلاغت کا مقام حد اعجاز تک بلند ہے، یہ اعتراف سیکڑوں نقادوں اور ادیبوں کے نقد و تبصرہ سے کہیں زیادہ وزنی اور کہیں زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

جوامع الکلم کا امتیازی وصف

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے خصوصی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اعطیت جوامع الکلم یعنی مجھے جوامع الکلم کی صفت دی گئی، یعنی الفاظ مختصر سے مختصر استعمال کئے جائیں لیکن ان کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ معانی کی ایک پوری کائنات اس میں سما جائے، یعنی ع

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

بعض درختوں کے بیج اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ناخن میں سما جائیں لیکن جب اس سے ایک تناور درخت نکلتا ہے تو اس کے پھیلاؤ کے لئے ایک ایکڑ کی زمین بھی ناکافی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ایک ایکڑ زمین پر چھا جانے والا یہ درخت اسی ننھے سے بیج میں پوشیدہ تھا جو بیج آپ کے ناخن میں سما سکتا تھا حضور ﷺ کی صفت جوامع الکلم کا یہی مفہوم ہے، حضور ﷺ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جملے ہیں ایک ایک جملہ کی تشریح میں محقق علماء نے صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں۔

ادب عالیہ کا بلند ترین معیار یہ ہے کہ الفاظ مختصر ہوں مگر ادیب کے ذہن میں جو معنوی وسعت ہے اس کی کامل ترین ترجمانی کرسکیں۔، وہ ادبی کارنامہ شاہکار اور شہپارہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جو صرف الفاظ کا جنگل ہو اور خودرو جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہو، کہ طائر معنی کا پر پرواز اس میں اُلجھ کر رہ جائے اس کے بازو شل ہو جائیں اور نہ وہ ادبی کارنامہ شاہکار کہا جا سکتا ہے جس مین شہباز فکر خلاؤں میں جا کر گم ہو جائے۔

بہترین ادب لفظ و معنی کے بہترین امتزاج کا نام ہے، اگر ادیب کم سے کم

الفاظ استعمال کرتا ہے اور بات انتہائی موثر انداز میں ادا ہو جاتی ہے تو یہ اس کے ادبی کمال کی بہت بڑی سند ہے، یہ خصوصیت سرکار دو عالم ﷺ کو موہبت الٰہی سے حاصل ہے، جوامع الکلم کی صفت سے متصف ہونا ادب کے ایسے بلند معیار کا دعویٰ کرنا ہے جہاں فکر انسانی کی رسائی ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور ہے، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا ادیب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو اہل علم اس کے دعوے کو آسانی سے تسلیم نہیں کر سکتے، لیکن سرکار دو عالم ﷺ نے یہ دعویٰ کیا تو دنیائے ادب کا سر اس کے سامنے خم ہو گیا، اور کسی کو اس سے مجال انکار نہیں رہی۔

الفاظ کا برمحل استعمال

ایک اچھا ادیب لفظوں کا برمحل استعمال کر کے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیتا ہے اور الفاظ میں نئی جان ڈال دیتا ہے، ہر لفظ کی اپنی ایک معنوی خصوصیت ہوتی ہے الفاظ ایک بکھرا ہوا خزانہ ہے، سونے کے ریزے اپنی جگہ قیمتی ہیں لیکن انھیں ریزوں کو جمع کر کے کسی زہرہ جمال کے کانوں کے آویزے بنا دیئے جائیں تو ان کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جیسے سورج کے سامنے آئینہ رکھ دیا جائے، جس طرح سورج پر نگاہیں جمانا مشکل ہوتا ہے اسی طرح اس چار پیسے کے آئینہ پر اب نگاہوں کا ٹھہرنا دشوار ہو جاتا ہے جس میں سورج کا عکس آ گیا ہے، ادب عالیہ کے خالق کسی ادیب کے فن کا کمال یہی ہے کہ الفاظ کے موتیوں کو ایسی جگہ رکھے کہ فصاحت و بلاغت کے سورج کی سیدھی کرن ان پر پڑنے لگے تا کہ ان کی آب و تاب اور ان کا اپنا حسن نکھر جائے۔

احادیثِ رسول پر جب آپ باریک بینی سے غور کریں گے تو آپ یقین کریں گے کہ یہ لفظ یہیں ہونا چاہئے تھا جہاں ہے، یہی وجہ تھی کہ عرب کے بدو جو اپنی درشت مزاجی کے باوجود لفظوں کے جوہری تھے وہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے چند جملوں کو سن کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے اور ان کی کایا پلٹ جاتی تھی اور کفر کے

اندھیرے سے اسلام کے اُجالے میں آجاتے تھے، دنیا کے بڑے سے بڑے ادیب کے ادبی شہ پاروں میں یہ جوہر نہیں یہ تاثیر کلام نہیں اس لئے کلام رسول کو دوسروں کے ادبی نمونوں کی کسوٹی پر پرکھنا دلیل کم نظری ہے۔

احادیث کے ادبی پہلوؤں پر ذرا اور تفصیل سے غور کریں، ادب عالیہ کے اجزاء ترکیبی میں جہاں الفاظ کا برمحل استعمال، عبارت میں سلاست وروانی، برجستگی وشگفتگی کو دخل ہے وہیں کچھ اور بھی باتیں جو کسی ادبی کارنامے کو شاہکار بناتی ہیں جیسے تشبیہات میں ندرت وجدت، تمثیل کی معنویت وسعت، انسانی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انداز بیان اور لفظوں کا انتخاب کرنا بھی ہے، اگر کسی شاعر یا ادیب کے کلام میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں تو اس کے کمال فن کا اعتراف ناگزیر ہے، مثلاً عمرو بن کلثوم دور جاہلی کا شاعر ہے، اس نے اپنے قبیلہ والوں کی رگوں میں شجاعت وبسالت، غیرت وحمیت کی آتش سیال بھرنے کی اپنے قصیدہ میں جو کوشش کی ہے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہے، وہ اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا

فنجهل فوق جهل الجاهلينا

ترجمہ: سن لو، کوئی ہم سے اکھڑپن کی باتیں نہ کرے ورنہ ہم تمام اکھڑپن کرنے والوں سے بڑھ کر اکھڑپن کرنے والے ہیں۔

وہ قبیلہ کی عورتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے: ؎

يقتن جيادنا ويقلن

لستم بعولتنا اذا لم تمنعونا

ترجمہ: ہمارے شاندار گھوڑوں کے چارہ پانی کا انتظام کرتی ہیں اور اپنے شوہروں سے صاف کہہ دیتی ہیں اگر تم نے ہماری پوری حفاظت نہیں کی تو ہم ایسے بزدل لوگوں کو اپنا شوہر نہیں تسلیم کریں گے۔

حد تو یہ ہے کہ اپنے قبیلہ کے دودھ پیتے بچوں کے بارے میں وہ کہتا ہے: ؎

اذا بلغ الفطام لناصبی
تخرلہ الجبابر ساجدینا

ترجمہ: ہمارے قبیلہ کے بچے ابھی اپنی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوڑتے کہ بڑے بڑے سورما اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔

وہ جب اپنا قصیدہ سناتا ہے تو جیسے شیر جھرجھری لے کر کھڑا ہوجاتا ہے اور حملہ کے لئے تیار ہوجاتا ہے ویسے ہی اس کے قبیلے کے جوانوں کے سروں کے بال غیرت وحمیت اور جوش شجاعت کے شدت احساس سے کھڑے ہوجاتے ہیں، عمرو بن کلثوم کے کلام میں یہ تاثیر اس لئے پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے قبیلہ کی نفسیات سے آگاہ تھا، وہ قتل وغارتگری کے دلدادہ تھے، وہ خون ریزی اور خون آشامی کے رسیا تھے، یہ ان کا قومی مزاج تھا، ان کی فطرت تھی، بس ان کے جذبات کو ذرا سا بیدار کرنے کی ضرورت تھی، عمرو بن کلثوم نے ان کے فطری جذبات کو جگادیا، شیر کو حملہ کرنے کے لئے بہانہ چاہیئے، ایک کنکری پھینک کر دیکھئے بس اتنا ہی اس کے مزاج کو گرم کرنے کے لئے کافی ہے، عمرو بن کلثوم نے اپنے قصیدہ سے یہی کام لیا ہے، لیکن اگر شیر پالتو جانور کی طرح آپ کے سامنے کھڑا ہوجائے اور آپ کے اشاروں پر اٹھنے اور بیٹھنے لگے اور اپنی فطرت کے خلاف کاموں پر مجبور ہوجائے تو یہ اس سے بڑا کمال ہے، سرکاردوعالم ﷺ کی احادیث میں یہ محیر العقول کارنامہ ہم کو نظر آتا ہے، حدیث کے چند جملوں نے کچھ ایسا ہی حیرتناک کرشمہ کردکھایا ہے۔

احادیث میں نفسیاتی پہلو

احادیث میں نفسیاتی اظہار اور انسانی فطرت شناسی کا جوہر ہرجگہ چمکتا دمکتا نظر آتا ہے، یہی وجہ تھی کہ چند لفظوں میں دل ودماغ کی کایا پلٹ جاتی تھی، بظاہر جو کام بہت ہی دشوار نظر آتا تھا وہ اس طرح وجود میں آجاتا تھا جیسے سامعین کی خود یہی خواہش تھی، احادیث یا کلامِ رسول میں یہ تاثیر اس لئے بھی تھی کہ انسانی فطرت کے تاروں کو

لفظوں کی مضراب سے اس طرح چھیڑ دیا جاتا تھا کہ اس سے بہجت ومسرت کے نغمے اُبلنے لگتے تھے، بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ اس قبیلہ ہوازن سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی جنگ میں جو تباہیاں اور بربادیاں دونوں طرف آتی ہیں وہ آئیں، مسلمانوں نے کمال شجاعت کا مظاہرہ کر کے فتح حاصل کر لی، مال غنیمت ہاتھ آیا بہت سے غلام اور کنیزیں مجاہدین کے حصہ میں آئیں، سب کچھ مجاہدین میں تقسیم کر کے ان کو مالک بنا دیا گیا اور وہ ان کے مالک ہوگئے اور جائز مالک ہوئے، کچھ ہی دنوں بعد قبیلہ ہوازن میں ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوتا ہے اور پورا قبیلہ دائرہ اسلام میں آجاتا ہے وہ مسلمان ہو کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ ہمارا مال اور ہمارے آدمی ہمارے حوالے ہوجاتے تو عنایت ہوتی، مگر ان کی درخواست کی منظوری میں دشواری یہ تھی کہ سارا مال اور لونڈیاں اور غلام تقسیم ہو چکے تھے اور مجاہدین اس کے قانونی اور شرعی مالک ہو چکے تھے ان سے واپس لینے کا کوئی حق نہیں تھا اور وہ واپس کرنے پر مجبور بھی نہیں کئے جاسکتے تھے، مسئلہ نازک تھا آپ نے ہوازن والوں سے فرمایا کہ دونوں میں سے کسی ایک کا مطالبہ کرو تو بات کی جائے، قبیلہ ہوازن کے وفد نے کہا **نحن نختار سبینا** ہم کو ہمارے قیدی دلا دیجئے آپ نے مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا:

اخوانکم جاؤا تائبین وانی قد رأیت ان اَرُدَّ الیهم سبیهم فمن احب منکم ان یطیب ذالك فلیفعل ومن احب منکم ان یکون علیٰ حظه حتی نعطیه من اول مایفیٔ اللّٰه علینا فلیفعل. (مشکوٰۃ ص ۴۲۶)

مسلمان ہو کر تمہارے بھائی آئے ہیں، میرا خیال ہے کہ میں ان کے قیدیوں کو واپس کردوں تم میں سے جو دلی خوشی کے ساتھ منظور کرے وہ بھی رہا کردے اور جو اپنے غصہ پر قائم رہنا چاہتا ہے وہ بھی واپس کردے بیت المال کی پہلی آمدنی سے میں اس کا حصہ ادا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

ابھی ابھی قبیلہ ہوازن سے جنگ ہوئی ہے دونوں ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے تھے، مسلمانوں نے جان لڑا کر فتح حاصل کی تھی پھر ایسے دشمنوں کے لئے سب سے پہلا جملہ جو آپ نے ارشاد فرمایا: **اخوانکم جاءوا تائبین**. تمہارے بھائی مسلمان ہو کر آئے ہیں، گویا عدالت و دشمنی، اور نفرت و غصہ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر برف کی سل رکھ دی گئی، ایک بھائی میں محبت و عداوت دونوں جمع نہیں ہوسکتیں، نفرت سے تپتے ہوئے دلوں پر محبت کی شبنم کی پھوار پڑنے لگی، گرم آب و ہوا میں یک بیک خنکی پیدا ہونے لگی، آپ اس پر بھی نظر رکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ان قیدیوں کو واپس کرنے کا حکم نہیں دیا، کیونکہ وہ ان کے جائز مالک تھے مگر پھر بھی شور مچ گیا کہ ہم سارے قیدیوں کو واپس کرتے ہیں، آپ نے فرمایا اس طرح نہیں ہوسکتا ہے کہ وقتی جوش میں یہ بات کہدی گئی ہو یا اس شور میں ان لوگوں کی آواز دب گئی ہو جو اپنے قیدیون کو واپس نہیں کرنا چاہتے، اس لئے سب لوگ واپس جائیں اور ہر حلقہ کا نمائندہ فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھ کر مجھے مطلع کردے، کون اس پر بخوشی راضی ہے اور کون نہیں چنانچہ نمائندوں نے ان کے گھروں پر جا کر ہر ایک سے دریافت کیا اور پھر دربارِ نبوت میں اطلاع دی کہ بلا استثناء ہر شخص برضا و خوشی قیدیوں کو واپس کرنے کے لئے تیار ہے آپ کے چند جملوں نے ان کے ذہن و فکر میں انقلاب پیدا کردیا، عام حالات میں ایک بھی قیدی کی واپسی دشوار تھی، لیکن ان جملوں کے بعد ایک بھی متنفس ایسا نہیں رہا جس نے اپنی خوشی سے بلکہ پوری بشاشت سے اپنے قیدی کو واپس نہ کردیا ہو، یہ کلام رسول کی معجز بیانی تھی، انسانی فطرت شناسی کی تاثیر تھی چونکہ لفظوں کا انتخاب، جملوں کی ترتیب، طرز ادا، زبان و بیان عوامی نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا تھا، اس لئے بات دلوں میں اُتر گئی، پہلے مال غنیمت کنیز اور غلام پاکر جو دل خوش تھے اب انھیں کو واپس کرکے اس سے زیادہ خوش ہوگئے۔

نفسیات شناسی اور اس سے استفادہ کی ایک اور بھی مثال سے بات اور واضح ہوجائے گی، حضور اکرم ﷺ نے طائف سے واپسی میں مقام جعرانہ میں مال غنیمت تقسیم فرمایا، اس موقعہ پر قریش والوں کو کچھ زیادہ حصہ ملا قریش کے لوگ ابھی جلد ہی

اسلام لائے تھے اور جنگ میں شریک ہوئے تھے، انصار کے نوجوانوں نے یہ دیکھا تو ان کو تھوڑا املال ہوا، انھوں نے آپس میں کہا:

یغفر اللّٰہ لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یعطی قریشا ویدعنا وسیوفنا تقطر من دمائھم. (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

اللہ حضور کی مغفرت فرمائے کہ وہ قریش والوں کے دے رہے ہیں اور ہمیں نظر انداز فرما رہے ہیں حالانکہ ان کا خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔

یہ بات حضور ﷺ تک پہنچ گئی، فوج کا بددل ہونا کسی بھی نظام حکومت کے لئے بڑا خطرناک ہوتا ہے، فوجی دماغ بھی کچھ خاص سانچوں میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے اگر فوج سے بددلی کو رفع نہ کیا جائے تو فوج کی وفاداری متاثر ہوسکتی ہے یہ انتہائی تشویشناک مرحلہ ہوتا ہے، فوجی قوانین بھی کچھ الگ ہوتے ہیں مگر حضور اکرم ﷺ نے نہ کورٹ مارشل کیا نہ ان پر کوئی فرد جرم عائد کیا، آپ نے انصار کے معزز افراد سے فرمایا کہ سارے انصار کو ایک خیمہ میں جمع کرو اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو، جب سب لوگ آگئے تو آپؐ نے صرف دو تین جملے ارشاد فرمائے، پہلے تو قریش کو کچھ زیادہ دینے کی وجہ بتادی پھر انصار سے فرمایا:

اما ترضون ان یذھب الناس بالاموال وترجعون الٰی رحالکم برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم. (مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

حضور اکرم ﷺ کو انصار کی والہانہ شیفتگی اور دیوانہ وار محبت کا یقین تھا اور مخلصانہ عقیدت و محبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنے محبوب کے لئے انسان ساری کائنات کو تج سکتا ہے، حضورؐ نے اسی نفسیاتی پہلو کو چند جملوں میں اختیار فرمایا پھر ان جملوں کی تاثیر کیا ہوئی؟ جو دل شکایتوں سے بھرا ہوا تھا وہ مسرتوں کی آماجگاہ بن گیا اور سب نے بیک زبان کہا: **بلٰی یا رسول اللّٰہ قد رضینا.**

فطرت شناسی کے جوہر کے ساتھ منتخب لفظوں کے استعمال اور طرز ادا کی جدّت نے دل و دماغ کی دنیا بدل دی، کسی ادیب کے اندر اگر یہ صلاحیت ہے تو یقیناً اس کو

بڑا ادیب کہا جاسکتا ہے اس کا ادب مثالی ادب تسلیم کیا جائے گا۔

میں احادیث کے ادبی پہلوؤں کی طرف صرف اجمالی اشارات کرتا چلا آرہا ہوں اگر ان کی تفصیل کی جائے اور اس کی مثالیں پیش کی جائیں تو یہ مضمون یا مقالہ نہیں، کتاب بن جائے، احادیث میں ان گنت دعائیں منقول ہیں، حضور اکرم ﷺ نے مختلف مواقع پر خطبے دیئے ہیں، موقع ومحل اور حالات کے پیش نظر صحابہ کرام کو خطاب فرمایا ہے، لوگوں کو نصیحتیں فرمائی ہیں اور ہدایتیں دی ہیں، حجۃ الوداع کے موقع پر جو شاندار خطبہ دیا ہے اگر چہ تاریخ میں مکمل خطبہ نہیں ملتا ہے لیکن جستہ جستہ جو اس کے ٹکڑے مختلف روایتوں میں پائے جاتے ہیں وہ اتنے معنی خیز ''جوامع الکلم'' کے شاہکار، شستہ، شگفتہ، سلیس، لفظوں کے بے مثال انتخاب، انداز بیان اور فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ایسے جواہر پارے ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے کہ دمکتے ہوئے سورج کو تراش کر اس سے چمکتے ہوئے ستارے بنائے گئے ہیں، چمن زار ادب کے شگفتہ پھولوں کے چھوٹے چھوٹے دلکش جاذب نظر گلدستے بنائے گئے ہیں، ان کی معنوی وسعت کا یہ عالم ہے کہ وہ اسلامی قوانین اور اصولوں کی لچکدار دفعات بن گئے ہیں، ان سے بہت سے شرعی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

اگر الفاظ ومعنی کے بہترین امتزاج کا نام ادب عالیہ ہے تو یہ تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں کہ احادیث رسول اس ادب عالیہ کا سب سے بہتر، سب سے شاندار نمونہ ہیں اور احادیث کا ادبی مقام ومرتبہ اتنا بلند ہے کہ جس طرح قرآن اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے معجزہ ہے اور ساری علمی دنیا کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے اسی طرح احادیث رسول بھی عربی زبان وادب کا ایک معجزہ ہیں، یہی میری اب تک کی گفتگو کا خلاصہ ہے اور یہی میرا ایمان ہے۔

''جہانِ دیدہ'' پر ایک نظر

(''ادب میں سفر ناموں کی اہمیت'' کے موضوع پر رابطہ ادب اسلامی کے ایک ہونے والے سیمینار کے لئے لکھا گیا)

میرے نزدیک ایک بہترین سفر نامہ کسی بھی زبان وادب کا اہم ترین عنصر نہیں ہے بلکہ اس کا براہ راست تعلق تاریخ سے بھی ہے اور جغرافیہ سے بھی، قوموں کی تہذیب اور تمدن کی تاریخ بھی اس کے دائرہ کار میں آتی ہے اور ان کے عروج وزوال کی داستانیں بھی، اگر چہ سفر نامہ میں براہِ راست یہ باتیں نہیں آتی ہیں لیکن سفر نامہ کی روشنی میں ان کی جھلک ضرور ہوتی ہے جیسے ہیڈ لائٹ تو صرف سامنے کے منظر پر پڑتی ہے لیکن اس کے دائیں بائیں بھی کچھ دھندلے مناظر نظر آنے لگتے ہیں، سفر نامہ چونکہ تجربات ومشاہدات کے اظہار سے عبارت ہے اس لئے وہ ہمارے سامنے ایک ایسی روشنی فراہم کرتا ہے جس میں ماضی کے کھنڈرات اور ویرانے بھی نظر آتے ہیں اور حال کے جگمگاتے ہوئے تمدنی جلوے بھی، غرضیکہ پیش منظر میں تو مشاہدات کی جلوہ آرائیاں ہوتی ہیں اور پس منظر میں ماضی کی ہلکی اور دھندلی روشنی ہوتی ہے جیسے چودھویں رات کے پورے چاند پر بادل آجانے کے بعد دھندلی دھندلی روشنی ہوتی ہے اور بادل کے ہٹتے ہی سونے کی یہ طشت اپنی سنہری روشنی کا جادو بکھیر دیتی ہے اگر سفر نامہ میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے اور میں اس سفر نامہ کو ایک کامیاب سفر نامہ تصور کرتا ہوں کیونکہ وہ ادب کا بھی ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔

سفر نامہ ایک ایسا جام جہاں نما ہوتا ہے جس میں مختلف انواع مناظر دکھائی دیتے ہیں جن کو دیکھ کر قاری کبھی بہجت وسرور کی پھلواروں میں نہا جاتا ہے اور کبھی اس کے جذبات وتصورات کے آبگینے کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ ایک چھپٹ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اداس ہو کر رہ جاتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ سفر نامے کے مسافر کی قوت مشاہدہ

طاقتور ہو اور زبان و بیان پر اس کو حاکمانہ اقتدار حاصل ہو، اس کے ہاتھ میں ایک صداقت شعار اور راست گو قلم ہو جو ذہنی تحفظات کے بغیر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

میں آج آپ کو اسی طرح کے ایک سفرنامہ سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جو تازہ ترین سفرناموں کی فہرست میں آتا ہے جس میں ماضی کی بے پناہ سچائیاں بھی ہیں اور حال کی ٹھوس اور بے لچک صداقتیں بھی، وہ سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' کے نام سے طبع ہو کر ہندو پاک کے علمی حلقوں تک پہنچ چکا ہے اس کے مصنف علمی و دینی حلقوں کی معروف شخصیت مولانا تقی عثمانی ہیں جن کی اسلامی علوم میں بصیرت اور درجہ کمال کی سند میں ان کی صرف دو تصانیف ''تکملہ فتح الملہم'' اور علوم القرآن جیسی معرکۃ الآرا کتابوں کو پیش کر دینا کافی ہے وہ پاکستان میں اسلامی عدالت کے جسٹس بھی ہیں اور دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث بھی۔

''جہانِ دیدہ'' متعدد سفرناموں کا مجموعہ ہے، انھوں نے وادی دجلہ وفرات کی بھی سیر کی ہے اور الجزائر کی سنگلاخ پہاڑیوں سے بھی گذرے ہیں، انہوں نے ابوالہول اور اہرام کی سرزمین بھی دیکھی ہے اور مرکز خلافت استنبول اور قسطنطنیہ کی بھی زیارت کی ہے انہوں نے امریکہ کی عالمی شہرت کی مالک نیاگرا آبشار کے حسین نظارے بھی دیکھے ہیں، اور پیرس کے شیشۂ جلی کی طرح دیکھتے ہوئے شانز الیزے بازار کی آب و تاب سے بھی آنکھیں چار کی ہیں انہوں نے ماوزے تنگ اور چواین لائی کے سرخ انقلاب کی سرزمین بھی دیکھی ہے اور بیجنگ کے مشہور چوک ''تھیان آن من'' کا پُر شکوہ منظر بھی دیکھا ہے اور مشہور دیوار چین کے سائے میں بھی گذرے ہیں۔

وہ جہاں سے بھی گذرے ہیں حال کی روشنی کے ساتھ ماضی کے اُجالے بھی ان کے ہمرکاب رہے کہیں بھی انہوں نے طائرانہ نظر نہیں ڈالی ہے، وہ بیک وقت ''بصارت و بصیرت'' دونوں کیمرے ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں اس لئے ان کی بنائی ہوئی ہر تصویر داخلی و خارجی دونوں لحاظ سے مکمل ہے، ان کی تصویریں جاذب نظر بھی ہیں اور

عبرت کا مرقع بھی، ان کو زبان و بیان پر حاکمانہ دسترس حاصل ہے، اردو تو خیر ان کے گھر کی زبان ہے عربی اور انگریزی پر بھی اہل زبان کی طرح ان کو قدرت حاصل ہے، ان خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا سفر نامہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور ہر منظر کی داخلی وخارجی دونوں طرح کی تصویریں پیش کرنے میں ان کو درجہ کمال حاصل ہے۔

سفر نامہ کے مرتب مولانا عثمانی خالص ایک مذہبی عالم ہونے کی باوجود اپنے ہاتھوں میں ایک بہار آفریں قلم رکھتے ہیں ان کے قلم نے ایسے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں جن کی شیفتگی وشادابی، رعنائی وزیبائی، دل ونظر اور شعروادب دعوت نظارہ دیتی ہے۔

سفر نامہ کے مسافر کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ کوئی بھی ایسا منظر دیکھتے جو اس پر کوئی نئی کیفیت پیدا کرے، اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو جائے تو اس کو ایسے لفظوں میں بیان کر دے کہ قاری کے سامنے اس کی وہی خوبصورت تصویر آجائے، جب ہم اس نقطۂ نگاہ سے ''جہانِ دیدہ'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری فکر ونظر کو قدم قدم پر ایسے حسین وجمیل مرقع ملتے چلے جاتے ہیں جیسے وہ حسین منظر خود ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں ایک دو مثالوں سے وضاحت کرتا ہوں۔

مولانا عثمانی مصر کے سفر پر گئے ہوئے ہیں دریائے نیل جس میں کبھی فرعون غرق ہوا تھا وہ آج بھی اس سرزمین پر بل کھاتا ہوا رواں دواں ہے آپ کا قیام اس ہوٹل میں تھا جو دریائے نیل کے ساحل پر تھا، رات کا وقت ہے، وہ ساحل نیل پر کھڑے ہوئے ہیں، ان کا بیان ہے:

> ''میں ہوٹل سے اتر کر چہل قدمی کے لئے دریائے نیل کے کنارے چلا گیا موسم بڑا خوشگوار تھا دریا کے دونوں طرف بنی ہوئی عمارتوں کی رنگ برنگ روشنیاں نیل کے پانی میں منعکس ہو کر ایسے ایسے رنگ پیدا کر رہی تھیں جن کے لئے انسانی لغت میں الگ نام وضع نہیں کئے، دریا پر بنے ہوئے پل پر کاروں کی مخالف سمتوں سے دوڑتی ہوئی روشنیوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے نیل کے دونوں کنارے سونے کی گیندیں ایک دوسرے کی طرف پھینک رہے ہوں''

ایک دوسرا منظر دیکھئے، مولانا عثمانی الجزائر کے سفر پر ہیں وراس کے مشہور شہر بجایہ میں ان کا قیام ہے، ان کا ہوٹل بحیرۂ روم کے بالکل کنارے واقع ہے، بجایہ کی چھوٹی سی بندرگاہ جس ساحل پر ہے وہاں سے یہ ساحل جنوب مغرب کی طرف ایک ہلالی نیم دائرہ بناتا ہوا چلا گیا ہے پھر جنوب کی طرف مڑ کر سیدھا ہو گیا ہے اس ساحل کے ساتھ ایک ساحلی سڑک حد نظر تک چلی گئی ہے جس کے مغرب میں سرسبز وشاداب پہاڑیوں کا سلسلہ ہے اور مشرق میں بحیرۂ روم پوری آب وتاب کے ساتھ بہ رہا ہے ان کا ہوٹل اسی سڑک پر واقع ہے اس کے کمروں کی کھڑکیاں سمندر کے کنارے کھلتی ہیں، کمرے کی اندرونی فضا ہر وقت موجوں کے ترنم سے معمور رہتی ہیں، ان کھڑکیوں سے انھوں نے سمندر کا جو نظارہ دیکھا تو ان کا تصور ان کو کہاں سے کہاں لے گیا، حال کی روشنی میں ماضی کی تابناک کرنوں کا نظارہ کتنا دلکش ہے اور کتنا عبرتناک؟ بس دیکھنے کی یہی بات ہے وہ لکھتے ہیں:

'''فندق الحمادیین'' (ہوٹل) اسی ساحلی سڑک پر واقع ہے، میں اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے مشرقی دروازے سے جو ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا ہے، بحیرۂ روم کا حسین منظر سامنے تھا، حد نظر تک بحیرۂ روم کے نیلگوں پانی میں موجیں کروٹیں لیتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں، خیال آیا کہ یہاں سے بالکل سامنے انھیں موجوں کے اس پار اُندلس کا ساحل پھیلا ہوا ہے اور اسی سمندر نے صدیوں اندلس کے مسلمانوں کو مشرقی ممالک سے ملانے کا فریضہ انجام دیا ہے اور یہیں برسوں ان فاتحین کی تک وتاز جاری رہی ہے جس کے نعرہائے تکبیر کی گونج سے اس فضا کا ہر ذرہ معمور ہے اس تصور کے ساتھ یہ اشعار یاد آ گئے۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن کے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اندلس کا دور عروج، اسلامی حکومت کا قیام، ان کا شاندار تمدن اس کی بے مثال تہذیب جس نے پورے یورپ کو ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا وہ ساری تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

مسافر عراق کے سفر میں ہے اور مدینۃ السلام بغداد میں مقیم ہے، یہ وہی بغداد ہے جو کئی صدیوں تک مسلمانوں کے جاہ وجلال کا واحد نمائندہ رہا، وہاں کا شاندار تمدن وہاں کے علمی وفنی کارنامے ساری دنیا کو مرعوب کئے ہوئے تھے، مسلمانوں کے دور عروج کی کوئی تاریخ بغداد کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی، یہ وہی بغداد ہے جہاں بڑے بڑے حوادث آئے، فتنۂ تاتار کی ہولناک تاریخ اس سے جڑی ہوئی ہے، بغداد کے ذکر کے ساتھ دجلہ کا ذکر بھی ناگریز ہوجاتا ہے، مسافر ساحل دجلہ پر واقع ایک ہوٹل میں مقیم ہے وہ حال کے دلکش نظاروں میں اپنے شاندار ماضی کے تابناک رخوں کو فراموش نہیں کرسکا، حال کے مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے پس منظر میں ماضی کی بھی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے اس منظر کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے، مولانا عثمانی رقم طراز ہیں:

”کچھ دیر ہوٹل میں آرام کرنے کے بعد رات کو ہم دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے، موسم میں خوشگوار خنکی تھی اور دجلہ پوری آب وتاب کے ساتھ بہہ رہا تھا، ہم لوگ دیر تک دجلہ کے کنارے ٹہلتے رہے، دریا کے دونوں کناروں پر بنی ہوئی شاندار عمارتوں کی روشنیاں پانی میں منعکس ہوکر عجیب وغریب رنگ پیدا کررہی تھیں، یہ وہی دجلہ تھا جو تاتاری حملے کے دوران کبھی خون مسلم سے سرخ ہوا، اور کبھی کتابوں کی روشنائی سے سیاہ، اس نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی کتنی داستانیں لکھی ہیں، تاریخ کے نہ جانے کتنے راز اپنی لہروں میں

چھپائے آج بھی اسی آب وتاب سے بہ رہا ہے لیکن اس دریا کے کنارے مسلمانوں نے جو تابناک تہذیب دنیا کو عطا کی تھی اس کا تصور کرنے کے لئے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں اور دماغ پر زور ڈال کر یہ کہنا پڑتا ہے۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

سرسری مطالعہ کے بعد میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں ورنہ ''جہانِ دیدہ'' میں جگہ جگہ اس طرح کے ادبی شہپارے ہیں، جب مولانا عثمانی کے سامنے جگمگا تا ہوا کوئی منظر آتا تو ظاہری حسن و جمال اور رعنائی وزیبائی کا اظہار بڑی باریک بینی کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کی عکاسی اتنے خوبصورت الفاظ میں کرتے ہیں جیسے شعروادب کی روح اس میں حلول کر جاتی ہے، چھ سو صفحات کے اس سفرنامہ میں جگہ جگہ ایسا شگفتہ انداز تحریر ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے دل ودماغ کی وسعتوں میں موسم بہار کی عطر بیز ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ مولانا عثمانی ہر جگہ خارجی فضا کے ساتھ باطنی فضا کا بھی تصور پیشِ نظر رکھتے ہیں اور یہ باطنی یا روحانی فضا جو مادی آنکھوں کو نظر نہیں آتی مگر وہ سفرنامہ میں جان ڈال دیتی ہے مثلاً وہ منظر دیکھئے جب مسافر مدینہ منورہ سے بذریعہ کار خیبر جا رہا ہے، ظاہر ہے کہ مدینہ طیبہ اور اس کے قرب وجوار کی زمین کا ذرہ ذرہ آفتاب نبوت سے اکتساب نور کر چکا ہے، اس دیار کے پہاڑ، راستوں کے سنگریزے، درخت اور جھاڑیاں وادیاں اور کھائیاں غرضیکہ پوری فضا سرکار رسالتمآب ﷺ کے پسینہ کی خوشبو سے معطر رہ چکی ہے اس دیار کا سفر کرتے ہوئے ہر ہر قدم پر اگر یہ تصور اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ مسافر کے دل ودماغ پر چھا جائے تو اس کے سفر کی لذتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اس کا ایک منظر آپ بھی دیکھیں، مولانا عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''مدینہ طیبہ سے نکلنے کے بعد سڑک کے دونوں طرف دور تک پتھریلے ٹیلے نظر آتے ہیں، یہی وہ راستہ ہے جہاں سے صحرا نشینان عرب کے قافلے شام کا

رخ کیا کرتے تھے، خود سرکار دو عالم ﷺ کم از کم چار مرتبہ اسی راستے سے گذرے ہوں گے دو مرتبہ بعثت سے پہلے سفر شام کے لئے ایک مرتبہ خیبر پر حملے کے لئے اور ایک مرتبہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ان سنگلاخ ٹیلوں نے تاریخ انسانیت کی مقدس ہستیوں کا جلوہ جہاں آرا دیکھا ہوگا، انھوں نے سرکار دو عالم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرامؓ کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی ہوگی، تصور کی نگاہیں ان پہاڑیوں اور وادیوں میں انسانیت کے نجات دہندوں کے قافلوں اور ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کو اترتے چڑھتے دیکھتی رہیں اور ان تصورات نے اس سفر میں سیاحت سے زیادہ عقیدت و محبت اور تقدس کا رنگ پیدا کر دیا''

اسی طرح تبوک جاتے ہوئے بھی جس طرح ان کی مادی آنکھیں چاروں سمت میں حال کے نظاروں سے بہرہ اندوز ہو رہی ہیں اسی طرح انھوں نے اپنے تصور کی آنکھیں بھی وا کر رکھی ہیں جو قدم قدم پر خلاؤں میں اس فضا کو تلاش کرتی پھر رہی ہیں، جو کبھی یہاں کی سرزمین کو اپنے انوار و برکات سے مستفید کر رہی تھیں، تبوک کے نام سے تاریخ اسلام کی ابجد پڑھنے والا بھی واقف ہے، غزوۂ تبوک اپنی پوری ایک تاریخ رکھتا ہے اس کو جیش العسرۃ بھی کہا جاتا ہے، مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں جب ریگستان کا ذرہ ذرہ آگ اُگل رہا تھا سرکار دو عالم ﷺ اپنے ۳۰ ہزار جاں نثاروں کو لے کر اسی تپتے ہوئے صحرا سے گذرے تھے مسافر جب تبوک کی راہ پر آتا ہے تو اس کے تصورات و خیالات پر لگا کر اس فضا میں اڑ جاتے ہیں جس کو گذرے ہوئے چودہ سو برس سے زائد گذر چکے ہیں لیکن ''جہانِ دیدہ'' کے مسافر کی چشم تصور اتنی طاقتور ہے کہ ان تمام گذرے ہوئے مناظر کو سمیٹ لیتی ہے، مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

''میں سوچ رہا تھا کہ ہمارا یہ سفر سردی کے خوشگوار موسم میں ہو رہا ہے سفر کے لئے ایک دم نئی ایر کنڈیشنڈ کار میسر ہے، بحمداللہ زادِ سفر وافر ہے، شاندار پختہ سڑک ہے ۱۳۰ اور ۱۵۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار دوڑ رہی ہے، پھر بھی کبھی

کہیں ہلکا سا بھی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ اطمینان خاطر میسر ہے کہ انشاء اللہ شام تک تبوک پہنچ جائیں گے۔

لیکن یوں ہی لق ودق اور دل الٹ دینے والا صحرا تھا، سنبلہ کی قیامت خیز گرمی تھی جس میں آسمان آگ برساتا اور زمین شعلے اگلتی ہے نہ سڑک تھی نہ کاریں نہ گرمی سے بچنے کا کوئی انتظام، ایسی گرمی کے عالم میں سرکار دوعالم ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے غزوۂ تبوک کے موقعے پر متواتر دو ہفتے سے زیادہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ اس وحشتناک صحرا کو قطع فرمایا تھا، جہاں دور دور تک کسی جھاڑی کی کوئی پتی نظر نہیں آتی، اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تو اس غزوے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے لشکر نکل جانے کے بعد تن تنہا پیدل روانہ ہوگئے، **اللّٰہ اکبر**۔ آج ان حضرات کا عزم، حوصلے اور تن فراموشی کے تصور ہی سے پسینہ آتا ہے''

مسافر کو اگر اپنے مقامات سفر کی تاریخی حیثیت معلوم ہے تو وہاں کے تہذیبی وتمدنی حالات کی تصویر کشی بہتر طور پر کرسکے گا، اس کی تصویر کے خدوخال واضح بھی ہوں گے اور اس میں دلکشی وجاذبیت بھی ہوگی وہ جدید وقدیم دونوں ادوار کے مناظر کو بیک وقت پیش کرکے سفر نامہ کی افادیت میں بیش بہا اضافہ کرسکتا ہے، مولانا عثمانی ترکی کے سفر میں ہیں جو لوگ ترکی کی ماضی قریب کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں تقریباً دس سالوں تک خلافت تحریک جو ایک زلزلہ خیز تحریک بن کر رہی اس کا براہ راست تعلق ترکی ہی کی سرزمین سے تھا، ہندوستان کا بچہ بچہ اس تحریک سے واقف تھا اس دور میں ترکی کی خلافت ایک عالمی مسئلہ بن چکی تھی ہندوستان نے اس خلافت کو بچانے کے سلسلے میں بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں، لیکن مصطفیٰ کمال نے قبائے خلافت کو خود اپنے ہاتھوں تار تار کرکے دنیا کے مسلمانوں کا خون کردیا، ترکی کی سرزمین میں جب خود خلافت کو دفن کردیا گیا تو خلافتِ تحریک از خود مرگئی، کہاں ترکی خلافت کی تائید اس جذبے سے کی جارہی تھی کہ ترکی کی سرزمین

سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوگی، اس کے برعکس مصطفیٰ کمال نے اسی سرزمین کو اسلامی شعائر کا قبرستان بنادیا اور یورپین یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے زمام اقتدار ہاتھوں میں لے کر اسلامی زندگی کا گلا گھونٹ دیا، مولانا عثمانی جب ترکی پہنچے تو ان کے ذہن میں ترکی کی تاریخ کی پوری فلم چلنے لگی، انہوں نے ترکی کے ایک دینی مدرسہ کو دیکھا تو ان کا طائرِ فکر ماضی کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا، وہ لکھتے ہیں:

''صرف استنبول شہر میں اس قسم کے چھوٹے بڑے ۲۱۰ مدارس ہیں اور پورے ترکی میں پانچ ہزار، ان پانچ ہزار مدارس میں رجسٹرڈ طلبہ کی تعداد چھ لاکھ ہے، صرف استنبول کے مدارس کے دارالاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد چھ ہزار ہے، اس طرح یہ مدارس نئی نسل کو قرآن کریم اور ابتدائی دینیات سے روشناس کرانے کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ تمام مدارس سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں اور محکمۂ تعلیم کی طرف سے ان پر انسپکٹر مقرر ہیں۔

میں یہ مدرسہ دیکھتا اور اس کی تفصیلات سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی ترکی ہے جہاں کبھی کمال اتاترک نے قرآن کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سر پر دے مارا تھا؟ جہاں عربی زبان تو کجا قرآن کریم کی تعلیم اور عربی زبان کی اذان تک ممنوع قرار دیدی گئی تھی، کمال اتاترک نے ''ہیٹ دار'' کے دوران کہا تھا کہ ترکی ٹوپی کی جگہ اس قوم کو ہیٹ پہنا کر اس کا دماغ تبدیل کردے گا، لیکن آج اس قوم کی نئی نسل کے چھ لاکھ بچے عربی ٹوپیاں پہنے ہوئے اپنے سینوں میں قرآن محفوظ کررہے ہیں اس کی تعریف میں عربی ترانے گا رہے ہیں اور انھوں نے اپنا پورا وجود اس مقدس کتاب کے لئے وقف کررکھا ہے''

مولانا عثمانی اُردن گئے، اور اس کے دارالسلطنت عمان کی سیر کی اور اردن کے مشہور علاقہ اغوار کی بھی سیاحت کی، پھر وہیں سے وہ ''بحر مردار'' تک گئے س کی جو تفصیلات انھوں نے بیان کی ہیں ان سے بالکل ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ''جہاں دیدہ'' کی یہی خصوصیت سب سے اہم ہے کہ وہ حال کے مناظر کو سرسری طور

پر دیکھ کر یا ان پر طائرانہ نظر ڈال کر گذر نہیں جاتے بلکہ وہ ٹھہرتے ہیں اور رُک کر غور کرتے ہیں پیش نظر کے ساتھ پس منظر پر بھی پوری نظر رکھتے ہیں یہ ان کا عالمانہ اور محققانہ ذہن و مزاج ہے، حقیقت رسی ان کا مزاج بن چکی ہے، اس لئے وہ ''بحر مردار'' سے بھی سرسری نہیں گذر گئے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم یہیں کہیں آباد تھی، قرآن نے ان کی قوم پر عذاب آنے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور اس کی کیفیت بتاتے ہوئے کہا ہے **جعلنا عالیھا سافلھا** کی آیت پر مفسرین نے بڑی تفصیلی گفتگو اپنی اپنی کتابوں میں کی ہے، مولانا عثمانی جب اس مقام پر پہنچے ہیں تو سب سے پہلے اس مقام سے آپ کو روشناس کراتے ہیں اور اس کی جغرافیائی تشریح کرتے ہیں اور تفسیری روایات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں ایک نئی معنویت پیدا کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں:

''یہ چھوٹا سا سمندر ۵۰ میل لمبا اور گیارہ میل چوڑا ہے اس کی سطح کا کل رقبہ ۳۵۱ مربع میل ہے زیادہ سے زیادہ گہرائی ۱۳۰۰ فٹ ہے اس کی جغرافیائی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کسی بڑے سمندر سے کوئی رابطہ نہیں، اپنے طول وعرض کے لحاظ سے اس کو ایک جھیل کہنا زیادہ موزوں ہوگا لیکن چونکہ اس کا پانی خالص سمندری پانی ہے بلکہ اس کی نمکیات اور کیمیاوی اجزا عام سمندروں سے زیادہ ہین اس لئے اس کو بحر یا بحیرہ کہا جاتا ہے''

مولانا عثمانی نے دوسرا انکشاف یہ کیا ہے کہ یہ عام سطح سمندر سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے ہے اور یہاں سے قریب ترین بحر روم کی خلیج عقبہ ہے، بحر میت کی سطح اس کی سطح سے تیرہ سو فٹ نیچے ہے اس طرح انھوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ کرۂ زمین کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے، انھوں نے محققین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ یہاں حضرت لوط علیہ السلام سے پہلے کوئی سمندر نہیں تھا، ان حقائق کے اظہار کے بعد انھوں نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے:

''دنیا بھر میں سمندر کی سطح سے اتنا نیچا علاقہ کوئی نہیں ہے، مجھے جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ذہن فوراً قرآن کریم کی اس آیت کی طرف منتقل ہوا جس میں

اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی بستیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: **جعلنا عالیھا سافلھا**. ہم نے اس زمین کے بلند علاقے کو زمین کا پست علاقہ بنا دیا، عام طور پر اس آیت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ بستی اُلٹی گئی تو چھتیں زمین بوس ہوگئیں لیکن قرآن کریم کا یہ معجزانہ بیان شاید اس طرف بھی اشارہ کررہا ہے کہ صرف بستی کی عمارتیں ہی پست نہیں ہوئیں، بلکہ ان بستیوں کا پورا علاقہ روئے زمین کا پست ترین علاقہ بنا دیا گیا، چنانچہ بحرمیت کے شمال اور مشرق کی جانب کے علاقے تو ہم نے بھی دیکھے ہیں کہ وہاں میلوں دور سے زمین کی سطح بتدریج پست ہوتی چلی گئی ہے زمین کا جو حصہ سطح سمندر کے مساوی ہے وہاں علامت کے طور پر بورڈ لگا دیا گیا ہے کہ اس کے بعد ہر تھوڑے فاصلے پر سطح کی پستی کی مقدار بتانے کے لئے جگہ جگہ بورڈ لگے نظر آتے ہیں یہاں تک کہ پست ترین سطح بحرمیت پہنچ کر آئی''

مولانا عثمانی نے چین کی بھی سیاحت کی ہے اور اس کے دورافتادہ مقامات تک آپ پہنچے ہیں، بیکنگ کے عظیم الشان چوک سے لے کر دیوار چین تک کے مناظر دیکھتے ہیں، خاص طور پر چین کا وہ علاقہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کا بہت تفصیلی دورہ کیا ہے، کمیونزم اور سرخ انقلاب کی جبر وتشدد نے جو صورتِ حال وہاں پیدا کی اگرچہ اس کی تفصیل تو نہیں دی ہے، لیکن انہوں نے اپنا ایک مشاہدہ جو بیان کیا ہے وہ سرخ انقلاب کی ایک ایسی عبرتناک تصویر پیش کرتا ہے جو کئی صفحات پر بھاری ہے، اس کے تذکرے میں زبان وادب کی چاشنی بھی ہے اور نفسیات کی نکتہ رسی بھی، وہ چین کے صوبہ چھینگ ہائی کے دارالحکومت شننگ گئے، پھر وہاں سے اس صوبے کی مشہور مسلم اکثریت والے ضلع سالار کاؤنٹی پہنچے جہاں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ ہزار ہے اور ۹۴ مسجدیں ہیں، یہ وہ علاقہ جہاں اب تک کوئی غیر چینی نہیں پہنچا ہے، وہاں کی ایک مسجد میں مولانا عثمانی کے پہنچنے پر استقبالیہ دیا گیا اس کے بعد کا واقعہ ''جہانِ دیدہ'' کے لفظوں میں سنئے:

''جب امام صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں اس بات پر پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے چینی مسلمانوں کو حج پر جانے کے انتظامات کئے، تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے، نہ جانے یہ دور افتادہ مسلمان کب سے اپنے سینوں میں حج بیت اللہ کی آرزو چھپائے بیٹھے تھے اور نہ جانے کتنے لوگ یہ آرزو دل میں لئے دنیا سے رخصت بھی ہوگئے، اب اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حج کا راستہ کھولا ہے تو ان کے سینے مسرت وتشکر کے جذبات سے معمور ہیں اور اس نعمت پر شکر ادا کرتے نہیں تھکتے، یہ حضرات زبان کے اختلاف کی بناپر الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات کے اظہار پر قادر نہیں لیکن ان کے اخلاص ومحبت سے لبریز چہرے دل کی داستان سنانے کے لئے کافی تھے اور ان کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے آنسوان کے اخلاص کی وہ پونجی تھی جو اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں کے سامنے نچھاور کر رہے تھے، ان کے ان آنسوؤں میں ماضی کے صبر آزما حالات کی جو روح فرسا داستانیں پوشیدہ تھیں ان کے تصور ہی سے دل منہ کو آتا ہے''

مولانا عثمانی نے امریکہ کے سفر میں اس کے مشہور شہروں نیویارک، واشنگٹن اور چارلسٹن وغیرہ میں قیام کیا اور وہاں کے مناظر دیکھے، اور وہاں کے معاشرہ کو بنظر غائر دیکھا، پرکھا اور سمجھا، وہاں کی تہذیب وہاں کی تمدنی سہولیات، مجلسی اخلاق وعادات کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کئے ہیں امریکیوں کی فرض شناسی، احساس ذمہ داری، اصول وضوابط کی پابندی قانون کا احترام، سرکاری دفتروں میں شہریوں کی ضرورتوں کی فوری تکمیل، بہت دھیمی آواز میں بات کرنا، اجنبیوں کی مدد کرنا اپنی اخلاقی اور منصبی ذمہ داری سمجھتے ہیں، صبح سے شام تک جس انہماک کے ساتھ وہ اپنی دفتری ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں ان کی تعریف کرتے ہوئے مولانا عثمانی نہیں تھکتے وہ بتاتے ہیں کہ وہاں رشوت نام کی لعنت نہیں کام چوری سے ان کو کوئی واسطہ نہیں اشیاء خورد ونوش میں ملاوٹ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا معاملات عام طور پر صفائی اور

سچائی کے ساتھ انجام دیئے جاتے ہیں، دھوکہ یا فریب کا کوئی خطرہ نہیں، شور وشغب سے پرہیز ان کی فطرت، ہلکی آواز میں بات کرنا ان کی تہذیب ہے۔

غرضیکہ ہمارے ملک میں جو اخلاقی بیماریاں عام ہیں وہ امریکہ میں ناپید اور عنقاء ہیں، ان کی زندگی اصول پرستی اور باقاعدگی کا بہترین نمونہ ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس اعتبار سے امریکہ قابل رشک ہے یہ ان کی زندگی کا روشن پہلو ہے لیکن ان کی زندگی کا ایک اور رخ بھی ہے یہ رخ بھی ظاہر اور روشن ہے ''جہانِ دیدہ'' زندگی کے اس رخ پر بھی روشنی ڈالتا ہے، وہ اپنے مشاہدات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک ان کے جنسی طرز عمل کا تعلق ہے اس کے مناظر دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ وہی قوم جس کی شرافت واخلاق کے مظاہرے ہم دوسرے شعبوں میں دیکھ کر آئے ہیں صرف تفریح گاہوں پر ہی نہیں بارونق سڑکوں اور پرہجوم بازاروں میں، ٹرینوں اور بسوں میں، پبلک مقامات پر برسر عام بوس وکنار اور جنسی التذاد ایک عام بات ہے، جس کے پانچ سات مناظر دن بھر میں خواہی نخواہی نظر آہی جاتے ہیں، عورتوں کے لئے عریانی عیب تو کیا ہوتی شاید مایۂ افتخار سمجھی جاتی ہے، کپڑے نام کی جو چند تہمتیں ہوتی ہیں ستر پوشی کے نقطۂ نگاہ سے ان کا بھی کوئی مصرف سمجھ میں نہیں آتا اور خاص خاص مواقع پر بالکل برہنگی میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، جگہ جگہ ''مادر زاد رقاصائیں'' کے بورڈ فخر سے لگے نظر آتے ہیں، قحبہ خانوں کے اشتہارات ''مجالس حسن'' کے نام سے سر بازار تقسیم ہوتے ہیں، نیویارک کے بازاروں سے گذرتے ہوئے ایک شخص نے ایک اشتہار ہم جیسوں کے ہاتھ میں تھما دیا، جس میں چند برہنہ تصویروں کے ساتھ جلی حروف میں لکھا تھا ''ہمارے جسموں سے کھیلئے'' اشتہار میں جو کچھ لکھا تھا اسے ایک شریف آدمی کو پڑھنا بھی مشکل ہے، غرض یہ کہ جنسی طرز عمل کے لحاظ سے یہ قومیں بلا مبالغہ کتے اور بلیوں تک پہنچ گئی ہیں''

''جہانِ دیدہ'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں واقعات ومشاہدات کا سرسری بیان نہیں ہے کہ اس منظر کی شادابی اور رعنائی کو عمومی تعریفی جملوں میں ادا کر دیا جائے بلکہ اس منظر کے تمام اجزاء ترکیبی کی ایسی تفصیلات بھی بیان کر دی گئی ہیں کہ اس منظر کی خوبیوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، اور قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ خود اس منظر کے سامنے کھڑا ہے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

امریکہ کی نیاگرا آبشار کا حسین منظر عالمی شہرت رکھتا ہے، جس نے بھی اس قدرتی آبشار کو قریب سے دیکھا ہے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے، میں نے ان بیانات سے صرف اتنا ہی سمجھا ہے کہ وہ بڑا حیرتناک قدرتی آبشار ہے اس کی فضا بڑی رومانٹک ہے، لیکن یہ آبشار کیا ہے، اس کی اہمیت وخصوصیت کیا ہے اس کی شہرت کا راز کیا ہے؟ جب کہ دنیا کے دوسرے مقامات پر بھی قدرتی آبشار پائے جاتے ہیں، ''جہانِ دیدہ'' ان تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دیتا ہے۔

مصنف نے اس آبشار کا اتنا تفصیلی مشاہدہ کیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ گیا، نیاگرا کے نظارہ کی تفصیل میں تماشا بینی کا انداز نہیں بلکہ جیسے ایک ماہر ارضیات وجغرافیہ اور سائنسداں کی تحقیق اور حقیقت بینی کا انداز ہے، مولانا عثمانی اپنے مشاہدات تحریر فرماتے ہیں:

''نیاگرا مستقل ایک شہر ہے اور اسی کے کنارہ وہ شہرۂ آفاق آبشار واقع ہے جو اپنے قدرتی حسن کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کرشمۂ قدرت کی شہرت تو بچپن سے سنی ہوئی تھی لیکن اس کا دلکش منظر جسے دیکھ کر انسان بیساختہ فتبارك الله احسن الخالقین پکار اٹھتا ہے پہلی بار نظر نواز ہوا۔

نیاگرا دراصل ایک دریا ہے جو امریکہ کی چار جھیلوں سے مرکب ہے جس کے طاس کا مجموعی رقبہ دو لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل ہے جس مقام پر دریا نے دنیا کے مشہور ترین آبشار کی شکل اختیار کی ہے وہاں اس دریا کے راستہ میں ایک

نہایت گہرااور طویل وعریض نالہ حائل ہوگیا ہےاور جب یہ دریا ایک وسیع رقبہ میں زورشور سے بہتا ہوا اس نالے کے کنارے پہنچتا ہے تو اس کے پانی کا زبردست ریلا انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ نالے میں گرتا ہے، اس طرح پورے کا پورا دریا ایک آبشار کی شکل اختیار کرلیتا ہے،اس نالے کا مغربی سرا کنیڈا میں ہے اوراس کی شکل گھوڑے کی نعل کی سی ہے اسی لئے اس کو ”نعلی آبشار“ بھی کہا جاتا ہے دریا کے بیشتر حصہ یہیں سے نالہ میں گرتا ہے جو دوسری طرف یہاں سے بمشکل ایک فرلانگ کے فاصلے پر نالے کا جنوبی کنارا امریکہ میں ہے اور پانی کا باقی ماندہ حصہ چکر کاٹ کر اس کنارے سے نیچے گرتا ہے جسے امریکی آبشار کہا جاتا ہے، کنیڈا کا نعلی آبشار ہلالی نصف دائرہ کی شکل میں ہے اس نصف دائرے کا قطر دو ہزار چھ سوفٹ ہے اور نالے کی سطح سے اس کی اونچائی ۱۶۲ فٹ ہے گویا یہاں سے دریا کا بیشتر پانی نصف دائرے کی شکل میں ۵۰ میٹر سے زائد کی بلندی سے نالے میں گرتا ہے جس کا شور دور سے سنائی دیتا ہے اس کی اڑتی ہوئی چھینٹیں نالے کی نچلی سطح سے بلند ہوکر دریا کی اصل سطح سے بھی اونچی چلی جاتی ہیں اوران چھینٹوں کی وجہ سے ہر وقت آبشار کے سامنے ایک سفید بادل حرکت کرتا نظر آتا ہے، کہا جاتا ہے یہاں سے پانی ۶ کروڑ گیلن فی منٹ کے حساب سے گرتا ہے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ پانی کا یہ زبردست سیلاب اس جگہ کروڑوں سال سے اسی زور وشور سے کے ساتھ گر رہا ہے لیکن قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ نالے کا وہ کنارہ جہاں سے یہ لاکھوں ٹن پانی اس خوفناک دباؤ کے ساتھ گرتا ہے اور لاکھوں صدیوں سے اس کا صرف چند فٹ حصہ اب تک گھس کر جھڑ سکا ہے، پانی جوں کا توں قائم ہے **فتبارك الله احسن الخالقين**“

مولانا عثمانی نے نیاگرا آبشار کا نظارہ صرف زمین پر کھڑے ہوکر دیکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہیلی کاپٹر سے اُڑ کر اس آبشار کو آسمان کی بلندی سے بھی دیکھا ہے جہاں

سے دریا کے بہاؤ اور آبشار کی تشکیل اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو بچشم خود مشاہدہ کیا ہے لیکن اس ناپ تول اور پیمائش اور حساب کتاب کی تفصیل میں آبشار کی رومانی فضا تحلیل ہو کر رہ گئی جس کی عکاسی تمام سیاح اپنے سفر ناموں میں کرتے ہیں لذت پسند طبیعتیں جس حسن منظر کو لذت لے لے کر بیان کرتی ہیں اس سارے فسانے میں اس کا کوئی ذکر نہیں جن کو پڑھ کر قاری نادیدہ اس کا عاشق ہو جاتا ہے اور تخیل کے پر لگا کر وہاں پہنچ جانے کی کوشش کرتا ہے ''جہانِ دیدہ'' کا مسافر ایک ثقہ عالم ہے اس لئے صاف لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کرسکتا تھا صرف اشارہ ہی کرسکتا تھا اس لئے چند سطروں میں ہمیں بتادیا کہ اس آبشار کی سیاحت میں دلکشی اور جاذبیت کا راز کیا ہے مولانا عثمانی کہتے ہیں:

> ''آبشار کی شمال میں نیاگرا کی تفریح سے لطف اندوز ہونے کے لئے بڑے حسین پارک، رہائش گاہیں، ریستوران اور تفریحات کے بہت سے مراکز ہیں، اسی وجہ سے اس جگہ کو دنیا کی حسین ترین تفریح گاہ قرار دیا جاتا ہے جہاں لوگ کئی کئی ہفتے گذارتے ہیں لیکن اس وقت موسم سرد تھا اس لئے بہت کم سیاح آئے ہوئے تھے، اس بنا پر ہم جیسے لوگ یہاں اطمینان سے کچھ وقت گذار سکے ورنہ ہجوم کے زمانہ میں تو یہاں جو طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے اس کی موجودگی میں یہاں زیادہ ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے''

مولانا عثمانی نے فرانس کی بھی سیاحت کی ہے مگر یہ سیاحت سرسری طور پر تھی مگر فرانس کا دھڑکتا ہوا دل پیرس دیکھنا نہیں بھولے اور ہم کو اس کی ایک جھلک دکھائی ہے لیکن یہ جھلک دھوپ چھاؤں کی طرح نہیں بلکہ پیرس کی اندرونی تصویر تجریدی آرٹ کی شکل میں بتائی ہے کہ جب ان لکیروں کی معنویت پر غور کیا جائے تو ان آڑی ترچھی لکیروں میں جو اصل تصویر پوشیدہ ہے نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، پیرس کا انھوں نے ایک منظر دکھایا ہے مگر پورے پیرس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے انھوں نے اس شہر کے سب سے حسین بازار میں جا کر اس کی دلکشی و دل ربائی کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے، وہ

تحریر کرتے ہیں:

”پیرس اپنے حسن و جمال اور رعنائی کے اعتبار سے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا سرسبز، شاداب اور قدرتی حسن سے مالا مال شہر ہے، اس کی عمارتوں میں قدامت و جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے، نہایت مہنگا شہر ہونے کے باوجود اب بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے، یہاں کا مرکزی علاقہ شانزالیزے دنیا کے حسین ترین بازاروں میں شمار ہوتا ہے، جو اپنی وسعت، صفائی ستھرائی عمارتوں کی روایتی خوبصورتی اور دلکش درختوں کی دورویہ قطاروں کے لحاظ سے واقعتاً یہ ایک منفرد علاقہ ہے جسے چہل قدمی کے لئے بھی موزوں سمجھا جاتا ہے لیکن مغربی ممالک میں ایسے مقامات فسق و فجور کے بھی سب سے بڑے مرکز ہوتے ہیں اور ان کی ظلمت ہم جیسے کوردل بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے“

ان چند جملوں میں انھوں نے پیرس کے حسن و جمال اور اس کی رعنائی و زیبائی کے اظہار کے ساتھ اس کے اندرون میں جو ظلمت ہی ظلمت ہے اس کی طرف بھی اشارے کر دیئے ہیں جو لفظوں اور جملوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر حقیقت پا جانے کا ذہن رکھتے ہیں وہ ان الفاظ سے پیرس کے ظاہر و باطن دونوں کو بیک نظر دیکھ سکتے ہیں۔

انھوں نے جس منظر کی عکاسی کی ہے خود اس منظر کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور کہیں بھی طائرانہ نظر نہیں ڈالی ہے ان تمام مناظر کی عکاسی کے وقت ان کے ہاتھوں میں ایک ادیب عظیم کا قلم رہتا ہے جو لفظوں کے برمحل استعمال اور جملوں کی تراش وخراش سے خوب واقف ہوتا ہے، شانزالیزے بازار سے ذرا دوری پر دنیا کا مشہور ترین ٹاور بھی ہے صرف اس کا ذکر کر کے نہیں گذر گئے ہیں بلکہ اس کی ساخت سے لے کر اس کے خالق تک کا ہم سے تعارف کرا دیا ہے اسی کے ساتھ اس تاریخ سے بھی ہم کو روشناس کرا دیا ہے جس سے اس مشہور ٹاور کا تعلق ہے، پہلے وہ ہمارے سامنے اس کا پورا منظر پیش کرتے ہیں اور پھر ایک ایک چیز پر انگلیاں رکھ رکھ اس کی حقیقت

بتاتے ہیں، وہ شانزالیزے بازار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں بتاتے ہیں:

''شانزالیزے کی سڑک اس چوک پر ختم ہوتی ہے جس کے سامنے فرانس کی پارلیمنٹ کی شاندار عمارت ہے، اس چوک میں انقلاب فرانس کے وقت بادشاہ کو پھانسی دی گئی تھی، چوک کے دائیں جانب مشہور زمانہ ''ایفل ٹاور'' واقع ہے جو ۱۹۳۰ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت سمجھی جاتی تھی بعد میں جب نیویارک میں اس سے اونچی عمارتیں بن گئیں تو اس کی یہ حیثیت ختم ہوگئی لیکن اپنی خوبصورتی اور تکنک کے اعتبار سے اب بھی اس کا شمار دنیا کی حسین ترین تعمیرات میں ہوتا ہے اور آج بھی یہ سیاحت کا بڑا مرکز ہے ۹۸۴ فٹ بلند یہ ٹاور تمام تر لوہے کا بنا ہوا ہے''

چونکہ مولانا عثمانی کا ذہن ومزاج تحقیقی ہے اس لئے ان کی نگاہ جستجو حقائق کی تلاش میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے دوران سیاحت جب کوئی نئی بات سنی کوئی اصطلاح اور کوئی نیا لفظ آیا یا لفظ تو مشہور ہے مگر اس کی معنویت پر عقیدت وارادت کے تہ بہ تہ پردے پڑ گئے ہیں یا عوام الناس کی زبانوں پر وہ لفظ چڑھا ہوا ہے تو ان کی نگاہِ نکتہ رس اس کی تہ میں جا کر اس کی حقیقت کو تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہے، میں اس کی یہاں صرف دو مثالیں ذکر کروں گا۔

مولانا عثمانی اردن کے دارالحکومت عمان میں ہیں اور ایک ہوٹل میں مقیم ہیں وہ عمان کے مشہور مقامات کو دیکھنا چاہتے ہیں، جب وہ ہوٹل سے نکلے تو سب سے پہلے ان کو یہ بتایا گیا کہ یہاں ایک قدیم ترین اسٹیڈیم ہے جس کی تعمیر عہد رسالت سے بھی پہلے کی ہے یہ رومیوں کے دور کی تعمیر ہے، مولانا عثمانی لکھتے ہیں:

''ہوٹل کے بالکل برابر ایک قدیم اسٹیڈیم بنا ہوا ہے، قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ یہ عہد رسالت سے بھی پرانی عمارت کا کھنڈر ہے جو ٹھیک اسی طرز پر بنی ہوئی ہے جیسے آج کل کھیلوں کے اسٹیڈیم بنائے جاتے ہیں، ملک افضل نے بتایا کہ یہ رومی عہد کا بنا ہوا اسٹیڈیم ہے جو اس وقت کے مشہور اولمپک

کھیلوں کیلئے استعمال ہوتا تھا، اسٹیڈیم بنانے کا آغاز بھی اسی دور سے ہوا ہے۔
در حقیقت ''اسٹیڈیم'' ایک یونانی لفظ کی لاطینی ترمیم ہے لاطینی زبان میں ''اسٹیڈ'' (STADE) ایک مسافت کا پیمانہ تھا جو تقریباً ۶۰۶ قدم کے برابر ہوتی تھی، اس دور میں پیدل دوڑ کے لئے جو میدان بنایا جاتا تھا وہ ایک ''اسٹیڈ'' کی مسافت کا ہوتا تھا اس لئے اس کا نام اسٹیڈیم رکھا گیا شروع میں یہ نام صرف دوڑ کے میدان کے لئے استعمال ہوا لیکن اس دور میں چونکہ دوسرے کھیلوں کے بھی مقابلے ہوتے تھے اس لئے بعد میں توسعاً ہر قسم کے کھیلوں کا اسٹیڈیم کہا جانے لگا''

مولانا عثمانی عراق کے دورے پر ہیں انھوں نے بغداد میں چند دن گذارنے کے بعد کوفہ، بصرہ وغیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے اس مشہور جگہ پہنچے جسے اسلامی تاریخ میں میدان کربلا کہا جاتا ہے جو اب میدان کے بجائے ایک ترقی یافتہ شہر ہے اور ساری تمدنی سہولیات وہاں دستیاب ہیں یہاں بھی ان کا تحقیقی ذہن مصروف کار رہا انھوں نے ''جہانِ دیدہ'' میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا:

''تقریباً ظہر کے وقت ہم کربلا شہر میں داخل ہوئے اب یہ شہر خاصا بارونق اور شاید کوفہ اور نجف دونوں کے مقابلے میں زیادہ آباد ہے جس وقت حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حادثہ شہادت پیش آیا اس وقت یہ لق و دق صحرا تھا اس پورے علاقہ کو زمانہ قدیم میں ''طف'' کہتے تھے اور یہاں کا صحرا جس میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے کربلا کے نام سے مشہور تھا اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف اقوال مشہور ہیں، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ لفظ ''کربلة'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاؤں کے تلوے کی نرمی کے ہیں، یہ زمین چونکہ نرم تھی اس لئے اس کا نام کربلا رکھ دیا گیا، ''کربلا'' عربی زبان میں گندم صاف کرنے کو کہتے ہیں اس لئے بعض حضرات کا کہنا کہ اس سرزمین میں چونکہ روڑے پتھر نہیں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس زمین کو باقاعدہ

صاف کیا گیا ہے اس لئے اس کو کربلا کہتے ہیں، اس کے برعکس بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''کربل'' سے نکلا ہے، یہ ایک قسم کی گھاس کا نام ہے جو اس صحرا میں بکثرت پائی جاتی تھی اس لئے اس کا نام کربلا مشہور ہو گیا''

حاصل کلام یہ کہ ''جہانِ دیدہ'' دور جدید کا ایک ایسا سفرنامہ ہے جو ابتدا سے انتہا تک قاری کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے، اس سفرنامے میں اسلامی ممالک کا ذکر زیادہ ہے ان ممالک کا تعلق چونکہ اسلام کے عہد زریں سے ہے اس لئے انبیاء کے تذکرے آتے ہیں ان کے مقامات تبلیغ اور ان کی سرگرمیوں کی سرزمین کا ذکر آتا ہے، چونکہ ان ممالک کو صحابہ کرام نے فتح کیا ہے بہتوں کے مزارات بھی انھیں علاقوں میں ہیں ان کے اولوالعزم کارناموں ان کی جد جہد کے میدانوں اور صحراؤں کا بھی ذکر آتا ہے، ان مقدس ہستیوں کے ذکر سے قاری کے دل و دماغ میں جو ایک مقدس اور نورانی فضا بنتی ہے وہ اپنے تقدس اور پاکیزگی کے ساتھ بڑی دلکش ہوتی ہے اور قاری ان صفحات کو پڑھتے ہوئے ان نورانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے کیونکہ اس کا دل ان مقدس ہستیوں کی بے پناہ عقیدت و محبت سے لبریز ہے ''جہانِ دیدہ'' میں اس نورانی فضا کی تابندگی و رخشندگی کو ہر جگہ باقی رکھا گیا ہے، لیکن ان تمام صداقتوں کے اظہار کے لئے ہمارے مذہبی مدارس کی زبان یا لب ولہجہ اختیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ لفظوں کے انتخاب جملوں کے درد بست، ترتیب وسلیقہ، زبان و بیان اور پیشکش کے انداز میں شعر و ادب کی ایسی لطیف چاشنی ہے جس کو قاری محسوس تو کرتا ہے لیکن لفظوں میں اس کا بیان نہیں کرسکتا، یہ ''جہانِ دیدہ'' کی ایسی خصوصیت ہے جو اس کو عصر حاضر کے سفرناموں میں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری پر ایک نظر

کلیم عاجز کو کچھ بہت زیادہ لوگ نہیں جانتے، کیوں کہ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں اگر چہ انھوں نے ہندوستان کے کچھ بڑے مشاعروں میں شرکت کی اور اپنا کلام سنایا ہے اور داد وتحسین سے نوازے گئے مگر عوامی سطح کے مشاعروں سے وہ ہمیشہ گریزاں رہے، شہرت اور نام ونمود سے لاپرواہی اور بے نیازی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اپنا کلام رسالوں میں شائع کرنے کے لئے بھی نہیں بھیجتے ہیں، کسی نے ٹیپ ریکارڈ سے نقل کر کے شائع کر دیا تو یہ دوسری بات ہے، ایسے ایک حد تک غیر مشہور شاعر کے بارے میں جب میں نے فراق جیسے مغرور، خود پسند شاعر کا تبصرہ کلیم کی شاعری پر پڑھا تو حیرت زدہ ہو کر رہ گیا، کسی شاعر کے کلام کو خاطر میں نہ لانے والا کلیم پر کیوں رشک کرنے لگا، ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنے لگا دل نے کہا کلیم میں ضرور کوئی ایسا جوہر ہے جس کی قدر و قیمت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں، فراق یقیناً بڑے شاعر اور جوہری ہیں ان کی بات میں وزن ہے اور اس کی اہمیت ہے، فراق لکھتے ہیں:

''میں اپنی زندگی کی اہم خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز کا کلام خود ان کے منھ سے سننے کے مواقع ملتے رہے، اب تک لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سن کر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدر شناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے، لیکن جب میں نے کلیم عاجز صاحب کا کلام سنا تو شاعر اور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا اور ہم آہنگی، محبت اور نا قابل برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہو گئے، اور ان کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم عاجز صاحب پر غصہ آنے لگا کہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں، ان کے اس جرم اور قصور کے لئے میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا، اتنی دھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ لب ولہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہو سکتا ہے

اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا میں ان کا نام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا''

خود میں نے نہ کلیم عاجز کو دیکھا ہے نہ ان کی زبان سے کبھی ان کا کلام سنا ہے، البتہ ان کا کلام پڑھا ہے اور جب پڑھتا ہوں تو دل پر ایک ایسی کیفیت چھا جاتی ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے گلاب، بیلے، جوہی، چمبیلی کے پھولوں سے جب خوشبو دبے پاؤں چل کر قوت شامہ اور دل ودماغ پر چھا جاتی ہے تو کیا محسوس ہوتا ہے اور کیسا محسوس ہوتا قوت شامہ اور دل ودماغ کن کیفیات میں ڈوب جاتے ہیں ان کو لفظوں میں کیسے سمجھایا جا سکتا ہے، بڑا سے بڑا ادیب بھی ان کیفیات کو لفظوں میں قید کرنے سے عاجز ہے، کچھ یہی حال کلیم عاجز کی شاعری کا ہے انداز بیان بہت سیدھا سادہ، الفاظ عام فہم اور آسان مگر جب کلیم عاجز ان لفظوں کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں تو وہ سحر بن جاتے ہیں، جادو کے بول ہوجاتے ہیں، دل ودماغ کی دنیا میں ایسا ارتعاش واضطراب پیدا ہوجاتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جیسے کسی نے سحر کردیا ہے۔

کلیم عاجز انداز بیان کی سادگی کے ساتھ تلخ ترین حقائق کو ایسا خوبصورت ریشمی لباس پہنا دیتے ہیں کہ سطحی نظر دھوکا کھا جاتی ہے، قاری سمجھتا ہے کہ شاعر رنگین مزاج رُومان پرست اور طرحدار ہے، حسن وشباب کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہے، لیکن لذت آفرینی اور جواں دلوں کو گدگدا دینے والی اس کیفیت کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تو ریشمی لباس میں ایسا پیکر نگاہوں کے سامنے آتا ہے جو زخموں سے چور ہے اور درد وکرب کا مجسمہ ہے، یہی کلیم عاجز کی جادوگری ہے، شاید ان کی یہ کوشش ارادی ہے، کیوں کہ وہ خود کہتے ہیں

لگے ہے پھولؔ سننے میں ہر اک شعر
سمجھ لینے پہ انگارہ لگے ہے

ان کی شوخ لب ولہجہ والی ایک غزل ہے، سطحی نظر اس کو کچھ کا کچھ سمجھتی ہے لیکن

بات وہ نہیں جو عام اور سطحی نظر کا قاری سمجھتا ہے اس غزل کے دو شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

یہ رنگ اشکوں کا لال لال ہے پیارے ۞ بتا رہا ہے کہ کیا دل کا حال ہے پیارے
وہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ۞ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

ایک مشاعرے میں وہ یہ غزل پڑھ رہے تھے، اس شعر پر جوش مسرت میں ایک نوجوان نے بلند آواز سے کہا کلیم صاحب! یہ ستائیسواں سال ہے، اس شعر کو جنسیات سے جوڑنے کی غلطی کیوں ہوئی؟ اس شعر کا شوخ انداز بیان ہے جس سے سطحی نظر دھوکا کھا گئی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبوب سامنے ہے، پیار اور محبت کا ماحول ہے، بار بار پیارے کا لفظ استعمال کر کے بے تکلفی کا اظہار کیا جا رہا ہے، اور جرأت اتنی بڑھی کہ پوچھنے لگے، ''ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے'' کتنا شوخ کتنا جاندار شعر ہے، کتنے لذت انگیز جذبات کو ہوا دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے، الفاظ عام فہم، انداز بیان سادہ اور روز مرہ ہونے والی گفتگو کا ہے، کوئی بھی زندہ دل قاری ان شعروں کو پڑھتے ہوئے دل میں گدگدی ضرور محسوس کرے گا، لیکن بات وہ نہیں جو بظاہر معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ کلیم عاجز کی زندگی کے اس انتہائی کربناک المیہ کی ترجمانی ہے جس نے ان کو شاعر درد اور مصور بنا دیا، آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کے دل کا یہ زخم بالکل تازہ اور ہرا ہے اس المیہ نے ان کی زندگی کے دھارے کو ہی بدل دیا اس شعر میں اسی المیہ کا ذکر ہے انھوں نے اس شعر میں درد و کرب کی وہ داستان سنائی ہے جو دلوں کو چھلنی کر دے وہ المیہ یہ ہے، وطن کی آزادی سے چند ماہ پہلے کلکتہ، نواکھالی کے خوں ریز فسادات کے بعد بہار کو بلوائیوں اور قاتلوں نے اپنا نشانہ بنایا کلیم عاجز کے والد کی وفات ہو چکی تھی صرف ان کی والدہ تھیں اور ایک چھوٹی بہن، دونوں سے کلیم کو بے پناہ محبت تھی وہ ضلع پٹنہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھیں جو کلیم کا وطن تھا خوشحال زمینداروں کا گاؤں تھا کلیم اور ان کا چھوٹا بھائی نسیم پٹنہ شہر میں زیر تعلیم تھے اور والدہ اور چھوٹی بہن دونوں کلیم سے ملنے پٹنہ آئی تھیں چند دنوں بعد ہی گاؤں جانے کو تیار

ہوئیں تو کلیم نے ان کو پٹنہ جنکشن پر ٹرین میں سوار کرادیا، کلیم پلیٹ فارم پر کھڑے ٹرین چھوٹنے کا انتظار کرتے رہے ان کی والدہ کھڑکی پر سر رکھ کر سسک سسک کر رو پڑیں اور مسلسل روتی رہیں، چھوٹی بہن نے ایک بار ماں کو اور ایک بار بھیا کلیم کا چہرا دیکھا اور بلک کر رو پڑی، ماں اور بہن کے رونے کی کوئی وجہ نہ تھی وہ عید منانے گاؤں جارہی تھیں کلیم کو پٹنہ میں عید منانی تھی یہ طے تھا، پھر رونے کی کیا وجہ؟ کلیم حیرت زدہ کھڑے رہے ان کا دل ہر قسم کے احساسات سے خالی تھا، لیکن ان کو چند دنوں بعد سمجھ میں آیا کہ ماں اور بہن کے دلوں پر مستقبل میں پیش آنے والے المناک حادثہ کی پرچھائیاں پڑ گئیں اور انہوں نے قبل از وقت یہ سمجھ لیا کہ یہ آخری ملاقات ہے ماں بیٹے کو اور بہن اپنے پیارے بھیا کو آخری بار دیکھ رہی ہیں پھر اس زندگی میں دوبارہ ملاقات ممکن نہیں، کلیم کا دل ان احساسات سے خالی تھا چند دنوں بعد بقرعید تھی، ٹھیک تہوار کے دن دس ہزار مسلح بلوائیوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو گھیر لیا اور ۳ بجے دن میں اس آبادی کے ایک ایک فرد کو ذبح کر کے پھینک دیا کلیم کی ماں اور ان کی پیاری بہن کی لاشیں ایک کنویں سے ملیں، کلیم تیسرے دن پولیس کے ایک دستہ کے ساتھ اپنے گاؤں پہنچے، ماں بہن کی زخموں سے چور لاشیں دیکھیں، پورا گاؤں ویران ہو چکا تھا ہر طرف خون کے چکتے زمین پر پڑے ہوئے، اپنے گھر کے صحن میں جا کر بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر ان کو خبر نہیں کہ کیا ہوا اس حادثے نے ان کو پاگل بنادیا لبوں پر مہر سکوت لگ گئی روتے روتے آنکھوں کے آنسو سوکھ گئے تعلیم چھوٹ گئی، معاشی حالت تباہ ہوگئی تن بدن کا ہوش نہ رہا انیس بیس سال کی عمر کے اس نوجوان کی حالت کو دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، کلیم کے سارے عزیز و اقارب اسی گاؤں میں تھے ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا اب کلیم اور ان کا چھوٹا بھائی اس دنیا میں تنہا رہ گئے ان کی دنیا تباہ ہوگئی، چھ برسوں کا زمانہ انتہائی درد و کرب میں گزرا، اس المیہ کے چند مہینوں بعد ہندوستان آزاد ہو گیا، دونوں واقعات ایک ہی سال کے ہیں اس لئے کلیم نے کہا:

یہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ❁ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

یہ المیہ کلیم کے لئے زندگی بھر کا روگ ہو گیا، ان کی ہر غزل اسی سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے حتیٰ کہ نعت پاک بھی لکھتے ہیں تو اس المیہ کو فراموش نہیں کر پاتے ایک نعت میں صبا کو مخاطب کر کے کہا ؂

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اجالے میں
لٹا ہے تیرے غلاموں کا قافلہ کہیو

اس المیہ نے ان کے ذہن کے سانچوں کو بدل کر رکھ دیا اب جو بات بھی ان کی زبان سے نکلتی ہے وہ اسی درد و کرب کے سانچے میں ڈھل کر نکلتی ہے دکھ درد کی کسک ہر جگہ محسوس ہو گی ان کا پیرایۂ بیان ضرور شوخ ہے لیکن یہ ان کی شرافت، وضعداری اور صبر و تحمل کا کمال ہے کہ وہ اپنی دکھ بھری کہانی بھی ہنس ہنس کر سناتے ہیں۔

چھ برس بعد جب ان کی زبان کھلی اور ۱۹۵۲ء میں اپنی سب سے پہلی غزل پٹنہ کے مشاعرے میں سنائی درد و کرب کی کہانی اور اس پر کلیم عاجز کا پرسوز ماتم، خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا، غزل کا لب و لہجہ دھیما ضرور ہے لیکن درد کی کسک بڑی جان لیوا ہے، یہ ذہن میں رہے کہ یہ غزل اس وقت پڑھی جا رہی ہے جب گلستان وطن میں آزادی کی بہار آ چکی تھی، سارا چمن غنچوں اور پھولوں سے مہک اٹھا تھا، ہر شاخ پھولوں سے لدی ہوئی ہے، ہوا کے نرم جھونکوں سے پھول شاخوں پر مست شرابی کی طرح جھوم رہے ہیں ہر طرف بہجت و سرور کا سماں ہے لیکن اس بہار پر کس کی اجارہ داری تھی، یہ سارے پھول کس کے بستروں کی زینت تھے یہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں، اور آدھی صدی کے بعد بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ پھول کس کے لئے اور کانٹے کس کے دامن میں ہیں اسی ماحول میں کلیم اپنی غزل سنا رہے ہیں ؂

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھے کیا دیا ❁ تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
گو ستم نے تیرے ہر اک طرح مجھے ناامید بنا دیا ❁ یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دکھا دیا
کوئی بزم ہو، کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے ❁ جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں ❁ ترے گیسوؤں کو سنوار کر تجھے آئینہ بھی دکھا دیا

یہ غریب عاجز بے وطن یہ غبار خاطر انجمن ۞ یہ خراب جس کے لئے ہوا اسی بے وفا نے بھلا دیا

کلیم کا غمناک ترنم، گلے کا سوز، آواز کا درد اور ہر شعر کے اندر چھپی ہوئی سوزِ غم کی حرارت نے دلوں کو ہلکی آنچ دے کر آنکھوں سے آنسو جاری کر دیئے اور بزم مشاعرہ ماتم کدہ بن گئی۔

کلم عاجز کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں عروس غزل دہرے لباس میں آتی ہے اوپر کا لباس خالص ریشمی، رنگ بہت شوخ اور چمکیلا ہوتا ہے جیسے بنارسی زری کی سنہری چادر جس پر سونے کے تاروں سے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں لیکن جب یہ حسین چادر علیحدہ کر دی جاتی ہے تو اندر کا لباس لہولہان، خون کے بڑے بڑے دھبے اور کہیں رستے ہوئے زخموں سے چپکا ہوا نظر آتا ہے جیسے پورا جسم زخموں سے چور ہے، یہ کربناک منظر دیکھ کر ہر آنکھ نم ہو جاتی ہے، دل دھڑکنا بھول جاتا ہے اور آنکھیں سیلاب اشک بہانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، بطور مثال صرف ایک غزل کے چند اشعار پیش ہیں غزل جو تصوراتی منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ ایسا ہے جو جذبات میں آگ لگا دیتا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ کوئی الھڑ پیکر حسن و شباب نشۂ جوانی میں مستانہ وار اپنے حسن و شباب کی قیامت خیزیوں کی نمائش کر رہا ہے اور دعوت نظارہ دے رہا ہے، الفاظ یہی کہتے ہیں کہ، انداز بیان کی شوخی اسی کی غمازی کرتی ہے، لیکن کلیم عاجز کا ہرگز یہ مقصد نہیں، ان کا محبوب آزاد ہندوستان ہے اور اس کے ظالم و جابر حکمراں جو انصاف و قانون کو پیروں سے روندر ہے ہیں ظلم و ستم ان کا شعار بن چکا ہے نفرت کا زہر پورے وطن میں پھیلا کر ایک طبقہ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے دشمنان امن و انصاف ملک کی دولت کو بے محابا لٹاتے ہیں، اور خود لوٹتے ہیں کروڑوں اور اربوں کے گھپلے کرتے ہیں اپنوں کو پہنچان کر نوازتے ہیں بے قصور انسانوں کی راہوں میں کانٹے بوتے ہیں کلیم انہیں کو ''پیارے'' ''دوست'' ''محبوب'' ''جاناں'' کے روایتی لفظوں سے یاد کرتے ہیں ان کی پوری شاعری میں کہیں بھی اردو شاعری کے محبوب کا گزر نہیں، نہ کہیں اس کی پرچھائیں نظر آئیں گی، انہیں انسانیت دشمن رویوں

کو استعاروں کی زبان میں پیش کرتے ہیں اس تفصیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ایک شوخ غزل کے اشعار دیکھئے

روز ایک غزل ہم سے کہلوائے چلو ہو ❁ اس ناز سے انداز سے تم ہائے چلو ہو
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو ❁ رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
پینا نہیں آتا ہے تو چھلکائے چلو ہو ❁ مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ
تم کیا ہو؟ تمہیں سب سے کہلوائے چلو ہو ❁ ہم کچھ نہیں کہتے ہیں کوئی کچھ نہیں کہتا
زلفوں سے زیادہ تم ہی بل کھائے چلو ہو ❁ زلفوں کی تو فطرت ہی ہے لیکن مرے پیارے
تم ہو کہ کلیم اپنی غزل گائے چلو ہو ❁ وہ شوخ ستم گر تو ستم ڈھائے چلے ہے

کلیم عاجز اپنا گھر بار لٹا کر ماں اور بہن کی شہادت کے کربناک منظر کو دیکھ کر دل پر غموں کا پہاڑ اٹھا کر بے وطن ہوئے لیکن فطری وقار، ذاتی شرافت، وضعداری، شائستگی، ان کے خمیر میں شامل ہے اور ہمیشہ ملحوظ رہی اپنے دشمن کے لئے بھی اپنی خاندانی شرافت وتہذیب کو فراموش نہیں کیا غیرت وخودداری ان کے خمیر میں شامل ہے وہ اسلام کے نام لیوا ہیں اس سرزمین پر بسنے والے عام مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، مظلومیت وبے چارگی کی تمام قیامتوں سے گذرنے کے باوجود کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے وہ اپنے آباواجداد اور اپنے اسلاف کے اخلاق اور اسلامی تہذیب کے وارث وامین ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہماری قومی تاریخ عزت واقتدار کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے لیکن آج اقتدار کی کرسیوں پر وہ لوگ متمکن ہیں جو آداب حکومت سے ناواقف یک بیک پستی سے بلندی پر آگئے ان کا لب ولہجہ غیرت وحمیت کو ٹھیس لگانے والا اور ہتک آمیز ہوتا ہے اس وقت جب ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو کبھی کبھی عام مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کچھ کہتے ہیں لیکن وہ انتہائی سنجیدگی اور نرم لب ولہجہ میں دشمن جانی کو دوست کہنا نہیں بھولتے، ارباب حکومت کو صرف باخبر کرتے ہیں کلیم عاجز کہتے ہیں:

ہم بھی اے دوست! کا کھنڈر ہیں اپنے گھر کے ❁ اس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اونچا کر کے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی جو نا قابل فراموش قربانیاں ہیں جن کے صدقہ میں آج ان کو تخت و تاج کی سرخ روئی نصیب ہوئی ان کا دور دور تک ذکر نہیں، کیوں کہ شریف انسان احسان کر کے جتلاتا نہیں، اپنی تمام قربانیوں کے باوجود اس کا صلہ نہیں مانگا، اور نہ اقتدار میں حصہ داری کا دعویٰ کیا بلکہ وطن کے لئے خود کو تباہ کر کے دوسروں کو سر بلند کر دیا

غیر کو بخش دیئے ساغر و مینا بھر کے ❁ ایک چلو بھی نہ اپنے لئے باقی رکھا
تاج گوا اوروں کے سر پر ہیں ہمارے سر کے ❁ ہم کو با ایں ہمہ پہنچان رہی ہے دنیا
زندگی ہے تو دکھادیں گے کسی دن مر کے ❁ تم نے دیکھی ہی نہیں ہمت مردان وفا
اس دیوالی میں دیئے بجھ گئے کتنے گھر کے ❁ تم تو مصروف چراغاں تھے تمہیں کیا معلوم
یہ نہ سمجھو کہ بھکاری ہیں تمہارے در کے ❁ کیا کہیں پاس محبت انہیں اٹھنے دیتا

کلیم کی ذہنی ساخت اور ان کے لب ولہجہ کی غمناکی کی ایک مثال عربی تاریخ میں ملتی ہے عرب کی ایک شاعرہ خنساء کو اپنے بھائی مالک سے بے پناہ محبت تھی اتفاق سے مالک کی وفات ہوگئی، خنساء کے دل پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا دن رات کلیجہ توڑ توڑ کر روتی رہتی پھر اس نے اپنے بھائی کی موت پر ایک دردناک مرثیہ لکھا، یہ مرثیہ اس کی زندگی کا ایک عنصر بن گیا، کہیں بھی جاتی یہ مرثیہ پڑھتی، خود بھی روتی اور دوسروں کو رلاتی، اس نے اپنے درد و غم کی انتہاء بتاتے ہوئے اپنے مرثیہ میں لکھا ہے کہ جب میں کہیں بھی کسی کی قبر دیکھ لیتی ہوں تو سمجھتی ہوں کہ یہ میرے بھائی مالک کی قبر ہے اور بے اختیار رو پڑتی ہوں ہر طرف اس کو مالک کی وفات کا غم بکھرا ہوا نظر آتا کائنات کی ہر چیز میں اس کو اپنے درد و غم کی تصویر نظر آجاتی تھی اور اس کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں، زندگی بھر وہ صرف مرثیہ ہی لکھتی رہی، یہ اس کا وظیفۂ زندگی بن گیا، کچھ ایسا ہی حال کلیم عاجز کا بھی ہوگیا، ابتداءً تو ان کا المیہ ذاتی المیہ بنا رہا لیکن پھر دل کی یہ کیفیت ہوئی کہ اپنے گرد و پیش جن حالات و واقعات کو دیکھتے تو ان پر اپنے غم کی پرچھائیاں پڑتی نظر آتیں اور اس کا غمناک پہلو نگاہوں کے سامنے آجاتا ان حالات و واقعات

کے بیان میں بھی وہی غمناک لب ولہجہ پیدا ہو جاتا جو کبھی ان کو ذاتی المیہ کے ذکر کے وقت ہوتا تھا، مرورِ ایام ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے لیکن برسوں پہلے جو چوٹ لگی تھی جب پروائی ہوا چلتی ہے تو وہ چوٹ اُبھر آتی ہے، اسی طرح کلیم عاجز کا زخم مندمل ہو گیا مگر وقت اور حالات کی جب پروائی چلتی ہے تو دل میں ایک میٹھا میٹھا درد ضرور جاگ جاتا ہے، چونکہ ان کے المیہ کا وطن کی آزادی سے گہرا تعلق ہے، ان کی غم کی کہانی اور آزادی دونوں ایک ہی سال کی پیداوار ہیں بلکہ یہ حالات ہی آزادی کا پیش خیمہ تھے اور انھیں میں کلیم عاجز کا ذاتی المیہ بھی شامل ہے اس لئے جب وہ آزاد ہندوستان کے حالات وواقعات کو دیکھتے ہیں نئے حکمرانوں کا طرز عمل، ہزاروں فسادات، قتل وغارتگری لوٹ کھسوٹ کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تو ان کا دل درد سے بھر آتا ہے ان کے دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے اور دل کے پورے درد کے ساتھ ان حالات پر تنقید کرتے ہیں، اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہیں، اپنوں کی مظلومیت دیکھ کر تلملا جاتے ہیں تو شکایت بھی کرتے ہیں لیکن ان کی وضعداری کا یہ عالم ہے کہ اپنے لب ولہجہ میں کہیں تلخی نہیں آنے دیتے جب کہ اس طرح کے حالات میں جو انسان کی زندگی کو تاراج کر دیں کوئی بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھتا، وحشت و بربریت اور جبر وتشدد کا مظاہرہ کہ آدمی کو وطن سے بے وطن کر دے عزیز واقارب کو بیدردی سے قتل کر دیا جائے انسان میں غصہ، نفرت، انتقام کا جذبہ سخت اور درشت الفاظ کا استعمال بالکل فطری ہے لیکن کلیم عاجز کی پوری شاعری میں ہم کو کہیں جوش انتقام کے جذبات، نفرت وغصہ کا مظاہرہ نظر نہیں آتا، ہر جگہ اپنے قاتل کو پیار سے مخاطب کرتے ہیں، دوست کہتے ہیں، پیارے کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں، عجیب دل گردے کے آدمی ہیں، یہ ان کی طبعی شرافت ہے اگر کوئی کمینہ فطرت دشنام طرازی اور بدزبانی کرتا ہے تو ایک شریف اور وضعدار انسان خود وہ لب ولہجہ اختیار نہیں کر سکتا، گندے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا آزاد ہندوستان کے نئے نئے حکمراں آداب حکومت سے ناآشنا ان کا لب ولہجہ بسا اوقات اہانت آمیز اور رعونت بھرا ہوتا، کون ان کا مخاطب

ہے، وہ اپنے سماج میں کس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کی ان کو کوئی تمیز نہیں تھی ان کا انداز خطاب بسا اوقات غیرت وخودداری، فطری شرافت ووضعداری کا کلیجہ چھلنی کرنے والا ہوتا جو کسی کے لئے بھی ناقابل برداشت ہوسکتا تھا لیکن کلیم عاجز کو جب اس طرح کے اہانت آمیز رویہ سے سابقہ پڑتا تو ان کی فطری شرافت غصہ کا مظاہرہ کرنے میں حائل ہو جاتی ہے، اس کو جاہل بدتہذیب ظالم نہیں کہتے الٹے اس کو بڑی محبت سے دوست کہتے ہیں اور بہت نرم لہجہ میں صرف اتنا کہتے ہیں:

ہم بھی اے دوست! کُھد ار ہیں اپنے گھر کے

آج تم اقتدار کی کرسی پر قابض ہو کل اس کرسی اقتدار کے ہم مالک تھے اس لئے تم کو اپنا لب ولہجہ اور رویہ بدلنا چاہئے، یہی وضعداری کلیم عاجز کی پوری شاعری میں نظر آتی ہے یہ بات تصنع سے نہیں آسکتی جب تک وہ خود انسان کی فطرت نہ ہو، دنیا تو اس فلسفہ زندگی پر یقین رکھتی ہے۔

کلوخ انداز را پاداش سنگ ست

مگر کلیم عاجز گالیاں سن کر بھی پھول برساتے ہیں کیوں کہ کائنات کے سب سے عظیم ومحترم رسول کا طرزعمل یہی تھا۔

کلیم عاجز کے اس شاعرانہ رویہ کو سمجھنے کے لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کردوں ان مثالوں پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ یقین کرلیں کہ کلیم عاجز کا محبوب اردو شاعری کا فرضی محبوب نہیں ہے ان کا محبوب اور مخاطب آزاد ہندوستان اور اس کے حکمراں ہیں بالخصوص وہ لوگ ہیں جنہوں نے فرقہ وارایت کا زہر پھیلا کر اس سرزمین میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے، انہیں کو ''دوست'' یا ''پیارے'' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں کلیم عاجز کہتے ہیں:

بازی وفا کی ہار کے پیارے نہ جائیں گے ۞ کیا دن ترے ستم کے گذارے نہ جائیں گے
دریائے غم میں پانی اگرچہ ڈباؤ ہے ۞ ہم ڈوبنے کے ڈر سے کنارے نہ جائیں گے

تم تو بیدرد ہو بیتابیٔ غم کیا جانو ۞ اہل دل پر جو گذرتے ہیں ستم کیا جانو
شمع کیوں جلتی ہے سرتا بقدم کیا جانو ۞ ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ غم کیا جانو
تم سے ناحق ہے مجھے چشم وفا کی امید ۞ تم بھلا شیوۂ ارباب کرم کیا جانو

۞

رہے تو دونوں چمن میں مگر بہم نہ رہے ۞ خزاں میں تم نہ رہے تو فصل گل میں ہم نہ رہے

۞

میں محبت نہ چھپاؤں، تو عداوت نہ چھپا ۞ نہ یہی راز میں اب ہے نہ وہی راز میں ہے
پہلے سب کچھ مرے خلوتکدۂ شوق میں تھا ۞ اب تو جو کچھ ہے تری انجمن ناز میں ہے

۞

وہ تو بے درد ہے ایسا کہ بتائے نہ بنے ۞ دل وہ کمبخت کہ بے اس سے لگائے نہ بنے
کیا ستم ہے کہ وہ ظالم بھی ہے محبوب بھی ہے ۞ یاد کرتے نہ بنے اور بھلائے نہ بنے

۞

زخم دل کا وہ نظارہ ہے کہ جی جانے ہے ۞ اتنا احسان تمہارا ہے کہ جی جانے ہے
مہرباں حال پہ ہیں آپ ہمارے جب سے ۞ تب سے وہ حال ہمارا ہے کہ جی جانے ہے

آزاد ہندوستان میں ہزاروں فسادات ہوئے، ہزاروں بے گناہ انسان مارے گئے، گھروں میں آگ لگا کر پھونک دیا گیا، پوری پوری آبادی کو لوٹ کر کنگال بنا دیا گیا، خواتین کی عصمت دری کی گئی لیکن آج تک وہ قاتل، لٹیرے، آتشزنی کرنے والے، عفت وعصمت کے لٹیرے نہ کہیں گرفتار کئے گئے نہ ان پر مقدمات چلے اور نہ سزا ملی، انصاف اور قانون کہاں چلا گیا، انصاف اور قانون دونوں مفلوج ہو کر اس لئے رہ گئے کہ مجرم سب اپنے تھے تباہ وبرباد اور قتل ہونے والے غیر تھے اس لئے کوئی مجرم نہ رہا، لاقانونیت اور بے انصافی کی دنیا کی تاریخ میں یہ بدترین مثال ہے۔

کلیم عاجز نے دہلی کے ایک مشاعرہ میں پرائم منسٹر کی موجودگی میں ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر تو بیت الغزل تھا، کلیم عاجز نے پڑھا:

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پر کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اتنا خوبصورت، تیکھا، دلوں میں پیوست ہونے والا طنز کلیم عاجز ہی کر سکتے ہیں، اس غزل کے چند اشعار اور بھی سماعت فرمالیں تو بات اور واضح ہو جائے گی، کلیم عاجز کہتے ہیں:

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو ۞ وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو
ہم خاک نشیں تم سخن آرائے سرِ بام ۞ پاس آ کے ملو، دور سے کیا بات کرو ہو

اگلے شعر میں بھرپور طنز ہے وہ تیر کے بہتر نشتروں میں بلا تکلف شمار کیا جا سکتا ہے:

ہم کو جو ملا ہے وہ تمہیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمہیں؟ کیا بات کرو ہو

ظالم کے ظلم کو احسان کہنا بڑے ظرف کی بات ہے لیکن کلیم اپنے ذہن کے سانچے سے مجبور ہیں اس سانچے سے جو بات ڈھل کر نکلتی ہے نہ اس میں تلخی ہوگی نہ کڑواہٹ، نہایت کڑوی کسیلی حقیقت ہوگی لیکن کلیم عاجز کا لب ولہجہ شیریں اور شہد سے زیادہ میٹھا، البتہ اس طنز کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سے ذہانت ضروری ہے کلیم عاجز کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمالیں:

خدا کا شکر ہے احساں فراموشی نہیں آتی ۞ ہمیشہ آپ کے بخشے ہوئے غم یاد آئیں گے
بہت یاد آئیگی بے التفاتی چشم ساقی کی ۞ یہ شیشے، یہ سبو، یہ جام تو کم یاد آئیں گے

کلیم عاجز جانتے ہیں کہ پورے ملک میں فرقہ پرستی کا زہر پھیل چکا ہے، کوئی پاگل جنونی فرقہ پرست کوئی زہریلا بیان دے دیتا ہے فضا میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے، افواہوں میں ایک طبقہ خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی بابری مسجد کبھی کشمیر کا مسئلہ کبھی دہشت گردی کا الزام، کبھی دینی مدارس کے خلاف قانون سازی کی دھمکی سینوں میں کانٹوں کی طرح چبھ جاتی ہے اسی ماحول میں زندگی گذرتی ہے اسی ماحول کو دیکھ کر کلیم عاجز کہتے ہیں:

تمہاری طرح زلفوں میں شکن والے نہیں ہیں ہم ۞ کہیں گے بات سیدھی، پیچ وخم والے نہیں ہیں ہم
گلوں کی طرح ہم نے عمر کانٹوں میں بسر کی ہے ۞ ہیں اہل ناز، لیکن ناز کے پالے نہیں ہیں ہم

زندگی میں ہر طرح کے مرحلے آتے ہیں کبھی کبھی تو صبر وضبط کی طاقت جواب دے جاتی ہے لیکن کلیم عاجز کے لب ولہجہ کی نرمی ہر حال میں قائم رہتی ہے محبوب ستم شعار کو ہمدردانہ مشورہ دیتے ہیں ظلم وستم کے انجام سے ڈراتے ہیں اپنا رویہ بدلنے پر اصرار کرتے ہیں مگر بول میٹھے ہی رہتے ہیں کتنی دلسوزی سے کہتے ہیں:

جدا جب تک تری زلفوں کے پیچ وخم نہیں ہوں گے ۞ ستم دنیا میں بڑھتے ہی رہیں گے کم نہیں ہوں گے
اگر بڑھتا رہا یونہی یہ سودائے ستم گاری ۞ تمہی رسوا سر بازار ہوگے ہم نہیں ہوں گے

میں کہاں تک مثالیں پیش کروں کلیم عاجز کی پوری شاعری اسی محور پر گردش کرتی ہے کیوں کہ خود انہیں نے اپنا مسلک، اپنا ذہن ومزاج انسان دوستی، انسانیت نوازی بتایا ہے، دوست دشمن کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھڑی کرتے کیوں کہ وہ جس قوم وملت کے فرد ہیں اس کی تعلیم ہی انسان دوستی باہمی روادی ہے انھوں نے ایک شعر میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

پھر اس صورت حال میں ان کے لب ولہجہ میں سختی اور درشتی کیسے آسکتی ہے، ان کی پوری شاعری کو اس کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

کلیم عاجز کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا انداز بیان غمناک اور درد سے بھرا ہوا ہے، لب ولہجہ کی غمناکی، طریقۂ اظہار میں بلا کا سوز وگداز ہے جیسے کوئی بہت ستم رسیدہ شخص تھرتھراتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی روداد غم بیان کررہا ہے جو پتھر دل انسانوں کو بھی برف کی طرح پگھلا دے، پوری پوری غزل کبھی اسی سوز وگداز اور درد وکرب کی فضا میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی اور مسلسل غزل کی شکل اختیار کرگئی اور بیشتر غزلوں میں جب ان کو اپنا قصۂ غم یاد آگیا وہیں رقت قلب اپنا

کام کرگئی اوران کا لب ولہجہ غمناک ہوگیا، اور سننے والوں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ان کی یہ غزل دیکھئے:

مری شاعری میں نہ رقص جام نہ مے کی رنگ فشانیاں
وہی دکھ بھروں کی حکایتیں وہی دل جلوں کی کہانیاں
یہ جو آہ ونالہ ودرد ہیں کسی بے وفا کی نشانیاں
یہی میرے دن کی رفیق ہیں یہی میری رات کی رانیاں
یہ میری زباں پہ غزل نہیں میں سنا رہا ہوں کہانیاں
کہ کسی کے عہد شباب پر مٹی کیسی کیسی جوانیاں
کبھی آنسوؤں کو سکھا گئیں میرے سوز دل کر حرارتیں
کبھی دل کی ناؤ ڈبو گئیں میرے آنسوؤں کی روانیاں

آزاد ہندوستان کے نئے حکمرانوں کی لاقانونیت بے انصافی ان کی عصبیت بھرے طرز عمل کی وجہ سے اس سرزمین پر بسنے والے ایک طبقہ کو کن کن قیامتوں سے گذرنا پڑرہاہے؟ کلیم عاجز کہتے ہیں:

ابھی اس کو اس کی خبر نہیں کہ قدم کہاں ہے نظر کہاں
ابھی مصلحت کا گذر کہاں کہ نئی نئی ہیں جوانیاں

ان کے لب ولہجہ کی غمناکی، اوران کے اندرونی سوز وگداز کی ایک مثال اور بھی دیکھ لیجئے:

مرا حال پوچھ کے ہم نشیں مرے سوز دل کو ہوا نہ دے
یہی بس دعا میں کروں ہوں اب کہ یہ غم کسی کو خدا نہ دے
یہ جو زخم دل کو پکائے ہم، لئے پھر رہے ہیں چھپائے غم
کوئی ناشناس مزاج غم، کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

کلیم عاجز بہر حال ایک خود دار اور غیرت مند آدمی ہیں گردن کٹ سکتی ہے جھک نہیں سکتی اس لئے اپنے سارے درد وکرب کے باوجود کرسی اقتدار پر بیٹھ کر

لفاظیاں کر رہے ہو وہ برسوں ہمارے قدموں کے نیچے رہی ہے۔

تو جہاں سے آج ہے نکتہ چیں کبھی مدتوں میں رہا وہیں
میں گدائے راہ گذر نہیں، مجھے دور ہی سے صدا نہ دے

☆☆☆☆☆

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل سناؤں ہوں اس لئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

مثالیں تو بہت سی ہیں، ان کا ایک شعر ان کے رویۂ شاعری کو سمجھنے کے لئے کافی ہے جس میں خوبصورت الفاظ و انداز بیان کے ریشمی پردوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا ہے وہی شعر درحقیقت ان کی شاعری کا بہترین تعارف ہے، وہ کہتے ہیں:

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ٹپکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

کلیم عاجز کی ایک خصوصیت طنز بھی ہے آزاد ہندوستان کے قانون و انصاف سے نابلد حکمرانوں کے طرز عمل پر ان کی تنقید اور طنز بہت معنی خیز اور جاندار ہیں مگر یہاں بھی وہ اپنی وضعداری و شرافت اور لب ولہجہ کی نرمی کو فراموش نہیں کرتے، طنز کے لئے اتنا خوبصورت اور دلکش انداز بیان اختیار کرتے ہیں جیسے وہ پھول برسا رہے ہیں، لیکن پھول کی پنکھڑیوں سے وہ نیزوں کی انی کا کام لے رہے ہیں یہ انداز بیان ان کی درمیانی دور کی شاعری سے لے کر اب تک قائم ہے، مثلاً

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ ۞ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

☆☆☆☆

جو کچھ مجھے تکلیف ہے جو کچھ مجھے غم ہے ۞ سب آپ کی بخشش ہے عنایت ہے کرم ہے

☆☆☆☆

شکریہ ہے کہ میں احسان فراموش نہیں ۞ عمر بھر آپ کا بخشا ہوا غم یاد رہا

☆☆☆☆

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں ۞ چلنا ذرا آیا ہے، تو اترائے چلو ہو

☆☆☆☆

مے میں کوئی خامی ہے نہ ساغر میں کوئی کھوٹ ۞ پینا نہیں آتا ہے تو چھلکائے چلو ہو

☆☆☆☆

میں تری بلا سے اجڑ گیا، ترا حوصلہ تو نکل گیا
یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ یہ عید بھی ترے گھر ہوئی

☆☆☆☆

وہی تو عمر مرے درد دل کی بھی ہوگی ۞ ترے شباب کا یہ کون سال ہے پیارے

کبھی کبھی کلیم عاجز مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں وہ اتنے شکستہ دل نظر آنے لگتے ہیں جیسے ان کے دل میں امید کی کوئی کرن نہیں، آزاد ہندوستان کی ترقیوں کے افسانے سنتے ہیں دوسری طرف اپنے جیسے لوگوں کی پژمردگی، افسردگی اور دل شکستگی، درد و کرب کی شکار زندگی، معصوم اور بے گناہ کے قتل کے واقعات، غیرت وخودداری کے پاکیزہ جذبات پر ہتھوڑے برسانے والے سانحے، زہر بونے والے لیڈروں کے بیانات پڑھتے اور سنتے ہیں تو ان کا دل چھلنی ہو جاتا ہے، دل میں کوئی امنگ باقی نہیں رہ جاتی ان کی افسردگی اور دل شکستگی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ان اشعار کو پڑھئے اور ان کے شیشۂ دل کے چٹخنے اور چور چور ہو جانے کا اندازہ کیجئے:

مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف تا بہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی
یہی بے کسی تھی تمام شب، اسی بے کسی میں سحر ہوئی
نہ کبھی چمن میں گذر ہوا، نہ کبھی گلوں میں بسر ہوئی
یہ پکار سارے چمن میں تھی، وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا، تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی

کلیم عاجز کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ صلاحیتوں سے محروم، ادب وتہذیب سے نا آشنا، نہ گفتگو کا سلیقہ، نہ آداب حکمرانی سے واقف مگر وقت نے ان کو اقتدار کی اونچی کرسیوں پر بٹھا دیا ہے تو وہ شب وروز موج ومستی میں مصروف نظر آتے ہیں، دولت وحکومت کا نشہ، اقتدار کا غرور، سامان عیش وعشرت کی فراوانی نے ان کی ہر شب کو شب برأت اور ہر روز کو روز عید بنا دیا ہے، اور ہمہ وقت جشن مسرت برپا ہے، دوسری طرف اسی سرزمین میں بسر کرنے والے کچھ لوگ فرقہ واریت کی دہکائی ہوئی آگ میں جھلس رہے ہیں اور موت وزیست کے دوراہے پر بے یار ومددگار کھڑے ہیں ان کے مکانات دھواں اگل رہے ہیں ان کی اقتصادی ومعاشی حالت کو درست کرنے کی کسی کو فکر نہیں، کلیم عاجز کہتے ہیں:

میخانے پر جب دیکھو، تب بادل چھائے رہتے ہیں
جن کے گھروں میں آگ لگی ہے ان کے گھر برسات نہیں

شاید آپ کے علم میں ہو کہ موسم برشگال کی مرطوب ہوائیں جب چلتی ہیں تو شرابیوں کو نشہ کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے، جب ساون کے بادلوں کے فوارے کھل جاتے ہیں تو شراب کا نشہ شباب پر آجاتا ہے، کلیم عاجز کتنے درد سے کہتے ہیں کہ یہ برسات جو ارباب اقتدار کو موج ومستی فراہم کرتی ہے وہی برسات اگر اس آبادی کی طرف مڑ جائے جہاں سماج دشمن عناصر نے آگ لگا رکھی ہے تو ان کے گھروں کی آگ بجھ سکتی ہے، موج ومستی تو بہت دور کی بات ہے ان کے سروں پر گھر کی چھت تو سلامت رہ جائے، کلیم کے یہاں ایسی مثالیں اور بھی ہیں لیکن کچھ زیادہ نہیں، کیوں کہ وہ رجائی شاعر ہیں قنوطیت پسند نہیں۔

یہ کلیم عاجز کی شاعری کا ایک سرسری اور اجمالی جائزہ ہے، کلیم ادیبوں اور شاعروں کی ہم نشینی اور ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر شاعر نہیں بنے بلکہ ان کو حالات اور ستمہائے روزگار نے از خود شاعر بنا دیا، اتفاقاً یہ حالات اس وقت پیدا ہوئے جب گلستان وطن میں موسم خزاں کے آخری جھونکے چل رہے تھے، جو بہار کی آمد آمد کا

اعلان کر رہے تھے، کلیم کی نوجوانی اور اسکولی تعلیم کا دور تھا کہ خزاں کے ان جھکڑوں میں آگ برسنے لگی، ان کا گاؤں، ان کے عزیز واقارب، پورا خاندان چہیتی ماں اور پیاری ننھی منی بہن سب اس آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے، ان کی پوری دنیا اجڑ گئی، وہ دنیا میں تنہا رہ گئے، چھ برس سکتے کے عالم میں گذر گئے پھر کلیم شاعر بن گئے، کربناک اور درد بھرے بول ان کی زبان سے نکلنے لگے جو غزل کی شکل اختیار کر گئے قدرت نے گلے میں سوز اور آواز میں درد بھر دیا تھا اس لئے جب وہ اپنی غزلیں سناتے تو خود روتے اور دوسروں کو بھی رونے پر مجبور کر دیتے، پھر آہستہ آہستہ یہ زخم مندمل ہوا تو آزاد ہندوستان میں پوری ملت اسلامیہ حکومت کے قہر وغضب کا شکار ہو گئی، اب کلیم کا ذاتی غم اجتماعی غم کی شکل اختیار کر گیا، اس لئے آزادی کے پورے دور کی ان کی شاعری تاریخ بن گئی جس میں واقعات کا تسلسل تو نہیں تھا، لیکن کیفیات کا تسلسل ضرور ہے، آج تک وہ تاریخ لکھ رہے ہیں، ان کی شاعری کامیڈی کبھی نہ بن سکی صرف ٹریجڈی ہو کر رہ گئی۔

کلیم کی شاعری کا دوسرا موضوع نعت رسول ہے، یہ آواز بھی ان کے دل کی آواز ہے ان کی بعض بعض نعتوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

زخم کھائے ہوئے سرتا بقدم آئے ہیں ۞ ہانپتے کانپتے یا شاہ اُمم آئے ہیں
سرنگوں آئے ہیں بادیدۂ نم آئے ہیں ۞ آبرو باختہ دل سوختہ ہم آئے ہیں
کھو کے بازار میں سب اپنا بھرم آئے ہیں ۞ شرم کہتے ہوئے آتی ہے کہ ہم آئے ہیں

ان کی نعتوں میں بڑا سوز ہے پڑھئے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے ہیں نعتوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے، اگر کبھی موقعہ ہوا تو اس موضوع پر بھی گفتگو ہوگی۔

آخری بات

کلیم عاجز کی شاعری روایتی شاعری سے قدرے مختلف ہے اس میں دلکشی اور

تاثر ہے، دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے دل و دماغ اس کے مضمرات اور اس کی زیریں سطح کی لہروں میں کھو جاتا ہے، الفاظ عام فہم، انداز بیان سیدھا سادہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست قاری کے جذبات تصورات اور ذہنی افکار پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے کمرے میں لگا ہوا ہیٹر کمرے کی فضا کو گرم کر دیتا ہے، کلیم عاجز کی یہ تاثیر ہی ان کی مقبولیت کی بنیاد ہے، یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کے معیار اور فنی نقطۂ نگاہ سے جو خامیاں اور کوتاہیاں در آئی ہیں ان کی طرف نگاہ نہیں جاتی، یا کم جاتی ہے، کیوں کہ ان کی شاعری وقت کا راگ ہے، بھیرویں کی آواز سنتے ہی آدمی کھو جاتا ہے اس کے بول پر تحقیق وتنقید کی چھری چلانے کا کس کو ہوش رہتا ہے، ہمارے وطن کا ماحول فریاد و فغاں کی اس منزل پر آچکا ہے جہاں اس کے علاوہ کسی دوسرے نغمے پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

کلیم عاجز کی شاعری میں متروکات کا استعمال اتنی کثرت سے ہے کہ ان کی نشاندہی کی ضرورت نہیں انہوں نے دانستہ طور پر بالقصد میرؔ کا انداز اپنانے کی کوشش کی ہے انہیں کا شعر ہے۔

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے ۞ کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

میرؔ کے یہاں اس دور کے بہت سے الفاظ بالخصوص افعال کا تلفظ پایا جانا فطری ہے اب وہ سب کے سب متروک ہیں اور ان کا استعمال ناپسندیدہ قرار دیا جا چکا ہے لیکن میرؔ کی غزلوں کی نشتریت نے ان لفظوں اور لب ولہجہ میں جادو کا اثر پیدا کر دیا ہے اور جب اسی تلفظ میں میرؔ کے اشعار پڑھے جاتے ہیں تو دلوں پر چرکہ لگاتے ہیں تاثیر کی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اگر ان کی جگہ فصیح الفاظ رکھ دیئے جائیں تو ان کی نشتریت فنا ہو جاتی ہے اور وہ اشعار ایک دم پھیکے اور بدمزہ ہو جاتے ہیں۔

دور جدید کے کئی شعرا نے میرؔ کے انداز اور لب ولہجہ میں دو چار غزلیں لکھی ہیں لیکن ان لفظوں کا مخصوص تلفظ صرف انہیں غزلوں تک محدود رکھا ہے کہیں دوسری جگہ ان کا استعمال نہیں کیا ہے کیوں کہ بہر حال وہ غیر فصیح اور متروک ہو چکے ہیں، کلیم عاجز کے یہاں ان الفاظ کا استعمال کچھ زیادہ ہے میر کے مخصوص انداز اور لب ولہجہ والی

غزلوں میں تو یہ ناگوار نہیں گذرتا کیوں کہ یہ میرؔ کی تقلید میں دانستہ طور پر لکھی گئی ہیں، لیکن ان الفاظ کا فصیح زبان میں لکھی جانے والی غزلوں میں طبیعت پر گراں گذرتا ہے اتفاق سے کلیم عاجز کی وہی غزلیں زیادہ مقبول ہوئیں جو میرؔ کے لب ولہجہ میں ہیں مثلاً:

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ ۞ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں ۞ چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو

اندھیری شب میں نہیں صبح کے اجالے میں ۞ لٹا ہے تیرے غلاموں کا قافلہ کہیو

ان غزلوں میں قافیہ اور ردیف دونوں میرؔ کے مخصوص الفاظ ہیں لیکن انھیں الفاظ کا استعمال فصیح اردو میں لکھی جانے والی غزلوں میں قابل قبول نہیں ہوسکتا ہے جیسے کے میرؔ کے دور میں ''کسی'' کی جگہ ''کسو'' کا استعمال تھا اگر آج کے دور میں کوئی استعمال کرے گا تو یقیناً نا قابل قبول اور ناپسندیدہ ہوگا، مثلاً:

کیا دوسروں کے چاک وقبا و رفو کی بات ۞ اپنے سوا نہ کیجئیو عاجز کسو کی بات

چونکہ یہ غزل میرؔ کے تتبع میں نہیں ہے یہ لفظ گراں گذرتا ہے، ایسی بہت سی مثالوں میں سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں جو دور جدید کے معیاری شعر وادب کی زبان میں ہیں مگر انھیں غزلوں میں متروک الفاظ بے تکلف استعمال کئے گئے ہیں جو کبھی میرؔ کے زمانے میں مروج تھے لیکن آج وہ قطعاً متروک اور غیر فصیح مانے جاچکے ہیں اگر کوئی شخص شعر وادب کی مجلسوں میں یا عام گفتگو میں استعمال کرے تو تضحیک کا نشانہ بن جائے صرف چند اشعار پیش ہیں جب کہ ان کی تعداد زیادہ ہے۔

ادا ہمیں نے سکھائی نظر ہمیں نے دی ۞ ہمیں سے آنکھ ''چراؤ ہو'' بار دیکھو تو

دل ہی میں ہے ہرے بھرے پھولوں کا اک چمن ۞ ''جاؤ ہو'' ڈھونڈنے کو کہاں رنگ وبو کی بات

اک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے ۞ اس سے آگے کیا ''پوچھو ہو'' آگے کہا نہ جائے

ہر ایک ظرف برابر نہیں ہے اے بلبل ۞ جو آگ سینے میں ''رکھوں ہوں میں'' نہ تو رکھیو

کلیم عاجز کے مجموعہ کلام کا نام ''وہ شاعری کا سبب ہوا'' ہے اس کے سفر نامہ کا

شعر ہے۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا وہ معاملہ بھی عجب ہوا
میں غزل ''سناؤں ہوں'' اس لئے کہ زمانہ اس کو بھلا نہ دے

ترقی پذیر زبانوں میں جدید الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں اور قدیم الفاظ اپنی جگہ چھوڑ جاتے ہیں خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں اہل زبان ان الفاظ کا استعمال ترک کر دیتے ہیں اور غیر فصیح مانے جاتے ہیں، جیسے قدیم لباس بدل جاتے ہیں اگر کوئی آج سے پانچ سو برس پہلے استعمال ہونے والا لباس پہن کر نکلے تو پہننے والا تماشا بن جائے گا، کوئی شخص اس کو دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے گا بالکل یہی حال الفاظ کا ہے اگر میؔر کے دور کے الفاظ آج کوئی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرے تو ہر شخص اس کا مذاق اڑائے گا، اس لئے بہتر یہی ہے کہ جن الفاظ کو اہل زبان و ادب متفقہ طور پر خارج کر چکے ہیں ان کا استعمال ترک کر دیا جائے۔

تہذیب جدید کے کلیسا میں اکبؔر کی اذان

(''اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ'' کے عنوان سے ہونے والے ایک سیمنار کے لئے لکھا گیا)

خدا کے فضل سے اسلامی ہند پر کبھی بھی ایسا وقت نہیں آیا کہ کسی بھی ذہنی وفکری انقلاب کے وقت اسلام پس منظر میں چلا گیا ہو اور حق وصداقت کا سورج تہ بہ تہ کالی گھٹاؤں میں اس طرح روپوش ہو گیا ہو کہ اس کو دیکھنے کو آنکھیں ترس جائیں، اور نگاہوں میں یاس وناامیدی کے گہرے سائے لہرانے لگیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ کئی بار باطل اور اسلام دشمن کالی گھٹائیں طوفان بن کر آئیں لیکن شدت مقاومت کی تند و تیز ہواؤں نے ان کا رخ پھیر دیا۔

اِسلامی ہند کی تاریخ میں ہمیں دو حادثے ایسے ضرور نظر آتے ہیں کہ جب نیر اسلام پر کالے بادل جھوم کر آئے اور اس پر چھا گئے، اس کی کرنیں براہ راست زمین پر پڑتی ہوئی نظر نہیں آتی تھیں لیکن اس وقت بھی ایک ملگجا اُجالا ہر سمت پھیلا ہوا تھا مگر ہر منظر دھندلا گیا جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، ایک موقعہ تو وہ ہے جب مغل اعظم اکبؔر نے ''دین الٰہی'' کو حکومت کی سطح پر فروغ دینے کی کوشش کی مگر مجدد الف ثانی اور ان کے حلقہ بگوشوں نے تاریکیوں کا سینہ چیر کر دکھا دیا کہ سورج ہمارے سروں پر موجود ہے اور پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے کچھ بادل جہانگیر کے دور میں صاف ہوئے اور شاہجہاں کے زمانہ میں تو ساری گھٹائیں منتشر ہو گئیں اور اورنگ زیب کے عہد میں تو ایک لکۂ ابر بھی آسمان پر نہیں رہ گیا۔

دوسرا واقعہ جو اسلامی ہند کی تاریخ بتاتی ہے وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے عروج واقتدار کے خاتمہ کے فوراً بعد کا ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی دیمک کی طرح مسلمانوں کی عظمت واقتدار کے پرچم کو کھاتی رہی اور ۱۸۵۷ھ میں جب مسلمانوں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ پرچم ہی زمیں بوس ہو گیا اور اب

اسباب وعلل کی دنیا میں اس کے دوبارہ سر بلند ہونے کے سارے امکانات ختم ہو چکے تھے پھر عیسائیت کی تبلیغ نے مایوسیوں کے اندھیروں کو اور گہرا کر دیا سارے دینی سرچشمے خشک ہوتے نظر آنے لگے اسلامی مدارس اپنا وجود کھو چکے ساری خانقاہیں ویران اور خرابے میں تبدیل ہوگئیں اسلامی راہوں کے مشعل بردار ایک ایک کر کے گرفتار کئے جارہے تھے اور پھانسی کے تختے پر چڑھائے جارہے تھے یا کالے پانی بھیجے جارہے تھے۔

ان تمام نامساعد حالات کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام کا وجود مٹ گیا یا اس کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں یا اسلام پر نزع کا عالم طاری ہوگیا تھا، خدا کے فضل وکرم سے ہندوستان پر ایسا وقت کبھی نہیں آیا جیسا کہ اکتوبر ۱۹۱۷ھ کے بعد سرزمین روس میں اشتراکی حکومت کی وجہ سے سمرقند و بخارا اور ازبکستان وتاشقند وغیرہ پر آیا۔

اس لئے اسلامی ہند میں ہمیں کوئی ایسا دور نظر نہیں آتا کہ اس دور کی جدوجہد کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لفظ سے تعبیر کریں، ہاں یہ ضرور ہے کہ باطل قوتوں نے اسلام کی راہ میں پہاڑ کھڑے کئے، سمندر حائل کرنے کی کوشش کی آگ اور خون کے دریا بہائے لیکن تاریخ کے ان خطرناک موڑوں پر اسلام کے جیالوں نے کبھی ہار نہیں مانی، پہاڑوں کو عبور کر گئے، سمندروں میں گھوڑے دوڑا دیئے، آگ اور خون کے دریا کو پایاب بنالیا اور مخالف طاقتوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ع

یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن بر آید

خدا نے ان کو سرخ رو رکھا، کامیابی اور ظفر مندی نے آگے بڑھ کر ان کے قدم چوم لئے فتح ونصرت نے ان کے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔

اسلامی تہذیب پر جدید تہذیب کی یلغار بھی اسلامی ہند کے لئے ایک ایسا ہی تاریخی حادثہ تھا، علماء اسلام اور زعماء ملت اس حملہ کو روکنے کے لئے کفن بردوش میدان عمل میں آئے اور صف بندی کی اور اس محاذ پر اس وقت تک ڈٹے رہے جب تک اس طوفان کا رخ انھوں نے نہیں موڑ دیا، انھیں صفوں میں ایک محاذ پر ہم کو اکبر الٰہ

آبادی بھی نظر آتے ہیں اور پورے محاذ کو تن تنہا سنبھالے ہوئے ہیں، طنز وتعریض کے تیر ان کی کمان سے اُڑ کر حریف کی صفوں میں پہنچتے ہیں تو ان کی صفیں تو نہیں ٹوٹتی ہیں لیکن ان میں ابتری اور ایک ہلچل ضرور مچ جاتی ہے، اکبر کا سب سے کارگر ہتھیار ان کی شاعری تھی انھوں نے اپنی شاعری سے وہ کام لیا جو کبھی میدان جنگ میں تیر وکمان سے لیا جاتا تھا۔

یہ وہ دور ہے جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اس سرزمین سے اسلام کو مٹا دینے کا پلان بنایا تھا، باقاعدہ لندن پارلیمنٹ میں تجویز پاس کر کے ہندوستان میں پورے ساز وسامان کے ساتھ تبلیغ عیسائیت کی ایک طاقتور تحریک چلائی تھی اور مدبرین برطانیہ کا یہاں کے بارے میں فیصلہ تھا کہ تعلیمی ادارے کھول کر تعلیم کی راہ سے ایک ایسی قوم تیار کی جائے جو شکل وصورت کے لحاظ سے ہندوستانی ہو مگر ذہن ومزاج جذبات وخیالات کے اعتبار سے انگریز، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء سے ان کا مقصد محض فروغ تعلیم نہیں بلکہ اس ملک میں ایک ایسا ذہنی وفکری انقلاب برپا کرنا تھا کہ مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کی وجہ سے یہاں کی سرزمین پر اسلامی تہذیب کی جو گہری چھاپ نظر آتی ہے اس کو صفحۂ وجود سے کھرچ کر پھینک دیا جائے، ایک طرف پادریوں کی فوج مذہب کے نام پر عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھی، اور تمام سرکاری ملازموں کو پادریوں کے لکچر سننے پر مجبور کیا جارہا تھا، تو دوسری طرف تعلیمی ادارے قائم کر کے انگریزی تعلیم کے نام پر یورپین تہذیب سے مرعوب کیا جارہا تھا، اور خاص طور سے مسلمانوں کے لئے علی گڈھ میں سرسیّد نے جو مدرسۃ العلوم قائم کیا تھا اس میں یورپین اساتذہ کو رکھ کر جدید تہذیب کی اشاعت اور فروغ میں ہر امکانی کوشش کی جارہی تھی، سرسیّد اپنے متعدد لکچروں میں برملا جدید تہذیب کی برتری اور اس کے فضائل ومناقب کو طلبہ کے سامنے بیان کرتے رہے اور اس سلسلہ میں بسا اوقات اسلامی تہذیب کا استہزا اور اس کا ذکر حقارت کے ساتھ کرتے رہے، ہر قوم اپنی مخصوص تہذیب سے پہچانی جاتی ہے اگر اس کی تہذیب مٹ جائے تو وہ قوم ازخود

صفحۂ ہستی سے ایک دن مٹ جائے گی، سرسیّد کی تعلیمی مہم کے وقت اسلامی ہند اسی خطرناک موڑ پر تھا اکبرؔ اسلامی تہذیب پر جدید تہذیب کی اس یلغار کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اور اس فتنے کی شدت کو محسوس کرتے تھے ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا اس تحریک کا آخر میں جو انجام ہوگا وہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ جدید تعلیم کے منکر نہیں تھے لیکن نئی نسل کو جس نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی سرسیّد کوشش کر رہے تھے اس کو غلط اور ارتداد کا پیش خیمہ سمجھتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ سرسیّد اگر اپنے مشن میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ہندوستان کی سرزمین سے اسلامی تہذیب وثقافت ہی نہیں مٹ جائے گی بلکہ خود اسلام کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا، مسلمان نام کی ایک قوم ضرور رہ جائے گی لیکن اس کے جسم سے اسلام کی روح نکل جائے گی، سرسیّد کی تحریک بظاہر تعلیمی تحریک ہے لیکن وہ اسلام دشمن رجحانات کے سائے میں چلائی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی سرزمین ایک دن اسلام کا قبرستان بن جائے گی۔

اکبرؔ جدید وقدیم دونوں سے خوب واقف تھے وہ پرانی قدروں کی عظمت کے دیوانے تھے اور جدید تہذیب کو اس کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، انھوں نے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور جدید تہذیب کی یلغار کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا، وہ صوفی منش اور سیدھے سادے تصوف کے دلدادہ بزرگ تھے اس لئے ان کے الفاظ انگاروں کے بجائے طنز ومزاح کے لباس حریر میں دنیا کے سامنے آئے، اکبرؔ کی شاعری صرف تفریح طبع اور احباب کی مجلس گرمانے کے لئے نہیں تھی، ان کا ایک ایک لفظ تہذیب جدید کی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج ہے، اظہار بیزاری ہے، اسلامی قدروں کی پامالی کا ماتم ہے، ان کی آواز صدا بہ صحرا بھی نہیں تھی، ان کی آواز غریبوں کے جھونپڑوں سے لے کر رؤساء امراء کی قلعہ نما حویلیوں اور محلوں تک پہنچتی تھی، اس دور میں اکبرؔ کہہ سکتے تھے۔ ؎

اِذَا قُلْتُہٗ لم یمتنع عن وصولہٖ ۞ جِدَارٌ مُعَلًّی او خِبَاءٌ مُطَنَّبٌ

اخبارات ورسائل اکبرؔ سے تقاضے کر کر کے نظمیں لکھواتے اور بڑے اہتمام سے ان کو شائع کرتے تھے پھر وہ اخبار ورسائل ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے عوام وخواص کی مجلسوں میں ان پر تبصرے کئے جاتے بحث ومباحثہ ہوتا اس طرح ان کی نظمیں ایک بڑے حلقہ کو متاثر کرتی تھیں خصوصیت کے ساتھ البشیر ، ید بیضا، رسالہ زمانہ کانپور، رسالہ مخزن لاہور، اودھ پنچ لکھنؤ، رسالہ پیامِ یار لکھنؤ وغیرہ میں اکثر شائع ہوتیں۔ اکبرؔ اس وقت تک ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہوچکے تھے یہی وجہ ہے کہ ایک نظم جو نواب حیدرآباد کی فیاضی سے متعلق تھی اور سرسیّد کے مفید مطلب تھی تو انھوں نے اپنے رسالہ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں بھی شائع کی، اسی سے اکبرؔ کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اکبرؔ (ولادت ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء) سرسیّد (ولادت ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء) سے ۲۹ سال عمر میں چھوٹے تھے لیکن جب سرسیّد نے علی گڈھ میں ۱۸۷۵ء میں کالج کھولا اس وقت اکبرؔ ۳۰ سال کے ہوچکے تھے اس لئے علی گڈھ میں ہونے والی سرگرمیوں سے وہ عقل وشعور کی ساتھ واقف تھے اور جب علی گڈھ کی تحریک شباب پر آئی تو وہ ججی کے عہدے پر فائز ہوچکے تھے اور سرسیّد کی وفات ۱۸۹۸ء کے بعد ۲۴ سال تک زندہ رہے اس لئے وہ سرسیّد کی عملی سرگرمیوں کے ابتدا سے انتہاء تک کے عینی شاہد تھے اور سرسیّد کے بعد اس تحریک سے وابستہ افراد نے جب سرسیّد کے مشن کو آگے بڑھایا اور اس پورے دور میں مسلمانوں کی جو نئی نسل تہذیب جدید سے آراستہ پیراستہ ہوکر نکلی اس کے جذبات خیالات، امنگوں اور ترنگوں کو بھی خوب دیکھا بھالا اور پرکھا اس لئے ان کی پوری شاعری تجربات ومشاہدات کی ترجمانی ہے جو دیکھا جو سنا جو محسوس کیا اور جیسا محسوس کیا اپنے مخصوص رنگ میں پیش کردیا، یہ تو ایک حقیقت ہے کہ اکبرؔ اپنی تمام زندگی میں سرسیّد کی حمایت نہ کرسکے اور ان کی سرگرمیوں سے ہمیشہ بیزار رہے ان کا تأثر تو یہ تھا۔

زلف نے پرتوِ دیں نام کو رہنے نہ دیا ❁ آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

یعنی تہذیب جدید نے اسلامی تہذیب کو شکست دیدی اور ایک مخصوص طبقہ کو اسلامی اقدار وثقافت سے بیزار کر کے تہذیب جدید کے سانچے میں ڈھال دیا، مسلمانوں کا متوسط طبقہ جو اس نئی روشنی میں نہا چکا تھا اس کی اندر اور باہر کی زندگی پر نئی تہذیب کی اتنی گہری چھاپ پڑ چکی تھی کہ اس کو کسی رخ سے اسلام کی نمائندہ شخصیت سمجھنا مشکل ہو چکا تھا۔

سر سیّد کا مطمح نظر صرف انگریزی حکومت کی نوکری تھی، ان کی ساری جد و جہد کی یہی معراج تھی اس کو مختلف انداز سے بیان کرتے تھے وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ مسلمانوں کی عزت رفتہ اسی طرح واپس ہوسکتی ہے وہ ملک میں باوقار اور شان وشوکت کی زندگی گذار سکتے ہیں لیکن اکبرؔ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح مسلمان صرف انگریزی اقتدار کو استحکام تو دے سکتا ہے لیکن خود عزت وقار کا مالک بن جائے ناممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ سڑک پر بیٹھ کر جو موچی گھوڑوں کی سُم میں نعل ٹھونکتا ہے وہ شہسوار کیسے ہوسکتا ہے اس کی نعل بندی سے صاحب کے گھوڑے کی رفتار تو ضرور شاندار ہوسکتی ہے لیکن یہ تو موچی کا موچی ہی رہے گا اکبرؔ کہتے ہیں ؎

مسلمانوں کی خوشحالی کی بے شک دُھن ہے سیّدؔ کو ❁ مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے
درستی تخت وعزت کی کہاں اب کیل کانٹوں سے ❁ توقع شہسواری کی نہ رکھو نعل بندوں سے

نقطۂ اختلاف

اکبرؔ کی شاعری صرف شاعری نہیں تھی بلکہ نعرۂ جہاد تھی، ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم اور جدید تہذیب کے بہانے مسلمانوں کی رگوں میں الحاد کا انجکشن دیا جا رہا ہے وہ کہتے تھے کہ سر سیّد جدید تہذیب کے دیوانے ہیں اور مسلمانوں کو اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں جب کہ مسلمان تو انگریز ہونے سے رہے البتہ وہ مسلمان نہیں رہ جائیں گے سر سیّد سے اکبرؔ کا نقطۂ اختلاف صرف یہی ہے کہ وہ سر سیّد کی جد و جہد کو ملت اسلامیہ کی بدنصیبی تصور کرتے تھے وہ برملا اس کی مخالفت کرتے تھے، لیکن ان کے

اختلاف کرنے میں کہیں تلخی نہیں تھی، ان کے الفاظ اور ان کے لب ولہجہ پھول کی طرح نرم ونازک ہے وہ پتھر چلانا جانتے ہی نہیں، وہ اپنے درد کا اظہار بھی ہنستے ہوئے کرتے ہیں اور اپنی داستانِ غم مسکراتے ہوئے سناتے ہیں، ان کے الفاظ اور ان کے اپنے کچھ مخصوص الفاظ اور استعارے مثلاً: ''مس'' یا ''میم'' سے گوشت پوست کی کوئی عورت نہیں بلکہ اس سے ہر جگہ ان کی مراد تہذیب جدید ہے، سر سیّد کے لئے پیر، مرشد، یا پیر طریقت کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسلامی ثقافت کی ترجمانی وہ لفظ ''شیخ'' یا ''واعظ'' سے کرتے ہیں، ان الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ان کے سامنے مفہوم کی ایک وسیع دنیا ہوتی ہے، وہ اپنی ایک نظم میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان اپنے ایمان پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے یہ چاہے کہ وہ مسلمان بھی رہے اور جدید تہذیب کی برکتوں سے بھی فیضیاب ہو تو ایسا ناممکن ہے ''برق کلیسا'' کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے وہ اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہ یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ تہذیب جدید اسلام کی نفی کرتی ہے جب مسلمان اپنی شاندار روایات جاہ وجلال سے بھری ہوئی تاریخ اور اپنے آبا واجداد کے قابل فخر کارناموں کو طاق نسیان بنا دے اپنے ذہن سے اسلام کی عظمت و برتری کے سارے نقوش کھرچ کر پھینک دے تبھی وہ تہذیب جدید کی حرم سرا میں باریاب ہونے کی اجازت پا سکتا ہے البتہ نظم کا پیرایۂ بیان واقعاتی اور بہت شوخ ہے، نظم شروع ہوتی ہے۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار ❁ ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید ❁ قدِ رعنا میں وہ چم خم کی قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں ❁ گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

پھر کئی اشعار میں سراپا بیان کیا ہے، رفتار و گفتار، حسن و جمال، انداز گفتگو، آواز کا لوچ اور دلکشی بیان کرتے ہوئے رفتار کی فتنہ سامانیوں اور ناز و انداز کی سرکشی کو ایک نئی تمثیل سے بیان کیا ہے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں ❁ سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

پھر اکبرؔ اس سراپا قیامت کے بارگاہ حسن و جمال میں نذارنۂ محبت پیش کرتے ہیں ؂

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار ۞ دولت و عزت و ایماں تیرے قدموں پر نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے ۞ ساری دنیا سے میرے قلب کو سیری ہو جائے

اکبرؔ حسن کی بارگاہ میں جوش و ولولہ سے بھرے ہوئے انداز میں دولت عزت ہی نہیں ایمان تک کا نذرانہ پیش کرتے ہیں لیکن حسن قبول کے بجائے اکبرؔ کو سننا پڑا، اکبرؔ کہتے ہیں ؂

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی ۞ ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے ۞ بوئے خوں آتی اس قوم کے افسانوں سے

پھر اس نے طعنہ دینا شروع کیا یہ بڑے نمازی بنتے ہیں اور معصوم صورت نظر آتے ہیں یہی مسلمان سرحد پر بے تحاشا بے قصور انسانوں کا خون بہاتے ہیں اتنے تند خو اور وحشی ہیں کہ آگ میں کود جاتے ہیں اور توپ سے لڑ جاتے ہیں، مسلمانوں کی پوری تاریخ ہی خونیں افسانوں سے بھری ہوئی ہے وہ ناحق خون بہانے کو جہاد کہتے ہیں چودہ سو سالوں کی تاریخ خون سے لت پت ہے مجھے ایسی خونخوار قوم سے کیا لینا دینا اس کے اس کڑوے کسیلے جواب کے بعد شاعر نے اپنی پوری اسلامی تاریخ کی نفی کر دی اکبرؔ کہتے ہیں ؂

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحتِ روح ۞ اب زمانہ پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ ۞ دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

شاعر کہتا ہے کہ اب نہ ہمارے نعرۂ تکبیر میں وہ زور ہے نہ جہاد کا کوئی تصور، ہم اپنے اسلاف کی ان تمام خصوصیات کو لوح دل سے کھرچ کر پھینک چکے ہیں اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ تہذیب جدید کے پیر مغاں سر سیّد کا مرید ہوں، اکبرؔ کہتے ہیں ؂

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد ۞ میں تو تہذیب میں ہوں پیر مغاں کا شاگرد

شاعر نے جب اس بت طناز سے پیر مغاں کا نام لیا اور دین و ایمان کی نفی کر دی

تو یک بیک رو یہ بدل گیا اکبر آگے کی داستان سناتے ہیں ؎

مجھ پر کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں ۞ نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم ۞ تو نکالو دل نازک سے یہ شبہہ بہ وہم
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اکبر نے تمثیلی نظم سے یہ بتایا ہے کہ تہذیب جدید کے پرستار یورپ کی بارگاہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حاضری دیتے ہیں اکبر نے اپنی نظموں میں اس حقیقت کا بار بار اظہار کیا ہے کہ سرسیّد کی نگاہیں یورپ کی تجلی گاہوں سے خیرہ ہو چکی ہیں وہ اس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تہذیب جدید جس طرح کے معاشرہ کی تشکیل کرتی ہے اس میں کوئی شخص اپنے دین و مذہب پر قائم ہی نہیں رہ سکتا، یہ نظم ۱۸۷۷ء میں لکھی گئی ہے جب علی گڈھ تحریک شباب پر تھی اور پورے ملک کے اونچے طبقہ میں اس کی پذیرائی ہو رہی تھی اکبر بات یہاں سے شروع کرتے ہیں ؎

سیّد سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا ۞ چرچا ہے جا بہ جا ترے حال تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر وتدبیر کو خدا ۞ دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الٰہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم وصلوٰۃ وزکوٰۃ وحج ۞ کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر ۞ بندہ بنا دیا ہے تجھے حُبّ جاہ کا

واعظ کی تلخ اور تند و تیز بات سن کر سیّد نے اپنے دل کا حال صاف صاف بیان کر دیا۔

اس نے جواب دیا کہ مذہب ہو یا رواج ۞ راحت میں جو مُخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

مذہب اگر دنیاوی عیش وآرام سے محروم کر دیتا ہے تو ایسے مذہب کی میرے نزدیک کوئی قدر وقیمت نہیں ہے سیّد نے کہا آپ کبھی مسجد وخانقاہ سے باہر نکلے نہیں آپ کو کیا خبر کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں نے دنیا دیکھی ہے آپ سے کہیں

زیادہ باخبر ہوں میں نے یورپ کے حسن و جمال شان وشوکت کے جو نظارے دیکھے ہیں اگر آپ بھی دیکھ لیں تو مجھ سے بڑھ کر آپ اس کے دیوانے ہو جائیں گے اگر ان ہوشربا مناظر کو دیکھ کر اپنے دین و مذہب پر قائم رہ جائیں تو البتہ آپ کو مجھ پر اعتراض کا حق ہوگا، کاش آپ کو بھی یورپ کا سفر درپیش ہو اور میری طرح ان نظاروں کو دیکھیں جن کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہوں، اکبر کی نظم آگے چلتی ہے ؎

یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر ۞ گذرے نظر سے حال رعایا وشاہ کا
وہ آب وتاب شوکت ایوانِ خسروی ۞ وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علوم جدیدہ کی روشنی ۞ جس سے خجل ہو نور رُخ مہر و ماہ کا

شان وشوکت کے ان نظاروں کے بعد اگر کسی یورپین فیملی میں جانے کا اتفاق ہو خود سپردگی اور پذیرائی کی قیامت خیز گھڑی سامنے آجائے دین وایمان سلامت بچالے جائیں تو آپ کے قدم چوم لوں، سیّد کہتے ہیں ؎

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ۞ کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نو خیز ودلفریب وگل اندام ونازنیں ۞ عارض پر جن کے بار ہو دامن نگاہ کا

اگر آپ کی تقدس مآبی روکے اور اس ''دعوت نشاط'' کی پذیرائی میں جھجک پیدا ہو تو ؎

رُک گئے اگر تو ہنس کے کہے اک بُتِ حسیں ۞ ''دل مولوی! یہ بات نہیں ہے گناہ کا''

سیّد کہتے ہیں کہ آپ اگر اپنا جبہ ودستار ملوث ہونے سے بچالے جائیں تو ؎

اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام ۞ پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا

اکبر بتاتے ہیں کہ آخر میں سیّد نے طنز بھرے لہجے میں واعظ سے کہا:

منبر پہ یوں تو بیٹھ گئے گوشہ میں اے جناب ۞ سب جانتے ہیں وعظ ثواب وگناہ کا

اکبر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ تہذیب جدید کے انھیں دلکش نظاروں نے سر سیّد کو وارفتہ مزاج بنادیا ہے۔

متوسط طبقہ کی ذہنی کشمکش

علی گڈھ تحریک جب شباب پر تھی اور اونچے طبقہ کے ممتاز اور نمایاں افراد اس کی پشت پر تھے دوسری طرف دین و مذہب کا درد رکھنے والے اس تحریک سے بے اطمینانی کا اظہار کر رہے ہیں اس زمانہ میں میڈل کلاس ایک ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا ایک طرف وہ دیکھ رہا تھا کہ علومِ جدیدہ کے فضائل و مناقب میں سر برآوردہ افراد رطب اللسان، سرکاری ملازمتیں اور روٹی روزی کا سوال بھی انھیں کالجوں سے وابستہ ہوکر رہ گیا ہے اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں اور کالج کا بائیکاٹ کرتے ہیں تو مستقبل تاریک نظر آتا ہے اور معاش کا مسئلہ بھیانک شکل اختیار کر لیتا ہے دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے مذہب رخصت ہو رہا ہے اور الحاد کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اسلامی تہذیب اور دین و مذہب کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کیا جا رہا ہے ان کو پرانی قدریں بھی عزیز تھیں ان کو بھی ترک کرنا منظور نہیں تھا، اور جدید تعلیم کے بغیر روزی روٹی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اس صورتِ حال کی وجہ سے وہ سخت ذہنی کشمکش میں گرفتار تھا، ایک طرف دنیا ہے اور ایک طرف دین، دونوں اپنی اپنی جگہ اہم، اکبرؔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبرؔ ❁ تو صاف کہتے ہیں سیّد، یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں ❁ تو اپنی قوم مچاتی ہے شور، واویلا!
جو اعتدال کی کہئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر ❁ زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

مسلمانوں کو انگریزوں کی ہر چیز سے نفرت ہے اور اس سلسلہ میں وہ نہایت متشدد ہیں، حتی کہ جائز چیزیں بھی اگر انگریزوں کی طرف منسوب ہیں تو ان سے احتراز کرتے ہیں، اس تشدد کی انتہا یہ ہے کہ سر سیّد اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کے استاد عربک کالج دہلی کے صدر الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ کو ایک بار ایک انگریز سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہونا پڑا تو جب تک اس ہاتھ کو صابن سے خوب دھو نہ لیا

اس سے دوسرا کام نہیں کیا، دوسری طرف نئی روشنی کے دلدادہ انگریزوں کی ہر قابل نفرت چیز کے استعمال کو بھی بذریعہ افتخار سمجھتے ہیں، حتی کہ اس سلسلہ میں انھوں نے حرام وحلال کی تمیز بھی اٹھادی ہے دونوں فریق اپنی اپنی انتہاؤں پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، اکبرؔ اسی صورت حال کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

اِدھر ہے ضد کے لیمنڈ بھی پی نہیں سکتے ۞ اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی! صراحیِ مے لا

اکبرؔ کی شکایت ہے کہ اہل اسلام اس صورت حال کو بدلنے کی کوئی مؤثر جدوجہد نہیں کرتے اور گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے ہیں دوسری طرف یورپ سے نئے نئے خیالات کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے اور آسمان لندن سے وحی پروحی اترتی چلی آرہی ہے، اکبرؔ بتاتے ہیں ؎

اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک ۞ اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

اور بیچارا مسلمان

غرض دوگونہ عذاب است جاں مجنوں را ۞ بلائے صحبتِ لیلیٰ، وفرقت لیلیٰ

تہذیب جدید وقدیم کا تصادم

اکبرؔ تہذیب جدید کو الحاد کا پیش خیمہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ نئی روشنی کے دلدادہ بتدریج اسلام کو خیر باد کہہ دیں گے کیونکہ نئی تہذیب کی دعوت دلکش اور خوبصورت لفظوں میں جاری ہے اور حالات بتارہے ہیں کہ مذہب پر جدید تہذیب کو بالادستی حاصل ہوجائے گی، اکبرؔ کہتے ہیں ؎

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو ۞ مس زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

حسینانِ فرنگ بال کٹواتی ہیں اور صرف کندھوں تک رکھتی ہیں، اور اس کو لہریہ دار بنواتی ہیں، کبھی کبھی سنہرے بالوں کی کوئی شوخ لٹ رخساروں پر آجاتی ہے چونکہ بالوں کے سرے پر تھوڑا سا خم ہوتا ہے اس لئے اس کی شکل اُردو حرف لام کی ہوجاتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاندی کی تختی پر سونے کے پانی سے حرف لام لکھ دیا گیا ہے

جو عارض تاباں کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے، اکبؔر کہتے ہیں کہ تہذیب جدید کی چمک دمک اور آب و تاب اچھے خاصے ایمان والوں کو دین سے منحرف کر دیتی ہے، اسی طرح کے ایک دوسرے شعر میں اسلامی تہذیب پر تہذیب جدید کی بالا دستی کا اعتراف کرتے ہیں ؎

زلف نے پرتو دیں نام کو رہنے نہ دیا ۞ آخر اس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

اکبؔر بہت ہی دل شکستہ ہو کر غم زدہ آواز میں کہتے ہیں ؎

پہن لے سایہ، مری جاں! اُتار کر پیشواز ۞ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

دام ہمرنگ زمیں

اونچے طبقے کے کچھ لوگوں نے نیک نیتی سے دنیاوی ترقی کے لئے اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے لندن بھیجا لیکن وہ تعلیم کی ڈگری کے ساتھ ایک ''میم'' بھی اپنے ساتھ لائے، یہاں کے اسلامی ماحول اور معاشرہ میں اس کو پسند نہیں کیا گیا، طعنوں تشنوں کا سامنا ہوا تو نوجوان نے اپنی مجبوریوں کو بیان کیا کہ آپ نے مجھے دریا میں اتار دیا اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ پاؤں تر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اکبؔر یہ داستان سناتے ہیں ؎

اک بُتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد ۞ اس بنا پر سُن رہا ہوں طعنہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم ۞ کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ ۞ ہو کے اب مجبور، خود اس راز کو کرتا ہو فاش

پھر اکبؔر نے نوجوان کی ذہنی کشمکش کو تفصیل سے پیش کیا ہے، نوجوان کہتا ہے کہ میری نئی نئی عمر، رگوں میں جوش شباب موج زن تھا، حسینانِ فرنگ کا ہر سمت جمگھٹا تھا، ایک سے ایک پری تمثال حور شمال زہرہ دشان فرنگ پرا جمائے ہوئے، ہر آنکھ میں دعوتِ شباب، ہر کام پر خود سپردگی کا انداز، دلکش اداؤں اور ساحرانہ نگاہوں کا مجھ پر جادو چل گیا اور میں رفتہ رفتہ ان کے دام گیسو میں گرفتار ہوتا چلا گیا حالانکہ مجھے اپنی قوم اپنی ملت کا پاس تھا، سخت ذہنی کشمکش کے باوجود میں خود کو روکتا رہا لیکن نشہ جوانی اور

جنون شباب عاقبت بینی پر غالب ہوگیا، ایسے ہوشربا ماحول میں

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا ۞ دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا ''دور باش''

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا ۞ دل ہی تھا آخر، نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

نوجوان کی زبانی صورت حال کی عکاسی کے بعد اکبؔر نے اس کی نزاکت کو محسوس کیا اور دل میں کہا کہ سرسیّد مسلمانوں کی نوجوان نسل کو تعلیم کے لئے لندن بھیج کر بتاہ کررہے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

بار بار اکبؔر یہ آتا ہے مرے دل میں خیال ۞ حضرت سیّد سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردۂ

بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

وہ صرف قوت فرمانروا کو مانتے ہیں

سرسیّد نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اس میں وہ اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے تھے وہ انگریزی حکومت کو رحمت خداوندی ثابت کرتے مسلمانوں پر اس کی اطاعت کو فرض کہتے، حدیث وقرآن کی من مانی تفسیریں بیان کرتے اور شرح کرتے اسلام کے درجنوں عقائد سے واشگاف لفظوں میں انکار کرتے تھے، انھیں اسباب کی وجہ سے دین پسند حلقوں میں سخت اضطراب تھا، اکبؔر بھی اس صورت حال سے واقف تھے رسائل واخبارات میں پڑھتے رہتے تھے، انھوں نے ایک نظم میں ان حقیقتوں کا اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

کہا کسی نے یہ سیّد سے آپ اے حضرت ۞ نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں

نہ آپ عالم برزخ سے مانگتے ہیں مدد ۞ نہ فاتحہ نہ طریق دعا کو مانتے ہیں

پھر اکبؔر نے دنیا کے اہل مذاہب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سب اپنا اپنا ایک مذہبی تصور رکھتے ہیں، اپنے معبود کی عبادت کرتے ہیں اس سے دعائیں مانگتے ہیں اچھے بُرے وقتوں میں اس کو یاد کرتے ہیں حتی کہ انگریز جو اپنے کو عیسائی کہتے ہیں

اپنے سارے الحاد کے باوجود یہی عقیدہ رکھتے ہیں اکبر کہتے ہیں:

کرسچین بھی فدائی ہیں نام مریم کے ۞ بہ دل مسیح علیہ الثناء کو مانتے ہیں

مسلمانوں میں درجنوں فرقے ہیں اور سب اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا کو مانتے ہیں اور اس سے برے وقتوں میں مدد مانگتے ہیں اس سے دعائیں کرتے ہیں اکبر کہتے ہیں:

مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے ۞ کسی بزرگ کسی مقتدا کو مانتے ہیں

پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ ۞ نہ دست گیر، نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں

سرسیّد نے ان تمام باتوں کے جواب میں کہا کہ:

جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیروقرآں ۞ ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں

خدا کے سوا اور کسی سے مانگنا یا کسی کو وسیلہ بنانا شرک ہے۔

وہ بولے شرک ہی ہے جنگ واختلاف کی جڑ ۞ تو عقلمند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں

اکبر سرسیّد کے جواب کو ذکر کرنے کے بعد اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہتے ہیں کہ سرسیّد کا جواب علمی بنیاد پر صحیح ہے لیکن درحقیقت یہ صرف ان کا دعویٰ ہے وہ خدا کو بھی نہیں مانتے صرف زبانی جمع خرچ ہے اس کا واقعیت سے دور کا تعلق نہیں، اکبر کہتے ہیں:

جواب حضرت سیّد کا خوب ہے اکبر ۞ ہم اس کے قولِ درست وبجا کو مانتے ہیں

ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر ۞ خدا کو، اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوتِ فرمانروا کو مانتے ہیں

ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجئے

سرسیّد مسلمانوں کو جدید تعلیم کے ساتھ جدید تہذیب کو بھی دعوت دیتے تھے بلکہ تعلیم پر توجہ کم اور نئی روشنی سے گھروں میں اُجالا کرنے کی ترغیب زیادہ دیتے تھے مگر

مشکل یہ تھی کہ مسلمانوں کے ایک حلقہ میں مذہب سے شدید لگاؤ تھا اس لئے قدم قدم پر رکاوٹیں آتی تھیں اس صورت حال کے پیش نظر سر سیّد نے علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد کو کچھ اہم ہدایتیں بھی دے رکھی تھیں اور کہا کہ اگر ان پر عمل کرتے رہو گے تو مسلمان تم سے کبھی برگشتہ نہیں ہوں گے، تم مسلمانوں سے کہتے رہو۔

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم ۞ تحصیل ان کی بھی سحر وشام کیجئے
یورپ میں پھریئے لندن و پیرس بھی دیکھئے ۞ تحقیق ملک کا شغر وشام کیجئے
ہوجایئے طریقۂ مغرب پہ مطمئن ۞ خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجئے

بزرگوں سے عقیدت اور خانقاہوں کا تقدس بھول جایئے یہ سب توہم پرستی ہے کفر واسلام کی بحث کو لپیٹ کر رکھ دیجئے، وسیع المشرب بن کر رہئے، بس یہ دیکھئے کہ عزت وشہرت اور نام ونمود کیسے ملتا ہے شاندار بنگلے بنوایئے گھروں کو یورپین طرز پر سجایئے، وہسکی اور رم کا شوق بھی کچھ بُرا نہیں۔

یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہوجئے ۞ موقعہ ملے تو شغل مئے وجام کیجئے

اونچی سوسائٹی اور شائستہ ومہذب ملکوں میں بوس وکنار عیب نہیں تہذیب کی علامت ہے اس لئے ایسے مواقع پر دستِ تمنا کو دراز رکھئے زندگی میں رنگینیاں بھر دیجئے، سر سیّد کہتے ہیں:

نظارۂ مساں سے تروتازہ رکھئے آنکھ
تفریح پارک میں سحر وشام کیجئے

سر سیّد کچھ راز کی باتیں ان کے کان میں کہتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ ان کو گرہ باندھ لیجئے، اکبر بتاتے ہیں

مذہب کا نام لیجئے، عامل نہ ہوجئے ۞ جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجئے
طرز قدیم پر نظر آئیں جو مولوی ۞ پبلک میں ان کو موردِ الزام کیجئے
زنجیر فقہ توڑیئے کہہ کر خلافِ شرع ۞ مضمون لکھئے، دعوئے الہام کیجئے

آخر میں سر سیّد سب سے اہم نکتہ کی بات اپنے ہم نواؤں کو سمجھاتے ہیں:

جو چاہئے وہ کیجئے، بس یہ ضرور ہے
ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجئے

سر سیّد کو مرید بنا ہی لیا

اکبر کہتے ہیں کہ سر سیّد تمام آزاد خیالیوں، کجراہیوں کے باوجود ایک پیر کے مرید ہو ہی گئے، لیکن وہ پیر و مرشد کون ہے اس کی نشاندہی اکبر کرتے ہیں:

تدبیر بہت کی اے اکبر، تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی ۞ پاؤں کو بہت چھٹکا پٹکا زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی
سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی ۞ یورپ نے دکھا کر رنگ اپنے سیّد کو مرید بنا ہی لیا

دباؤ سے چندہ:

سر سیّد نے علی گڈھ کالج کے لئے چندہ فراہم کرنے کی مہم شروع کی، امراء، رؤساء اور اونچے عہدہ داروں کو لے کر جہاں جاتے ممکن نہ تھا کہ کوئی انکار کر سکے، کالج کے نوجوان طلبہ کا گروپ بنا کر عوام میں بھیجتے یہ رئیس زادے شاندار لباسوں میں ملبوس اور پوری سج دھج کے ساتھ جہاں پہنچ جاتے مجال کیا کہ کوئی بیدلی سے پیش آئے، لوگ کچھ ذہنی دباؤ محسوس کرتے کہ اپنی اوقات سے کہیں زیادہ چندہ دے دینے ہی میں عافیت سمجھتے تھے دباؤ سے چندہ لینے کی اس مہم کو شاعرانہ انداز میں اکبر بیان کرتے ہیں:

دھمکا کے بوسہ لوں گا رُخ رشک ماہ کا
چندہ وصول ہوتا ہے صاحب! دباؤ سے

علی گڈھ کی بولی سب سے اونچی

چندہ کی اس مہم کو مدنظر رکھتے ہوئے اکبر نے مڈل کلاس کے لوگوں کے عام رجحان سے روشناس کراتے ہوئے کہا کہ علی گڈھ شاندار مستقبل کا سنہرا خواب دیتا ہے، عیش وعشرت کے طلسماتی محل میں باریابی کی بشارت دیتا ہے عزت ووقار کے ز

ریں تاج کے زیب سر ہونے کی پیش گوئی کرتا ہے ایمان کی خرید وفروخت کے مارکیٹ میں ایمان کی اتنی بڑی قیمت سوائے علی گڈھ کے اور کون دے سکتا ہے، اکبر کہتے ہیں:

ایمان بیچنے پہ تو سب ہیں تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڈھ کے بھاؤ سے

نئی روشنی کا پیر نابالغ

علی گڈھ تحریک کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اکبر اس کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے وہ اس تحریک کو ملتِ اسلامیہ کے لئے مضر سمجھتے تھے اس کی ہم نوائی کو ''کارِ خرد منداں نیست'' کہتے تھے کچھ لوگ اس تحریک سے علیٰحدگی پر ان کو طعنے بھی دیتے تھے اکبر ان کو جواب دیتے ہیں:

کہتے ہیں اکبر یہ تیری عقل کا کیا پھیر ہے ۞ طبع تری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ میں بھی حاضر ہوں گا عنقریب ۞ ہو چکا ہوں پیر، بس نابالغی کی دیر ہے

کالج میں حوریں

لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم اور ان کو نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنے کی مہم شروع کی گئی تو اس موقعہ پر اکبر نے کہا:

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں ۞ حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں
کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پردا ۞ ''تھینک یو'' دیر میں سننے کے لئے کان تو ہیں

حور وغلمان کی یکجائی سے کالج کسی جنت سے کیا کم رہ جائے گا، دل ونگاہ کی جنت علی گڈھ کالج میں لڑکیوں کی تعلیم کا نیا نیا نظم ہوا تھا کالج کا ماحول تعلیم وتربیت کا جو نظام تھا اس کے پیش نظر اکبر یہ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ خاندانوں کی شرافت کا جو معیار تھا وہ باقی نہیں رہے گا عفت وعصمت کی یہ پیکر جن کے پاؤں کے تلوے بھی کوئی نگاہِ ہوس دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی وہ ہوسناک نگاہوں کا شکار ہو کر رہ جائیں گی اگرچہ

آغاز کار میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن آزاد خیالی اور جدید فیشن ان کو بہت جلد اس مقام پر پہنچا دے گا جس سے کبھی خاندانی شرافت لرزہ براندام تھی اور وہ سب کچھ ہوگا جس کا آج اظہار کیا جا رہا ہے، اکبر اسی تشویشناک اور خطرناک حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں ۞ دلکش وآزاد خوش رو ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہوں گے پیش ۞ ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بیساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے ۞ ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ
اوج قومی سے شرافت کا ہما گر جائے گا ۞ ماکیاں سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ

ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو آختہ

حکومت کی سرپرستی

مسلمانوں کا معاشرہ ابھی اتنا بے حس نہیں تھا اس لئے علی گڈھ تحریک سے مذہب پر جوزد پڑتی تھی اس سے مذہبی جذبات رکھنے والے غیرتمند مسلمان تلملا جاتے تھے مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے حکومت کی سرپرستی ان کو حاصل تھی وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں کہیں کوئی ان کی زبان بند کرنے والا نہ تھا ایک جابر وقاہر حکومت کا ان کی پشت پر ہاتھ تھا اس صورت حال پر اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں طنز کیا، وہ کہتے ہیں:

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس ۞ ''کیسا احمق لوگ تھا'' پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے ۞ اور وہ کافر پکارے ''درپناہِ من بیا''

الحاد کا انجکشن

اکبر نہ علوم جدید کے مخالف تھے اور نہ کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے بدگمان تھے بس ان کو یہ غم لاحق تھا کہ سرسیّد نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اور جو

نظام تعلیم و تربیت مرتب کیا ہے اور کالج کا جو ماحول بنایا ہے یہ اچھے خاصے دیندار گھرانوں کے سیدھے سادے اور شریف لڑکوں کو نہ بگاڑ دے وہ تو صحیح نیت اور نیک ارادوں کے ساتھ کالج میں داخل ہوئے ہیں وہ تعلیم حاصل کر کے معاش کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، وہ تعلیم کو اپنے مذہب اور اپنی قوم کی ترقی کا زینہ سمجھتے ہیں وہ اپنی طبیعت کی پاکیزگی اور گھر کے دینی ماحول کی نظافت کی وجہ سے ہر طرف سے نگاہیں پھیر کر صرف تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن کالج کا ماحول اور اس کے انگریز پروفیسر ان کی دینی رگوں میں جو الحاد کا انجکشن دے رہے ہیں اس کا اثر ان کی زندگی میں ایک دن ظاہر ہو کر رہے گا، اکبرؔ نے اپنی ایک نظم میں اپنی تشویش کا بڑے درد کے ساتھ اظہار کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

خدا علی گڈھ کے مدرسہ کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے
لطیف و خوش طبع چست و چالاک صاف پاکیزہ شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت، دلوں میں ان کے ہیں نیک اردائے

اکبرؔ پھر طلبہ کے ذوق و شوق اور تعلیم میں انہماک اور کمال محنت کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان میں مشرقیت کا پورا پورا اثر ہے مگر مغربیت کا رنگ ڈھنگ بتدریج ان میں آتا جا رہا ہے طلبہ کے سلیقہ و تہذیب، اخلاق اور وضعداری کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فیاض بھی ہیں اور ان میں قومی ہمدردی بھی ہے کالج میں پڑھنے والی زہرہ جبینوں کی برق پاش نگاہوں سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتے، ان میں قومی ہمدردی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ رئیس زادے پورے گروپ کے ساتھ عوام میں جاتے ہیں اور ان سے کالج کے لئے چندہ مانگتے ہیں، دست سوال دراز کرنے میں ان کو کوئی جھجک نہیں ہوئی اور نہ وہ اس میں اپنی توہین سمجھتے ہیں اور نہ اپنی عزت وشان اور اپنے وقار کے خلاف سمجھتے ہیں وہ صرف اس جذبے سے کام کرتے ہیں کہ اس سے قوم و مذہب کی سرخروئی اور سربلندی ہوگی، گھر اور خاندان کے ماحول کا یہ اثر

ہے کہ کالج کی سرگرمیوں کو قوم و مذہب کا کام سمجھ کر خلوص دل سے انجام دے رہے ہیں، اکبر طلبہ کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے، اکبر حال سے نہیں مستقبل سے خائف ہیں وہ طلبہ کی ان تمام سرگرمیوں کو نیک نیتی پر محمول کرتے ہیں، مگر انجام کیا ہوگا؟ اکبر کہتے ہیں:

انھیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کارِ دیں ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی، اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان کالج کے سب مکیں ہیں، ابھی انھیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر، ہے کیسی منزل، ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نورِ ایماں، کوئی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق، ادائے طفلی، یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب، سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو دین و ملت، نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے، جناب باری میں یہ دعا ہے
علومِ حکمت کا درس اُن کو، پروفیسر دیں، سمجھ خدا دے

نیچریت

سر سیّد اپنی تقریروں اور اپنے مقالوں میں، بالخصوص اسلامی تہذیب و ثقافت کی تردید کے دلائل میں نیچر کا لفظ بکثرت استعمال کرتے تھے مسلمانوں کے بہت سے طریقوں، عقیدوں، اصولوں اور روایتوں کو نیچر کے خلاف کہتے اور اس کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے، لفظ نیچر کا استعمال اتنی کثرت سے انھوں نے کیا جیسے مذہبی احکام کو نیچر کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، جب شرعی دلائل کا جواب ان سے نہیں بن پڑتا تھا تو اس کو نیچر کے خلاف کہہ کر رد کر دیتے تھے، نیچر کا لفظ سنتے سنتے لوگوں کے کان پک گئے اس لئے کچھ ہی دنوں کے بعد سر سیّد اور ان کے ہم نواؤں کا ''نیچری''

علم ہوگیا، دینی حلقوں اور اسلام پسندوں کی محفلوں میں وہ اسی لفظ سے یاد کئے جاتے تھے اکبر کہتے ہیں کہ نیچریت درحقیقت لباس اور جدید فیشن اختیار کرنے اور ظاہری تبدیلیوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ الحاد کی دعوت ہے، اکبر نے دومصرعوں میں اس کو بیان کردیاہے:

نیچریت چیست؟ از دیں گم شدن
نے قمیص وکوٹ وپتلون وبٹن

وعظ نیچر

سرسیّد نے کالج کے چندے کے لئے بہترین مقررین کی ایک ٹیم بنائی تھی ان میں بعض مقررین کا انداز بیان اتنا ولولہ انگیز ہوتا تھا کہ توقع سے زیادہ چندہ ہوجاتا تھا ڈپٹی نذیراحمد اس فن کے ماہر تھے سرسیّد اکثر ان کو اپنی ٹیم میں شامل رکھتے تھے ان کی دھواں دھار تقریروں کے سامنے کوئی زبان نہیں کھول سکتا تھا، اکبر کی نگاہوں نے بھی یہ مناظر دیکھے تھے، ان تقریروں کو سن کر کیا تاثر ہوتا تھا اکبر اس کو بیان کرتے ہیں:

کیا زور تھا وعظ نیچر میں، دیوتاؤں کا بھی جی چھوٹ گیا
تقویٰ کی بنائیں ہوگئیں شق، شیرازۂ ملّت ٹوٹ گیا

سرسیّد اور ان کے ہم نوا یہ سمجھ رہے تھے یا کم از کم یہ سمجھا رہے تھے کہ اصل دین کی خدمت ہم انجام دے رہے ہیں، اگرچہ وہ دین کا نام تو کم لیتے تھے لیکن قومی خدمت کا ڈھنڈورہ خوب پیٹتے تھے اور مسلمانوں کو یہ باور کرا رہے تھے کہ قوم خوشحال ہوگی اور ترقی کرے گی تو دین بھی ترقی کرے گا اکبر ان جھوٹی طفل تسلیوں کو سن کر جل بھن کر کہتے ہیں:

بزرگان ملت نے کی ہے توجہ ۞ کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد
ترقیِ دیں ہوگی اب روز افزوں ۞ علی گڈھ کا کالج ہے لندن کی مسجد
لندن نے اپنی ایک امت بنائی ہے علی گڈھ کا کالج انھیں امتیوں کی مسجد ہے

جدید تہذیب کی پرستش کرنے والے لندن کو قبلہ بنا کر یہاں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

نیچریوں کی رعونت

علی گڈھ سے ڈگریاں لے کر نکلنے والے عہدوں پر سرفراز کئے جاتے رہے لاٹ بہادر کے دربار میں بار پانے لگے انگریز افسران کی چاپلوسی کر کے ان کی نظر عنایت اپنی طرف مبذول کرانے میں وہ کامیاب ہو رہے تھے، عام مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا معیار زندگی بلند ہوتا جا رہا تھا، سماج میں وہ اب امتیازی حیثیت کے مالک بنتے جا رہے تھے، عوام سے ان کا ملنا ان کے لئے توہین کا باعث تھا وہ مسلم سماج سے کٹ کر علیحدہ زندگی گذرانے اور جدید تہذیب کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کو اپنی انتہائی کامیابی سمجھتے تھے، اب ان کا دماغ آسمان پر رہنے لگا۔ مذہب کی خوبو ان کی زندگی سے نکل چکی تھی اب اگر دین پسند افراد ان لوگوں کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرتے تو ان کے دماغ کا پارہ اوپر چڑھ جاتا، علماء ومشائخ کا ذکر انتہائی حقارت سے کرتے جیسے وہ حشرات الارض ہیں اور پاؤں سے مسل دینے کے لائق ہیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اب ذہنی وفکری ارتداد اور الحاد کے دائرے میں داخل ہو چکا تھا، اکبرؔ اس ذہنی انقلاب کو بہ نظر غائر دیکھ رہے تھے، انھوں نے اپنے مشاہدات کو اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابل تو وہ فرعون صفت بن جاتے ہیں اور جب انگریزوں کا سامنا ہوتا ہے تو چپراسیوں کی طرح ''جی حضور'' ''جی سرکار'' کہکر کمر تک جھک جاتے ہیں، اکبرؔ کہتے ہیں:

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے ۞ غیر کا جب سامنا ہو، بس قلی بن جائیے
فلسفہ الحاد کا کرلیجئے فوراً قبول ۞ دین کی ہو بات، تو ابطال پر ٹھن جائیے

نئی روشنی کے بہروپئے

جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مذہب کو فٹ بال کی گیند بنا رکھی تھی اپنی تقریروں میں

آنسو بہا بہا کر قرآن پڑھتے، مسلمانوں کی پستی و ادبار کا رونا روتے، ایسا محسوس ہوتا کہ دین اور قوم کا جتنا درد ان کے سینوں میں ہے پوری قوم اس سے محروم ہے، قرآن ہی سے انگریزی حکومت کے فضائل و مناقب بیان کرتے، مسلمانوں کو اسلام سے دوری کا طعنہ دیتے اور اپنی قومی و دینی خدمات اور اپنے اخلاص کا اظہار کرتے کیونکہ ان سے کالج کے لئے چندہ لینا ہے اور جب مسلمانوں کی جیب کاٹ کر واپس ہوتے اور وہ کسی دینی مجلس میں بلائے جاتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ اسلامی اقدار کی محافظ یہ جماعت اتنی حقیر و ذلیل ہے کہ اس کی مجلس میں شمار ہونا بھی ان کے لئے اپنی شان کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اکبؔر کہتے ہیں:

چندے کی محفل میں پڑھئے رو کے قرآن مجید ۞ مذہبی محفل میں لیکن، مثل دشمن جایئے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت ۞ روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جایئے

تہذیب جدید کے پیر طریقت

جدید تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کے فروغ کی بات تو کبھی نہیں کرتا تھا لیکن قومی ترقی قومی ہمدردی کا مظاہرہ ہر محفل میں کرتا تھا، اس حُب قومی کے نام پر وہ سیدھے سادے مسلمانوں کا استحصال کرتے تھے عام مسلمانوں سے اس نام پر چندے لیتے اپنی شان وشوکت میں اضافہ کرتے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے اور اُکسانے اور علی گڈھ تحریک کو منزل تک پہنچانے میں دل وجان سے لگے رہنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتے اور دین پسندوں پر طنز و تعریض کرنے سے کبھی بھی نہیں چوکتے تھے، اکبؔر اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں:

کمر باندھی ہے یاروں نے جو راہ حب قومی میں ۞ وہ بولے تو نہیں چلتا، وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر ۞ یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا
لطیف الطبع ساتھی چاہئے فیاض طینت کا ۞ چمن سے بے ہوا کے کارواں یونہیں چلتا
جب چندوں کی فراوانی ہوگی کالج میں دولت کا انبار آئے گا تبھی کالج کے

پروفیسروں اور طلبہ کی شان وشوکت کا مظاہر ہوگا اور یہاں سے لطیف الطبع افراد جو ہر طرح کے دقیانوسی خیالات سے مبرا اور فرسودہ عقائد سے بے تعلق ہوں تعلیم حاصل کر کے عوام میں جائیں گے جدید فیشن اور جدید تہذیب کے مظاہر کے لئے دولت وثروت کا مظاہرہ کریں گے تبھی کالج کے ثمرات وبرکات سے عوم متاثر اور مرعوب ہوں گے، چمن میں بادصبا نہیں چلے گی تو پھولوں میں لاکھ خوشبو ہو صحن چمن سے یہ خوشبو باہر نہیں جائے گی۔

غلامانہ ذہنیت

سرسیّد کو ترقی پسندی کی دھن میں مسلمانوں کے ہر طریقہ کار سے جیسے ضد سی ہوگئی تھی کئی صدیوں سے ہندوستان میں مسلمان حکمراں رہے جس کی وجہ سے یہاں جمعہ کا دن ہفتہ میں چھٹی کا دن سمجھا جاتا رہا ہے بازاروں مدرسوں اور سرکاری دفاتر میں چھٹی کا دن جمعہ ہر جگہ رائج تھا اس پر برادرانِ وطن نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں عیسائیت کی تبلیغ زورشور سے کی اور کچھ لوگ عیسائی ہو بھی گئے تو عیسائیوں کے نزدیک اتوار محترم دن تھا اس دن چرچ میں حاضری ہوتی تھی، انھوں نے مسلمانوں کے محترم دن جمعہ کو شکست دے کر حکومت کے دفاتر میں اتوار کی چھٹی قانوناً جاری کرادی اور جمعہ کی چھٹی کالعدم ہوگئی، سرسیّد چونکہ انگریزی حکومت کی ہر ادا کے پرستار تھے اس لئے انہوں نے بھی بے چون وچرا تسلیم کرلیا اور کالج میں جمعہ کی چھٹی کے بجائے اتوار کی چھٹی کا اعلان کردیا گیا اس طرح سرسیّد مسلمانوں کو نفسیاتی ایذا پہنچانے میں عیسائیوں کے شریک کار ہوگئے، اکبؔر کہتے ہیں:

مرشد نئی روشنی کا ہے قابلِ قدر ۞ تزئین بھی خوشنما ہے تنویر کے ساتھ
طالب جمعہ کا لیکن اس سے رہے دور ۞ اتوار لگا ہوا ہے اس پیر کے ساتھ

پنشن یافتہ نبی

سرسیّد نے صرف جدید علوم کی تعلیم کے لئے کالج نہیں کھولا تھا بلکہ تعلیم کے ساتھ تہذیب جدید کی بھی تبلیغ کرنی تھی، ورنہ مذہبی بحثوں کے چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی انھوں نے تہذیب الاخلاق رسالہ کے ذریعہ جمہور امت کے متفق علیہ اصولوں پر تنقید کی چھری چلائی، احادیث کے نئے نئے معنی تراشے اور اگر کوئی تاویل نہ ہوسکی تو بخاری و مسلم ہی کی حدیث کیوں نہ ہو اس کو ماننے سے صاف انکار کردیا، اپنی تعلیمی مہم ہی کے دوران قرآن کی تفسیر لکھنے کی ان کو سوجھی، بائبل کی شرح لکھنے میں مصروف رہے، ایک کالج چلانے کے لئے چندوں کی جو مہم چلائی تھی وہ کافی تھی یہ چومکھی لڑائی چھیڑنے کا کیا مقصد تھا؟ مسلمانوں کے مذہب اور شریعت اور اسلامی نظام زندگی کو نشانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ سب کچھ کیا اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کو متاثر کیا اور باقاعدہ اسلام پسندوں کے خلاف محاذ کھول دیا، ان کا کوئی لکچر، ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں اسلام کی تنقیص کا کوئی پہلو نہ ہو، مسلمانوں کی تہذیب وثقافت پر اعتراض نہ ہو، ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اسلام کو ماڈرن بنانے کا کوئی منصوبہ لے کر میدان عمل میں آئے ہیں، اکبر کہتے ہیں کہ سرسیّد پہلے کار نبوت انجام دے رہے تھے لیکن اب ریٹائر ہو کر پنشن پا رہے ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا کی مذہبی تاریخ میں ہمیں کوئی ایسا نبی نہیں ملتا جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن پائی ہو، اکبر کہتے ہیں:

عقل سیّد بود از انوار حکمت یافتہ ۞ زور بازویش عدورا پنجہا بر تافتہ
مشکلے در پیش ہست، اورا اگر گویم نبی ۞ از انبیاء ہرگز کسے نگذشت پنشن یافتہ

سرسیّد حکمت وفلسفہ سے بھری ہوئی باتیں کرتے ہیں کہ ان کے جواب میں اہل اسلام کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے اور اس بلند مقام سے باتیں کرتے ہیں جس مقام پر کبھی انبیاء فائز ہوا کرتے تھے۔

مقام حیرت

اکبؔر کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یورپین اقوام بھی وہ کتابیں وہی نصاب پڑھتی ہیں جو سر سیّد کے کالج میں رائج ہے لیکن آج تک کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ اس تعلیم کی وجہ سے یورپ کے لوگ اپنے مذہب سے دور اور ملحد و بددین ہوگئے اور اپنے مذہب مسیحیت کے خلاف انہوں نے مورچہ بندی کی ہو وہی نصاب اور وہی کتابیں سر سیّد اپنے کالج میں پڑھواتے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل اس نصاب کو پڑھ کر اسلام سے برگشتہ ہو جاتی ہے اور اسلام کی جڑ بنیاد کھودنے کی درپے ہو جاتی ہے آخر اس میں کیا راز ہے، اکبؔر کہتے ہیں:

درس تھا یکساں مگر وہ تو مسیحی ہی رہے ۞ تجھ پہ مذہب کے عوض شیطاں کا قابو ہو گیا
ایک ہی بوتل سے پی ہوٹل میں دونوں نے شراب ۞ لطف مستی اُن کو آیا، اور تو اُلّو ہو گیا

چڑھاوے کا پھول

اکبر کہتے ہیں کہ سر سید انگریزی حکومت کو ''ظل اللہ فی الارض'' کہہ کر مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی اطاعت کو واجب کہتے ہیں اور مانتے ہیں اور خود اس کا مکمل وفادار ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں ان کا مقصد مسلمانوں کی نئی نسل کو نئی تہذیب جدید کی تبلیغ صرف اس لئے ہے کہ ''آقایان ولی نعمت'' کی خوشنودی حاصل ہو ان کی نظر عنایت ہم پر زیادہ ہو جائے، اکبر کہتے ہیں کہ جس طرح صاحب کے خانساماں اور بیرے نوکر چاکر صاحب کی میز سجاتے ہیں تو سب سے پہلے تازہ پھول کا گلدستہ میز پر رکھتے ہیں خوش منظر گلدانوں کو دیکھ کر صاحب کی طبیعت تازگی و فرحت محسوس کرے گی تو ہماری خدمت کو حسن قبول حاصل ہو جائے گا سر سید بھی انہیں کی طرح صاحب کی میز کے لئے گلدستے سجاتے ہیں علی گڈھ کالج درحقیقت ایک گلدان ہے جس میں مختلف طبقات کے مسلمانوں کو پھولوں کی جگہ باندھ کر صاحب کے

سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ ان کی نظر عنایت حاصل ہوتی رہے، اکبر نے ایک قطعہ میں یہ بات کہہ دی ہے۔

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے — مضمون لطیف، خوب برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علی گڈھ کالج — گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہے

مالک اور نوکر

اکبر کہتے ہیں جب رئیس گھرانوں میں خانساماں، بیرے اور نوکر چاکر رکھے جاتے ہیں تو اونچی سوسائٹی میں استعمال ہونے والی اشیاء کے نام بتائے جاتے ہیں ان کی شناخت کرائی جاتی ہے ہر چیز پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے، لب ولہجہ کو سمجھنے کی ان کو ٹریننگ دی جاتی ہے تا کہ ضرورت کے وقت ان سے صحیح ڈھنگ سے کام کی توقع رکھی جائے، گنوار پن کا مظاہرہ نہ کرسکے انگریز اپنی زبان ہندوستانیوں کو اسی حیثیت سے سکھاتے ہیں کہ ہماری صحیح طریقہ سے خدمت انجام دے سکیں علی گڈھ کالج کا واحد مقصد یہی ہے۔

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زبان — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کی زباں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل وتمیز — اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں

نوکری نہ ملی

علی گڈھ کالج کا مقصد دفتری کلرکوں کی کمی کو پورا کرنا تھا طلبہ کا بھی مقصد وحید سرکاری ملازمتوں کا حصول ہی تھا تا کہ زندگی فکر معاش سے آزاد ہوجائے ابتدائی دور میں کالج سے ڈگری لے کر نکلنے والوں کو ملازمتیں بھی ملتی رہیں، سرسید کو فخر ومباہات کا موقعہ حاصل ہوتا رہا اور علی گڈھ کالج کی شہرت ونیکنامی میں اضافہ ہوتا رہا، سرکاری نوکری نئی نویلی دلہن کی طرح ہر خاندان کی منظور نظر بن گئی، اور مسابقت کا جذبہ عام ہوتا گیا لیکن ان کی پیداوار ضرورت سے زائد ہونے لگی اور ملازمتوں کی جگہیں محدود

تھیں اب کوئی خوش قسمت ہی ہوتا تو اس کو سرکاری نوکری ملتی تھی اکبر کے سامنے یہ صورت حال تھی، وہ کہتے ہیں۔

خواہان نوکری نہ رہین طالبان علم قائم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی
کالج میں دھوم مچ گئی ہے ''پاس پاس'' کی عہدوں سے آرہی ہے صدا ''دور دور'' کی

نئی روشنی کے دلدادہ یہ طلبہ کالج کے ماحول اور فضا کی وجہ سے دین وشریعت سے آزاد ہو چکے تھے مذہب بیزاری ان کا مزاج بن چکی تھی وہ کالے انگریز بن چکے تھے اس لئے جب تک وہ کالج میں رہے ہمیشہ علماء ومشائخ اور دین ومذہب کا مذاق اڑاتے رہے، ماڈرن اور اپٹوڈیٹ بننے کے لئے کالج کی فضا میں ایسا کرنا ان کے لئے ناگزیر ہو چکا تھا، تہذیب جدید کی اس تجلی گاہ سے وہ ڈگری لے کر نکلے اور عملی زندگی کے میدان میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مستقبل تاریک ہے، دفتروں کی خاک چھانی مگر سب اتنے خوش قسمت کہاں کچھ کو کہیں کہیں معمولی کلرکی مل گئی مگر اکثریت بے روزگار معاشی تنگی کا شکار ہو کر معمولی معمولی نوکریوں اور ذلیل پیشوں پر اتر آئے۔ اکبر کہتے ہیں ؎

تم نے واعظ کی خوب داڑھی نوچی یہ بات مگر نہ اپنے دل میں سوچی
مذہب کو شکست دے کے کیا پائیں گے آخر کو رہیں گے موچی ہی کے موچی

پیشین گوئی پوری ہوگئی

سرسید کے قائم کردہ کالج کی طرف سے اکبر کو جو اندیشے تھے وہ سب حقیقت بن کر ان کے سامنے آنے لگے، سرسید ۱۸۹۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے لیکن ان کے بعد اکبر چوبیس سال زندہ رہے اور جس دن سے وہ ڈرتے رہے ان کی زندگی ہی میں وہ دن آ گئے، اور اس کے برے دن بتدریج آتے چلے گئے، علی گڈھ کالج شجر اسلام کی جڑوں کے لئے کھولتا ہوا پانی ثابت ہونے لگا، مسلمانوں کی جو اولاد یورپ سے ڈگریاں لے کر یہاں آئی تو ڈگریوں کے ساتھ الحاد کا بھی سرٹیفکیٹ لے کر آئی ان

میں سے اکثر دین بیزار ہی نہیں مذہب دشمن بن کر آئے علی گڈھ میں وہ اونچے عہدوں پر سرفراز کردیئے گئے انہوں نے مسلمانوں کی پوری ایک نسل کو جوان کے زیر تعلیم وتربیت تھی غلط راہوں پر لگادیا اوران کی مذہبی رگوں میں الحاد کا اتنا تیز انجکشن دیا کہ وہ ترقی پسندی کی دھن میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ دین وشریعت اور مذہب گرد کارواں بن کر رہ گیا کچھ شاعر بن گئے کچھ افسانہ نگار کچھ قائد بنے اور کچھ کارل مارکس اور لینن کے پرستار بن گئے علی گڈھ کالج کی تاریخ کی یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا جو اس تعلیم گاہ کی تاریخ سے کچھ بھی واقف ہے، سرسید کے انتقال کے بعد اکبر نے کئی نظمیں لکھیں جو صورتحال کو پیش کرتی ہیں وہ کہتے ہیں کہ سرسید نے ابتدا ہی سے جو نظام تعلیم وتربیت بنایا اس کا لازمی نتیجہ الحاد وبے دینی کی حوصلہ افزائی تھا، آج جو نئی نسل مذہب سے دور ہے دور تر ہوتی جارہی ہے یہ کوئی خلاف امید بات نہیں، ناگ پھنی بو کر اس سے گلاب کے پھولوں کے پیدا ہونے کی امید رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے، اکبر کہتے ہیں اور کس درد کے ساتھ کہتے ہیں

ہوائے الحاد رنگ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر، جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے
ہمیں نے دراس ہوا پہ کھولا، کیا اسے چپ جو کوئی بولا
ہمیں ہے اب خود تردد اس کی، طبیعت اب ہاتھ مل رہی ہے
جو پیشوا خود ہوں رند مشرب، تو کیا جمے رنگ وعظ ومذہب
قلوب شیطاں کے متبع ہیں، زبان قرآں پہ چل رہی ہے

اکبر آگے نظم میں یہ بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے ہم کو لامذہب بنایا مگر وہ خود مذہب کے حدود سے باہر نہیں ہوئے، بڑا سے بڑا انگریز اتوار کو چرچ جانا ضروری سمجھتا ہے پوپ کے سامنے اعتراف گناہ کر کے نجات کا طالب ہوتا ہے، ہمارے پڑوسی برادران وطن ہندوؤں نے بھی انگریزی تعلیم حاصل کی اور اونچی سے اونچی نوکری حاصل کی بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہوئے مگر اپنے دھرم کو ترک نہیں کیا یہ صرف

مسلمان قوم ہے کہ ذرا سی انگریزی پڑھ لی اور چند دن علی گڈھ کالج میں وہ رہے اور اپنے مذہب پر تیشہ چلانے میں طاق ہو گئے، اکبر بہت ہی دل شکستہ ہو کر درد بھرے دل سے کہتے ہیں۔

خدا کی ساعت ہے یاں کی صدیاں چھپی نہیں ہیں ہماری بدیاں
بلائیں آئیں اور آرہی ہیں کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے

❁ ❁ ❁ ❁

زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے رازِ سوزِ حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو گورِ سید پہ جل رہی ہے

اس صورت حال کی عکاسی اکبؔر نے اپنی ایک دوسری نظم میں بھی کی ہے، اس نظم میں اس راز سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو گمراہ کرنے میں کچھ نام نہاد مسلمان مفاد پرست افراد کلیدی رول ادا کر رہے ہیں کیونکہ اس سے انگریزی حکومت میں ان کو سرخروئی حاصل ہوتی ہے ان کے وقار اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے ان کا عہدہ ایک زینہ اور اوپر چڑھ جاتا ہے، انگریز افسران کی نظر عنایت ان پر مزید بڑھ جاتی ہے، یہ لوگ مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں وہ ان کو بتاتے ہیں کہ مسلمان قوم ترقی کر رہی ہے، قوم میں نئی توانائیاں آرہی ہیں حالانکہ حقیقت ان کا منہ چڑاتی ہے، مسلمانوں کی مذہبی زندگی عالم نزع میں مبتلا ہے اور دم توڑ رہی ہے اکبر اپنی اس نظم میں ان تمام حقائق کو کھول کر بیان کرتے ہیں، اس نظم میں اکبر کا سوز و گداز اور دل کا درد بول رہا ہے، نظم ہے

بنائے ملت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان، مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا، کہ خوش ہیں، گویا ابھر رہے ہیں
اُدھر ہے قوم ضعیف و مسکیں، اِدھر ہیں کچھ مرشدان خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہے ہیں، وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
صدائے الحاد اٹھ رہی ہے، خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے

دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے، کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں

آگے چل کر اکبر نے یہ بتایا ہے کہ یہ شاہین صفت قوم مسلمان جو کبھی آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتی تھی آج چاندی کے قفس میں بند ہے وہ انہیں پر نظریں جمائے ہوئے ہے، اس کو یہ احساس بھی نہیں کہ اس کے پر کتر دیئے گئے ہیں اور اس سے اس کی قوت پرواز چھین لی گئی ہے اکبر مزید یہ بتاتے ہیں کہ یورپ میں بھی یہ ہوا ضرور چلی ہے لیکن ابھی وہاں الحاد کا نشتر اتنا تیز نہیں ہے کیوں کہ اس کا سبب کچھ اور ہے اکبر کہتے ہیں۔

مگر وعظ وہاں کی ہے ’’’نیشن‘‘ رکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے کم لفظ ’’سالویشن‘‘ خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے، وہاں وہی عزت[۱] بشپ ہے
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں، وہاں کلیسا سنور رہے ہیں

ڈرامے کا آخری سین

بیسویں صدی کا چوتھائی حصہ قریب الاختتام ہے، سرسید اپنے مشن کی تکمیل کر کے بہت پہلے اس دنیا سے جا چکے تھے اکبر الہ آبادی دین کے رہنزنوں سے ہشیار کرتے کرتے اور جاگتے رہو کا نعرہ لگاتے لگاتے تھک چکے تھے علی گڈھ میں تہذیب جدید کی جو فیکٹری قائم کی گئی تھی اس میں پروڈکشن کا سلسلہ جاری تھا، پورے ملک میں مسلمان قوم دو حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی تھی ایک خالص دنیا دار عہدہ ومنصب کا رسیا، دوسرا خالص دین ومذہب کا فدائی اسلامی ثقافت واقدار کا دیوانہ، دونوں کو ایک دوسرے کی محفلوں سے اجتناب، دونوں کی دنیائیں الگ الگ دونوں کی دلچسپاں علیحدہ علیحدہ ایک جدید تہذیب جدید فیشن کا پرستار بیوی بچے تک تہذیب جدید کا ماڈل بنے ہوئے، انگریزوں کی نقالی میں ہنس کے جوڑے کی طرح ہر محفل میں میاں کے

---

۱ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا احترام۔

ساتھ بیوی ہلال و بدر کی سب تابشیں اڑائے ہوئے، سوادِ رومہ و کاشان جگمگائے ہوئے حاضر و موجود دوش بدوش ہم نوالہ و ہم پیالہ رونق محفل ہر ایک کی مرکز نگاہ دوسری طرف اسلامی ثقافت کے کھنڈر میں بیٹھے ہوئے قلندر دین کے دیوانے، باقی پوری فضا خاموش اور ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا۔ اکبر کہتے ہیں ؎

چرچے ہیں نہ مذہب کے، نہ وہ قصہ دل ہے — پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل ہے
اس عہد میں مائل سوئے الحاد جو دل ہے — اس کی تو گورنمنٹ ہی رسپانسبل[1] ہے
تنخواہ کے بل سے ہمیں ہوتی ہے مسرت — اور شیخ یہ کہتا ہے کہ یہ سانپ کا بل ہے
غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا — محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر[2] و یل ہے

اب دین کا خدا ہی حافظ ہے، اکبر کی آخری فریاد تھی۔

---

[1] ذمہ دار۔

[2] یورپ کے دو مشہور فلاسفر۔

''متاع عقیدت'' پر ایک نظر

تاج الدین اشعرؔ رام نگری کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''متاع عقیدت'' پڑھ کر اشعرؔ صاحب کی قادر الکلامی، زبان و بیان پر دسترس، خوبصورت تعبیرات کے استعمال پر قدرت کاملہ کا اندازہ ہوا، اشعر صاحب کی شاعری کارشیشہ گری و مرصع سازی ہے، وہ ہیروں کو تراش کر ان کی آب و تاب میں اضافہ کرنے کا فن جانتے ہیں، بہترین نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، عشق نبوی یا حب رسول کا اظہار، غزل کی شاعری کی لذیذ ترین داستان، عشق و محبت کے اظہار کا لب و لہجہ سب کچھ شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت اور مقام و مرتبہ کے شایان شان ہونا چاہئے محبوب کی زلف معنبر کو سنبل و ریحان اور جبین کو ماہ چہاردہم کہا جاتا ہے، لغت میں بھی اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن جو لوگ الفاظ کی معنویت اور گہرائیوں کو پیش نظر رکھتے ہیں وہ یہاں بھی احتیاط ہی کرتے ہیں، ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت جس کو محبوب رب العالمین کہا جاتا ہے جس کے دامن تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس کے بارے میں جو الفاظ اور محاورے اور تشبیہیں استعمال کی جائیں تو ان کے اندر بھی تقدس اور طہارت و پاکیزگی کا عنصر شامل ہونا چاہئے، مثلاً ایک شاعر جبین مقدس اور آپ کے گیسوئے عنبریں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جبین ناز تیری لوحۂ محفوظ ہے گویا
تیرا گیسوئے شام افروز ہے آیات قرآنی

پیشانی کو لوحۂ محفوظ اور سیاہ زلفوں کو آیات قرآنی سے تشبیہ دی گئی، مشبہ اور مشتبہ بہ دونوں میں تقدس اپنے انتہائی بلند معیار پر ہے اور یہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان بھی ہے، اشعرؔ صاحب اس طرز سخن کے نکتہ شناس ہیں ان کی تمام نظموں میں ہر جگہ عقیدہ کی صلابت کے ساتھ ساتھ عقیدت وارادت کا تقدس اور انداز

بیان اور طرز اظہار کی پاکیزگی نمایاں ہے۔

اشعرؔ صاحب کا مطالعہ وسیع ہے، سیرت کے موضوع سے ان کا خاص تعلق ہے اس لئے وہ عام الفاظ میں اپنے عشق و محبت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات آپ کے امتیازات آپ کی خصوصیات آپ کے معجزات اور تبلیغ اسلام کے غمناک واقعات ان کی نگاہوں میں ہیں وہ ان تمام اوصاف و واقعات کے نپے تلے الفاظ میں خوبصورت اور شگفتہ اسلوب کے ساتھ اپنی نظموں میں سمو دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے کلام کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے، جیسے صاف شفاف کپڑوں میں ''عطر شامۃ العنبر'' چھڑک دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے اشعر صاحب کی نظمیں پڑھ کر عشق رسول اور حب نبوی کی وہی خوشبو ہر قاری کے ذہن وفکر کی فضاؤں میں پھیل جاتی ہے، اشعر صاحب کا جوہر اس وقت زیادہ کھلتا ہے جب وہ مسدس کی ہیئت میں نعتیہ کلام کہتے ہیں، ان کی متعدد نظمیں خاصی طویل ہیں پچیس چھبیس سے زیادہ بند پر مشتمل ہیں اور کتاب کے چھ سات صفحات میں آئی ہیں۔

مسدس کے ہر بند میں ایک خاص پہلو پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور اس کا چھٹا مصرعہ اس بند کی جان ہوتا ہے، وہ اتنا بیساختہ، برجستہ اور رواں دواں ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے پورا بند چمک اٹھتا ہے، یوں سمجھئے کہ چار مصرعے سپیدۂ سحری کی طرح ہیں پانچواں مصرعہ اس سرخ شفق کی مثال ہے جو شہنشاہ خاور کے طلوع ہونے کی بشارت دیتی ہے اور چھٹا مصرعہ دمکتے ہوئے سورج کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس فن کے ماہر میر انیس تھے انہوں نے اس نکتہ کو بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا مرزا دبیر پر ان کی ترجیح کے اسباب میں یہ نکتہ شناسی بھی شامل ہے، اشعر صاحب بھی اس نکتہ سے آگاہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی بیشتر نظموں میں ان کا یہ جوہر چمکتا دمکتا ہوا نظر آتا ہے، ان کی ایک نظم ''سعادت'' کا یہ بند دیکھئے۔

شکر خدا کہ روح بشر شادماں ہوئی بندوں پہ اپنے، رحمت حق مہرباں ہوئی
پستی زمیں کی رو کش صد آسماں ہوئی پنہاں تھی شان حسن ازل سے عیاں ہوئی

مژدہ سنایا کعبہ میں روح الامین نے
ہنس کر مزاج پوچھا فلک کا زمین نے

پہلے چار مصرعوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری کو روح بشر کی شادمانی اور بندوں پر رحمت حق کی مہربانی، ''شان حسن'' جو ازل سے پنہاں تھی اس کے عیاں ہونے کا ذکر کیا گیا پھر قدم مبارک کے زمین پر پڑنے سے زمین کی رفعت وسربلندی میں جو بے پناہ اضافہ ہوا اس کا تذکرہ کیا گیا اور جب جبریل نے شہنشاہ کونین کی زمین پر آمد کا مژدہ سنایا تو زمین نے فخر وناز کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا جس کو ہمیشہ اپنی رفعت وسربلندی کا غرور تھا، اور آج جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک زمین پر پڑے تو زمین کی رفعت وسربلندی آسمان سے بڑھ گئی، زمین جو اپنی پستی کی وجہ سے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا تھی اس کے فخر وناز کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا، اس کیفیت کو اشعر صاحب نے کتنی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

ہنس کر مزاج پوچھا فلک کا زمین نے

مسدس میں جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیں:

وہ ذات جس پہ صدقے نگارِ حیات تھی — روز ازل سے رہرو راہ نجات تھی
وہ جس کی منتظر نگہِ کائنات تھی — سب آچکے تھے باقی محمدؐ کی ذات تھی
وہ آگئے تو ختم شب تار ہوگئی — دنیا تمام مطلع انوار ہوگئی

آگے کے بند میں معراج کا ذکر ہے جس میں آیت قرآنی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی طرف اشارہ ہے۔

قربان اس پیمبر امّی کی شان پر — جز وحی حق کچھ آئے نہ جس کی زبان پر
تھے خاک پر قدم تو نظر آسمان پر — خالق سے ہمکلام ہو جو دو کمان پر
عقل شکستہ پا کو بس اتنی خبر ملی
لوٹے تو ہلتی آپ کو زنجیر در ملی

مدعیان عقل وخرد معراج کی تفصیلات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، اس کے بیان کے لئے ''عقل شکستہ پا'' کی تعبیر کتنی معنی خیز ہے؟ اتنی لمبی مسافت اتنے مختصر وقت میں عقل اس لئے طے نہیں کرسکتی کہ اس کے پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں، لیکن سرکار دوعالمؐ کا یہ سفر تو خالق کائنات نے کرایا ہے جس کی بارگاہ میں ناممکن لفظ کا گذر ہی نہیں۔

تیسرے بند میں استفہامیہ جملوں نے بند میں جان ڈال دی ہے۔

جس نے مٹائی سطوت اصنام کون تھا؟ کی دور جس نے ظلمت اوہام، کون تھا؟
جس سے ملی ہے دولت اسلام، کون تھا؟ کی جس نے راہ ورسم وفا عام، کون تھا؟
عورت کو جس نے چادر شرم وحجاب دی
مزدور کے پسینے کو ہیرے کی آب دی

عرب کے سماج میں عورت اور غلام ہی سب سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم تھے اسلام نے آکر ان کو اعزاز واحترام کے منصب پر سرفراز کیا اور زمین سے اٹھا کر آسمان پر بیٹھا دیا۔

ممدوح کے اوصاف وکمالات کا ذکر ہی ممدوح کی عظمت وشان کو دلنشین بناتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کے ساتھ معجزات جو دلائل نبوت ہیں ان کا ذکر ناگزیر ہوتا ہے، احادیث میں ان کا ذکر بہت تفصیل سے آیا ہے، اشعر صاحب نے کئی کئی صفحات کے مضمون کو چھ مصرعوں میں سمیٹ کر اپنی قادر الکلامی کا اچھا ثبوت دیا ہے، بند کو درج ذیل تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر پڑھئے تو اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ ہوگا۔

۱- حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں ان پتھروں کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے قبل مجھ کو سلام کرتے تھے۔

۲- شق القمر کا معجزہ تو مشہور ہے۔

۳- ایک شخص نے مٹھی میں کنکریوں کو چھپا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کو غیب سے خبریں آتی ہیں بتایئے میری مٹھی میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ

میں خود بتادوں یا وہ چیز جو تمہاری مٹھی میں ہے وہ خود ہی بول دے اس نے کہا کہ اس سے بہتر کیا ہے؟ پھر اس کی مٹھی کی کنکریوں سے کلمہ شہادت کی آواز آئی۔

۴- ایک غزوہ میں آپؐ صحابہ کرام کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے مشکیزہ میں تھوڑا سا پانی تھا آپؐ نے وضو فرما کر تھوڑا سا پانی مشکیزہ میں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا، جب منزل پر صحابہ کرامؓ پہنچے تو سب نے پیاس کی شدت کی شکایت کی آپؐ نے وہی مشکیزہ منگایا اور اس میں آپؐ نے اپنی انگلیاں ڈال دیں پھر تو اس سے جوش مارتا ہوا پانی ابلنے لگا تمام صحابہؓ نے پیاس بجھائی۔

مسجد نبوی میں ایک ستون تھا جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ دیا کرتے تھے جب ایک صحابیہ نے منبر بنوا کر مسجد نبوی میں رکھ دیا تو آپ خطبہ کے لئے اس منبر پر جب کھڑے ہوئے تو اس ستون سے اس طرح کی آواز آئی جیسے کوئی بچہ سسک سسک کر رو رہا ہے، آپؐ نے منبر سے اتر کر اس کو سینے سے لگایا تو یہ آواز بند ہوئی، اسی ستون کو ''استن حنانہ'' کہا جاتا ہے، ان سارے معجزات کو اشعر صاحب نے صرف ایک بند میں پیش کر دیا ہے ان کا بند ہے۔

ہر شے جہاں کی اسکی صداقت پہ ہے گواہ پتھر بھی موم ہو وہ جدھر ڈال دیں نگاہ
حرکت کریں اشارۂ ابرو پہ مہر وماہ بے جان کنکری بھی کرے وِرد لا الہ
انگشت پاک چشمۂ شیریں رواں کرے
منبر کا چوب خشک بچھڑ کر فغاں کرے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں، مقصد تھا کہ کوئی غلام مل جائے کیونکہ وہ خود ہی چکی پیستی تھیں پانی کی مشک لاتی تھیں، جس کی وجہ سے پورا جسم چور ہو جاتا تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی تو حضرت علیؓ نے آکر حضرت فاطمہؓ کے آنے کا مقصد بیان کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنگ بدر میں جو صحابہ شہید ہو گئے ہیں ان کی بیواؤں اور ان کے یتیم بچوں کا حق پہلے ہے، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا حال خود ام المومنین حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی مہینوں چولہا جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی، کیونکہ پکانے کے لئے کچھ رہتا ہی نہیں تھا صرف کھجور اور پانی پر گذر ہوتا تھا، ان ساری جزئیات کو اشعر صاحب نے صرف ایک بند میں پیش کردیا ہے، اور انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ دل شعروں کی معنویت میں کھوجاتا ہے، دل بھر آتا ہے، آنکھیں چھلکنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں شہنشاہ کائنات اور بے سروسامانی کا یہ عالم؟

ہو جسکے گھر میں بے سروسامانی کا یہ حال بے تیل بجھ گیا ہو دیا، وقت انتقال
خود جسکی بیٹی چکی چلانے سے ہونڈھال وہ بدر کے یتیموں کا پہلے کرے خیال
جو سیم وزر مدینے کے ہر گھر میں بانٹ دے
اس دن بھی اپنی رات وہ فاقے سے کاٹ دے

ان کربناک حالات کی کتنے موثر انداز میں عکاسی کی گئی ہے، کہ پڑھ کر ہر مصرعہ پر آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں، جب آپؐ اشاعت اسلام کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے سرداروں نے مذاق اڑایا، استہزا کیا، طنز کے تیر چلائے، انہیں سرداروں کی شہ پاکر نوجوانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے آپ کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے آپ وہاں سے بہت غم زدہ اور دل گرفتہ ہوکر لوٹے مگر زبان مبارک پر بددعا کے بجائے **اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون** ہی تھا بڑی سے بڑی مصیبت کے موقعہ پر صبر وضبط سے کام لیا، اشعر صاحب نے ان کربناک واقعات وحالات کو ایک بند میں بیان کردیا ہے اور بہت موثر بند کہا ہے اور آپ کے ''رحمت عالم'' ہونے کو واقعات وحقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے جب کہ ان میں اکثر مواقع ایسے تھے کہ آپ موت وزیست کے دوراہے پر کھڑے تھے، بند دیکھئے۔

مصروف سنگباری تھے طائف میں .جب شریر جب غار ثور میں تھا چھپا وہ مہ منیر
بدر واحد میں جب تھا بپا شور دار وگیر مینہ کی طرح حنین میں .جب گر رہے تھے تیر
''رحمت لقب'' کا فرض ادا کر رہا تھا وہ
زخمی لبوں سے تب بھی دعا کر رہا تھا وہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک دلکش منظر ہم کو فتح مکہ کے وقت نظر آتا ہے جو فتح وجنگ کی تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ ہے، اشعر صاحب اس وقت کی عام معافی کا ذکر کرتے ہیں۔

منظر تھا فتح مکہ کا کتنا عجیب تر — مجرم تھے بیس سال کے، آگے جھکا کے سر
ہمت نہ تھی کہ شرم سے اوپر اٹھے نظر — جس دم نگاہ رحمت عالم اٹھی ادھر

اہل جفا کو عفو وکرم کی امید دی
مکہ کو اَنْتُمُ الطُّلَقَاء کی نوید دی

اس روح نواز، مترنم اور دلکش طویل نظم کا خاتمہ دعا پر کیا ہے، اس سے پہلے انہوں نے بتایا ہے کہ حضور کے لائے ہوئے دین اور ان کے برپا کردہ نظام زندگی اور ان کے پیش کردہ دستور حیات کی افادیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے، اشعر صاحب کو یقین ہے کہ علمی، تمدنی اور سائنسی تمام ترقیوں کے باوجود آج بھی انسان ذہنی سکون سے محروم ہے اور اس کو دل کا چین نصیب نہیں اس لئے ایک دن ایسا آکر رہے گا کہ تمام ترقی یافتہ قومیں نخل اسلام کے سائے میں آئیں گی تبھی ان کو روحانی نشاط اور ذہنی سکون نصیب ہوگا، حالات مجبور کردیں گے تو وہ الحادی زندگی کو خیر باد کہہ کے اسلام کی روحانی زندگی کو اپنالیں گے۔ اشعر صاحب کہتے ہیں۔

قائم خدا کے دین کی عظمت ہے آج بھی — پرنور شاہراہ طریقت ہے آج بھی
زندہ میرے حضور کی سنت ہے آج بھی — دنیا کو ان کے دیں کی ضرورت ہے آج بھی

جب ظلمتوں میں نوع بشر ڈوب جائے گی
دنیا بھٹک کے اسی در پہ آئے گی

اشعر صاحب چونکہ صحافی ہیں اس لئے اپنے گردوپیش کے حالات سے خوب واقف ہیں، مسلمانوں پر جو گذر چکی ہے اور جو گذر رہی ہے اس کو دیکھ کر غم زدہ اور فکرمند ہیں اس لئے آخری دو بند میں دل کا درد ظاہر کرتے ہوئے خدا سے دعا کی ہے،

وہ کہتے ہیں۔

دشمن زمین ہے تو شرر بار آسماں ناقابل بیاں ہے شقاوت کی داستاں
ہر روز گر رہی ہیں جفاؤں کی بجلیاں بیکس ہیں بے پناہ ہیں، اب جائیں ہم کہاں
بدبختیوں نے اب ہمیں یہ دن دکھائے ہیں
ہر سمت ظلم و جبر ہے، ذلت کے سائے ہیں
یارب! نبی کے صدقے میں عزو وقار دے اس بدنصیب قوم کی قسمت سنوار دے
ایمان کے چمن کو نوید بہار دے دل میں سرور عشق محمد اتار دے

سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو اور صلوۃ وسلام کا نذرانہ عقیدت نہ پیش ہو، یہ کیسے ممکن ہے، اشعر صاحب نے صلوۃ وسلام کے ساتھ ''ہدیۂ ناچیز'' جو بارگاہ رسالت میں پیش کیا ہے اس کی قدر قیمت کا اندازہ کیجئے، انہوں نے عشق ومحبت کی ساری کائنات بارگاہ حسن میں پیش کی ہے اور کس تواضع سے پیش کی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے، بند ملاحظہ ہو۔

محبوب کردگار، صلوۃ وسلام ہو صد بار صد ہزار صلوٰۃ وسلام ہو
باچشم اشکبار، صلوۃ وسلام ہو اشعر ترے نثار، صلوٰۃ وسلام ہو
کچھ آنسوؤں کے موتی ہیں، کچھ زخم دل کے پھول
مولیٰ! ہمارا ہدیۂ ناچیز ہو قبول

اشعر صاحب کی ایک نعتیہ نظم ''طلوعِ مہر رسالت'' ستر اشعار پر مشتمل ہے مرصع سانچے میں ڈھلی ہوئی، برجستہ رواں دواں ہے کہ پڑھئے تو دل وفور جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، ہر بند پانچ شعروں پر مشتمل ہے ہر بند کا خاتمہ ایسے شعر پر کرتے ہیں کہ روح وجد کرنے لگتی ہے اور دل عشق ومحبت اور عقیدت وارادت کی روحانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے ایک بند میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکین کی جانب سے توڑے جانے والے مصائب کا ذکر کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا بلند معیار بھی، ہر شعر میں تقابل کا انداز اختیار کر کے شعر کی معنوی وسعتوں کو کہاں سے

کہاں تک پہنچا دیا گیا ہے، بند ملاحظہ کیجئے ؎

وہ سنگباریٔ طائف سے دلفگار بھی ہے تو دشمنوں کیلئے اسکے دل میں پیار بھی ہے
کھلے ہیں جسم پہ صدہا گلاب زخموں کے مگر وہ صبر و عزیمت کا کوہسار بھی ہے
کھلا کے اوروں کو خالی شکم جو سو جائے اسی کا سارے خزانوں پہ اختیار بھی ہے
اسی کے خون کے پیاسے بھی اہل مکہ ہیں امانتوں کے لئے اس پہ اعتبار بھی ہے
یہ سب کو مہر و وفا کے اصول دیتا ہے
وہ کانٹے پھینکنے والوں کو پھول دیتا ہے

ایک بند میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم کارناموں کا ذکر کیا ہے اور اس انقلاب کو پیش کیا جو آپ نے ۲۳ سالہ عہد رسالت میں پیدا کیا، انسانیت جو ذلت کی پست ترین سطح پر تھی اس کو اوج ثریا تک پہنچانے کا ذکر کرتے ہیں، یہ سب کچھ بہت شگفتہ اسلوب میں کرتے ہیں، الفاظ نرم و نازک، انداز بیان بہت سبک اور ہلکا، ان کا بند پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فرش گل پر چلتے ہیں ہر طرف عقیدت و محبت کے گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، استعارات و کنایات اور تلمیحات کا حسن استعمال، ذہن و فکر میں ایک نورانی فضا بناتا ہوا چلا جاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اسلوب کے باوجود علم ہے فکر ہے، حقائق ہیں، جیسے سامنے سیرۃ النبیؐ کے اوراق کھلے ہوتے ہیں، اشعؔر صاحب کا بند ہے۔

جہان کہنہ میں برپا وہ انقلاب کیا کہ کفر و شرک کو وہم و خیال و خواب کیا
اٹھا کے فرش زمیں کے حقیر ذروں کو حریف مہر کیا، رشک آفتاب کیا
نہ ملک و قوم نہ رنگ و نسب ہے باعث فخر فضیلتوں کا مرتب نیا نصاب کیا
عجیب شان تھی اس کی کہ خود تو امّی تھا مگر خدا نے اسے صاحب کتاب کیا
جہاں میں علم کے دریا بہادیئے اُس نے
جہالتوں کے نشاں تک مٹادیئے اس نے

اشعؔر صاحب صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ بارگاہ رسالت میں زبانی دعوائے

محبت کی کوئی قیمت نہیں، دعویٰ کے ساتھ عملی ثبوت بھی ضروری ہے، یہاں دودھ پینے والے مجنوؤں کی نہیں خون دینے والے مجنوؤں کی ضرورت ہے، ان کی عقیدت وارادت اتنی طاقتور ہے کہ وہ اپنی بات قسم کھا کر کہتے ہیں یہاں بھی ان کے طرز بیان کی نفاست، شاعرانہ اسلوب کی دلکشی اپنے شباب پر ہے۔

نبی سے ہم کو محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں مگر ثبوت اطاعت نہیں تو کچھ بھی نہیں
فقط زبان کا دعوائے عشق ناکافی عمل سے اسکی شہادت نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہماری زیست کے آئین زندگی کا نظام اگر خدا کی شریعت نہیں، تو کچھ بھی نہیں
عمل کا نام ہے اسلام جس کو کہتے ہیں جو سامنے یہ حقیقت نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر ہم اب بھی نبی کے غلام ہوجائیں
قسم خدا کی جہاں کے امام ہوجائیں

اشعؔر صاحب کی ایک طویل نظم ''اے ہادی اعظم'' کے عنوان سے بڑی دلکش اور روح نواز ہے یہ نظم ان کی قادر الکلامی کا بھی ثبوت فراہم کرتی ہے عصری آگاہی کی روشنی میں انہوں نے جو حقائق پیش کئے ہیں اور جس انداز میں پیش کئے وہ دلوں کو چھو لینے والا ہے، ہر قاری یہ محسوس کرے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے کیونکہ اشعؔر کے بیان میں بولتی ہوئی صداقت ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں ہوتی انہوں نے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج بھی سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں کے نفاذ کی ضرورت ہے، آج کا ترقی یافتہ انسان زمین سے اٹھ کر ثریا تک پہنچ گیا ہے، خلاؤں پر اس کی حکمرانی ہوچکی ہے سائنسی انکشافات نے قوانین فطرت کے سارے حجابات اٹھادیئے ہیں، انسان خلاؤں میں جنوں اور شیاطین کی طرح چہل قدمی کرنے لگا ہے، آسمان کی بلندیوں میں غرور وتمکنت کا تخت حکومت بچھا کر بیٹھ گیا ہے ہزاروں ہزار میلوں کی دوری تک وہ بیک وقت ساری دنیا کے مناظر روئے زمین پر بسنے والوں کو دکھا سکتا ہے، آپ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں، جنگل اور بیابان میں ہوں، پہاڑوں کی کھوہ یا گھنی جھاڑیوں میں

ہوں، زمین کے تہ خانوں میں ہوں ہر جگہ وہ اپنی بات پہنچا سکتا ہے خلائی اسٹیشنوں اور مصنوعی سیاروں نے دنیا کی پوری تاریخ بدل کر رکھ دی ہے لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اشعرؔ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی ترقی ہے، انسانیت کی نہیں، تہذیب وشرافت کی نہیں جس کی ساری دنیا کو ضرورت ہے۔

عصر حاضر کے علوم وفنون سائنس جغرافیہ میں انسان نے وہ بلند مقام حاصل کرلیا کہ آج سے پہلے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اس علمی وسائنسی ترقی نے انسانیت کو فروغ نہیں دیا، انسان تمام تہذیب وترقی کے دعوے کے باوجود وحشی، سفاک، خونخوار انسانیت کا دشمن ہوکر رہ گیا ہے، علم اور وحشت میں تضاد ہے لیکن انسان اس تضاد کا شکار ہے کہ تمام علمی کمالات کے باوجود وحشی اور درندہ بھی ہے۔

اشعرؔ صاحب کے دعوے کے ثبوت کے لئے پچھلے پچاس سالوں کی تاریخ شاہد ہے، دوسری جنگ عظیم میں کروڑوں انسانوں کی تباہی اسی حضرت انسان کے ہاتھوں ہوئی، ہیروشیما کی بات چھوڑیئے کہ لاکھوں لاکھ بے قصور انسان مکھی مچھر کی طرح مسل کر رکھ دیئے گئے اور آج تک ان کی نسل تخلیقی نقائص کا شکار ہے تازہ ثبوت اسامہ بن لادن ایک شخص سے انتقام لینے کے لئے امریکہ جیسے سپر پاور ملک نے کتنے راکٹ داغے، کتنے انسان مرے، کتنی تباہی آئی؟ یہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، نیوکلیائی ہتھیاروں کی جنگ میں جو تباہیاں اب تک دنیا دیکھ چکی ہے، یاجوج ماجوج کی تباہی کی جو احادیث میں منظر کشی کی گئی ہے کیا اس سے کم ہے؟

اشعرؔ صاحب اسی پس منظر میں اپنی یہ نظم کہتے ہیں، یہ ان کی نظم ان کے شاعرانہ خوبصورت انداز بیان کے ساتھ کچھ ٹھوس حقیقتیں بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اور وہ بھی بہت دلکش اسلوب میں، اس نظم کے دو تین بند آپ بھی ملاحظہ فرمایں، وہ اپنی نظم کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے ہادیٔ اعظم! دین ترا سرچشمۂ راحت آج بھی ہے
اے ختم رسل! تعلیم تری سامان سعادت آج بھی ہے

اے سرور دیں! پیغام ترا گلبانگ صداقت آج بھی ہے
اے رہبر عالم! اسوہ ترا مینار ہدایت آج بھی ہے
دنیا میں مدینہ سے جاری، فیضان رسالت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے
فرمانِ الٰہی بندوں کو پہنچا بھی دیا، سمجھا بھی دیا
ان پر جو حقائق پنہاں تھے، ہر طرح انہیں بتلا بھی دیا
دنیا میں بھی جینا سکھلایا، مومن کو غم عقبیٰ بھی دیا
تعلیم جو دی انسانوں کو، خود کر کے اسے دکھلا بھی دیا
روشن ترا اسوہ آج بھی ہے، زندہ تیری سیرت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو پھر تیری ضرورت آج بھی دیا

عہد حاضر کو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کیوں ہے؟ اشعر صاحب حالات کی عکاسی کرتے ہیں ان کی نگاہوں کے سامنے عالم اسلام کی پوری صورت حال ہے، عراق، مصر، ترکی اور الجزائر میں جو کچھ ہو رہا ہے اور آخر آخر میں سعودیہ عربیہ جس طرح سامراجیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے، یہ کربناک صورت حال ان کے سامنے ہے، ان تمام ملکوں میں بزور قوت الحاد کو پھیلایا جا رہا ہے، کیوں کہ ان کے سروں پر سامراج کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے، اشعرؔ کہتے ہیں۔

توپوں کی زباں سے امن کے اب پیغام سنائے جاتے ہیں
چوراہوں پر ہتھیاروں کے بازار سجائے جاتے ہیں
طاقت کے توازن کی خاطر فتنے وہ اٹھائے جاتے ہیں
دھرتی پر زخمی لاشوں کے انبار لگائے جاتے ہیں
سفاک ہیں سائنس وحکمت، خونخوار سیاست آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

مغرب سے لے کر مشرق تک شیطان کا سکہ چلتا ہے
تہذیب کے عشرت خانوں میں الحاد کا ساغر ڈھلتا ہے
اشک غربت، مظلوم کا خون، ایوان ہوس میں جلتا ہے
جو چاند کی مٹی لاتا ہے، دھرتی کا حسن کچلتا ہے
باصد ہمہ زعم علم وخرد، ہنگامۂ وحشت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

مغرب سے لے کر مشرق تک شیطان کا سکہ چلتا ہے
تہذیب کے عشرت خانوں میں الحاد کا ساغر ڈھلتا ہے
اشک غربت، مظلوم کا خون، ایوان ہوس میں جلتا ہے
جو چاند کی مٹی لاتا ہے، دھرتی کا حسن کچلتا ہے
باصد ہمہ زعم علم وخرد، ہنگامۂ وحشت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو، پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

اس نظم کے آخر میں اشعرؔ اسلام کی ابدیت پر اپنے یقین کا اظہار کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی نبی اور رسول آئے ان کی تعلیمات کا دور ختم ہو گیا اور ان کے ماننے والوں نے اپنی تہذیب میں تحریف وترمیم کر کے اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا، صرف حضور کا لایا ہوا دین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں آج تک کوئی آمیزش یا تحریف نہیں ہوئی کیوں کہ قرآن جو اس کے دستور کی کتاب ہے اس کی حفاظت خود خدا نے اپنے ذمہ لی ہے اور دنیا میں ایسے اسباب وذرائع پیدا کر دیئے کہ کسی بھی طرح قرآن میں ایک حرف کی کمی بیشی کا امکان بھی ختم ہو گیا اس لئے جو دین کی صداقت عہد رسالت میں تھی وہی کھری صداقت آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے، اشعر صاحب کا بند ہے:

ہر دیش میں، ہر جگ میں یوں تو کچھ سچے رہبر آتے رہے
ہر دور کے انسانوں کے لئے قانون ہدایت لاتے رہے

کچھ لوگ اسے اپناتے رہے، کچھ لوگ اسے ٹھکراتے رہے
کچھ لوگ بدل کر روپ اپنا، سونے میں کھوٹ ملاتے رہے
آدرش ترے، تعلیم تری، بے میل صداقت آج بھی ہے
لاریب کہ عہد حاضر کو پھر تیری ضرورت آج بھی ہے

اشعرؔ صاحب کی ایک نظم کا عنوان ہے ''یہ جشن ولادت کی شب ہے'' جو ۲۴ بند پر مشتمل ہے، ابتدائی بندوں میں انہوں نے جشن کی بڑی خوبصورت منظرکشی کی ہے، الفاظ بڑے جچے تلے، انداز بیان دلکش، استعارات وکنایات کے پھولوں سے سجایا ہے، کیونکہ کسی عظیم ہستی کا استقبال جو اہتمام چاہتا ہے اشعر صاحب اس سے واقف ہیں اس لئے اس ہستی کے شایان شان سجاوٹ کا نظم کرتے ہیں محفل استقبالیہ کو سجاتے اور سنوارتے ہیں، اس سلسلہ کا صرف ایک بند بطور مثال پیش کرتا ہوں، دیکھئے کہ ان کے تخیل نے کیسے کیسے گل بوٹے کھلائے ہیں؟ بند ہے۔

کرنوں سے فضاؤں کو بھر دیں، یہ چاند ستاروں سے کہہ دو
برسائیں زمیں پر لالہ وگل، جنت کی بہاروں سے کہہ دو
تعظیم نبیؐ میں جھک جائیں، کعبہ کے مناروں سے کہہ دو
انساں کا مسیحا آتا ہے، دکھ درد کے ماروں سے کہہ دو
یہ درد سے راحت کی شب ہے، یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

پورے اہتمام سے بزم استقبال سجا کر شہنشاہ کونین کا استقبال کیا جاتا ہے پھر آپ کے اوصاف وکمالات اور عظیم الشان کارناموں کا ذکر کیا جاتا ہے، پھر عہد رسالت کی برکات وثمرات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ بے خود ہو جاتے ہیں اس بیخودی میں ایک طویل مسافت کر لیتے ہیں تو ان کو ہوش آتا ہے اور اپنے اردگرد مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے دلخراش مناظر کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں، پھر اپنے عزم وہمت کا اظہار کرتے ہوئے پورے یقین واعتماد کے ساتھ

کہتے ہیں کہ ہماری جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی، اسی ماحول میں ان کو مسجد بابری کے انہدام کا خونبار واقعہ یاد آجاتا ہے تو تڑپ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں

ہم عشق نبی کے متوالے، کب جان کی پروا رکھتے ہیں
دل میں ہے اسی چاہت کا مزا، سر میں وہی سودا رکھتے ہیں
سینوں میں تڑپ، کاندھوں پہ کفن، ہاتھوں پہ کلیجہ رکھتے ہیں
آندھی میں جلاتے ہیں شمعیں، طوفاں میں سفینہ رکھتے ہیں
جذبوں کی حرارت کی شب ہے یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

ہے دیر مگر اندھیر نہیں، یہ ظلم کی طاقت ٹوٹے گی
قانون الٰہی گھات میں ہے، باطل کی رعونت ٹوٹے گی
جب حد سے ستم بڑھ جائے گا، تب برق مشیت ٹوٹے گی
یہ ملک بھی آخر ٹوٹے گا، جب ''جائے عبادت'' ٹوٹے گی
مولیٰ! یہ اجابت کی شب ہے، یہ جشن ولادت کی شب ہے
اس رات کا استقبال کرو

''طیبہ کی زیارت'' کے عنوان سے ان کی ایک نعت ہے جس میں کئی اشعار کمال عشق و محبت کے ترجمان ہیں اور بڑے روح نواز اور ایمان افروز ہیں، یہاں مجاز کا گذر نہیں، حقیقت ہی حقیقت ہے، آپ بھی سماعت فرمائیں۔

جب روضۂ اقدس کے آگے آنکھوں میں چھلک آئیں آنسو
تب لعل و گہر سے بھی بڑھ کر ہر قطرے کی قیمت ہوتی ہے
جب سینہ میں دل کی ہر دھڑکن دیتی ہے صدائے صل علیٰ
اس وقت محبت کو حاصل معراج محبت ہوتی ہے
سو بار بھی گر پیاسی آنکھیں لیں گنبد خضریٰ کے بوسے
ہر بار نگاہوں کو حاصل اک تازہ لذت ہوتی ہے

اس نعت کا ایک شعر تو دل میں تراز و ہو جانے والا ہے، صرف ایک لفظ ''لگتا ہے'' سے وہ اپنے عقیدے کے تقدس کو بھی محفوظ کر گئے، پہلے مصرعہ میں تصور کی بنائی تصویر کا روحانی نظروں سے نظارہ کرتے ہیں پھر حضور کے جسم اطہر کی خوشبو محسوس ہونے کا اظہار کر کے شعر میں جان ڈال دی ہے، ان کا شعر ہے۔

لگتا ہے غلاموں کو جیسے وہ دیکھ رہے ہیں جالی سے
ماحول میں ہر سو پھیلی ہوئی خوشبوئے محبت ہوتی ہے

''اے شہِ کون و مکان'' کی نعمت میں خاص طور پر یہ اشعار اپنے انداز بیان کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔

حرف ناخواندہ ہے تو پھر بھی تیری چوکھٹ سے — علم و حکمت کے خزانوں کو ابلتا دیکھا
پتھروں سے تری طائف نے تواضع کی تھی — تجھ کو بدلے میں لٹاتے گل و لالہ دیکھا
تو نے دنیا کو زر و سیم لٹایا جس روز — گھر میں اس روز بھی چولہا تیرا ٹھنڈا دیکھا

مقطع کا شعر اپنے ابہام کی وجہ سے بہت معنی خیز ہو گیا ہے۔

اے شہ کون و مکاں میں تیری رحمت کے نثار — گوشۂ چشم سے کچھ حال ہمارا دیکھا؟

''ذکر جمیل'' کے یہ دو شعر خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔

عاشق ہندی ہوں گنگا میں وضو کرتا ہوں میں
پھر جمال مصطفےٰ کی گفتگو کرتا ہوں میں
وجد کرتی ہے صبا، ہر سو چٹک جاتے ہیں پھول
جب چمن میں شرح زلف مشکبو کرتا ہوں میں

''فیضانِ رسالت'' کے یہ اشعار خوبصورت، دلکش اور معنوی اعتبار سے قابل قدر نظر آئے۔

کہکشاں انکے نقوش کف پا کی تصویر — ماہ کامل کو اک آئینہ حیرت سمجھے
اہل دل جاں ہی نہیں کون و مکان کو بھی فقط — آپ کی اک نگہِ لطف کی قیمت سمجھے
یہ بھی ایک معجزہ انکا ہے کہ ہر دشمن جاں — ان کو صادق کہے، سر تاج امانت سمجھے

اُلوہیت اور نبوت میں جن لوگوں نے غلوئے عقیدت کی وجہ سے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تم نے افسوس، بشر بھی اسے رہنے نہ دیا　　　ہم جسے اوج کمال بشریت سمجھے

''متاعِ عقیدت'' میں ایک مقام پر دل میں کھٹک پیدا ہوئی اس کا بھی اظہار ضروری ہے اشعر صاحب کا یہ لاجواب شعر۔

تم نے افسوس بشر بھی اسے رہنے نہ دیا
ہم جسے اوجِ کمال بشریت سمجھے

پڑھ کر جب ان کا یہ شعر

وہ شبِ اسرار کا دولہا، عرش کا مسند نشیں
ساقیٔ تسنیم وکوثر، قاسم خلد بریں

پڑھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا جس بات کی ان کو دوسروں سے شکایت تھی وہی بات ان کے یہاں کیسے آ گئی؟ انہیں کا لب ولہجہ، انہیں کے الفاظ، انہیں کا سوقیانہ انداز بیان اور انہیں کے خیالات جس سے وہ خود بیزار ہیں کیوں اپنا لیا، ہوسکتا ہے وہ خود بھی اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس کریں، ذیل کے دو شعروں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

جب ترے قدوم ناز فرش خاک پر پڑے　　　خشک ریگزار میں پھول سے بکھر گئے
انگشت پاک چشمۂ شیریں رواں کرے　　　منبر کا چوب خشک بچھڑ کر فغاں کرے

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اور دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ دونوں محل نظر ہیں اہل زبان کی طرف سے ان پر انگلیاں اٹھائی جائیں گی، دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ سے تاریخی واقعیت بھی مجروح ہوتی ہے۔

''متاع عقیدت'' پڑھ کر دل کو ڈھارس ہوئی کہ اردو شاعری عالم نزع میں نہیں ہے ابھی اس میں زندگی کی حرارت موجود ہے، پچھلے پچاس برسوں سے مصائب کی بارش نے عروس شاعری کے سارے نقوش اور رنگ دھو دیئے ہیں اب نہ اس میں کشش اور

جاذبیت رہ گئی نہ آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کو تسکین دینے کی صلاحیت باقی ہے، اردو مشاعروں میں جو ہجوم نظر آتا ہے وہ رنگین پر و بال والی قمریوں اور فاختاؤں کی نغمہ سنجیوں کے طفیل ہے ان کے چہچہوں سے گلستان مشاعرہ کچھ دیر کے لئے آباد ہو جاتا ہے اگر یہ قمریاں اور فاختائیں اڑ جائیں تو یہ چمن صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔

اُردو شاعری کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ اردو دنیا پیہم حوادث و مصائب ذہنی و فکری کشمکش میں مبتلا رہی، اور موت و زیست کی لڑائی لڑتی رہی، ایسی صورت حال میں جذبات مر جاتے ہیں، امنگوں پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے، طائر فکر کے پر و بال جھڑ جاتے ہیں ایسے ماحول میں کسی اچھی شاعری کی توقع فضول ہے دوسری بات یہ کہ اردو شاعری کے پاس اس ملک میں کوئی موضوع نہیں رہ گیا، غزل کی شاعری کے لئے جس گہری فکر اور بلند نظری کی ضرورت ہے وہ یہاں عنقا ہو چکی ہے صرف روزی روٹی کی وجہ سے کچھ لوگ اردو سے جڑے ہوئے ہیں، اسی لئے ادھر پچاس سالوں سے کسی شاعر کا کوئی ایسا دیوان یا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا جس پر اہل نظر توجہ دیں، ہمارے ملک میں سر دست نعت ہی ایک ایسا موضوع ہے جس پر محنت کی جائے تو شاید اردو شاعری کے تن مردہ میں زندگی کی کچھ رمق آجائے، ''متاعِ عقیدت'' پڑھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا ہے۔